

وقت ختم کر رہا گیا، ہر شے منجمد ہو گئی، کتنا طویل سفر طے ہوا؟ مجھے کن کن راہوں سے گزرتا پڑا؟ روکا گیا؟ کتنے موڑ کاٹنے پڑے؟ میرے بارے میں جن لوگوں نے کانٹوں کی کڑی دیکھی، جال بچھائے تھے وہ خاموش تو نہیں رہے ہوں گے۔ روی شکر نے گرد کے ساتھ اُبھت مناسب نہیں سمجھا، خاموشی سے لوٹ گیا۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ دوسرے بھی گرد کو دیکھ کر ہلکا لیتے، کچھ سر پھرے افسروں نے گرد کی بھی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی ہوگی، پنڈت پجاری کا ایک غول بھی میری تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا تھا، وہ دُرگا دیوی کے پرستار تھے۔ دیوی کے چہرے پر انہوں نے گرد کو گھاس نہیں ڈالی ہوگی۔ گرد کہاں بھی رکھتا تھا، وہ ہار ماننے والوں کی سی نہیں تھا۔ میری خاطر اُس نے روی شکر کو بھی روکا دیا تھا، چھوٹے موٹے پنڈت پجاری کے راستے کی دھول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ پریم لال کا دوست تھا اسی لئے وقت پر میری مدد کو آ گیا تھا۔ وہ نہ آیا تو روی شکر اور اُس کے گرگے میری تکہ بوٹی کے بھی دریغ نہ کرتے۔ دُرگا کے سردار میں میرے داخلے کے بہت سارے گواہ تھے۔ شہریتوں میں جکڑ دیا جاتا، پنڈت لال کسور کو خبر ملتی تو وہ بھی ہر دو وار چھوڑ کر بمبئی آ جاتا۔ اُس کے دوسرے ساتھی بھی اکٹھا ہو جاتے۔ بمبئی کی شاہراہوں پر ٹریفک جام ہو جاتا، دُرگا کے چہینے والے پر دھرتا جما کر بیٹھ جاتے۔ اُن کا ایک ہی نعرہ ہوتا۔ ”جمیل احمد خان کو سرعام پھانسی پڑا دیا جائے۔“ عدالت کی پجاریوں کے سیلابی ریلے کے آگے قدم نہ جما سکتی وہی ہوتا جو دُرگا کو منگوا رہا تھا۔ گرد نے مجھے واشگاف لفظوں میں سمجھا دیا تھا کہ دُرگا کی آواز نے مجھے اکٹھا کرنے کے لئے بے دست و پا کر دیا تھا۔ کوئی قوت میری مدد نہیں کر سکتی تھی، کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ دُرگا دیوی کے سامنے سر اٹھاتا۔ پریم لال کی آتما نے لندن کے ہسپتال میں مجھے لے لیا تھا کہ کلدھپ کے نامکمل مشن کو پورا کرنے کے سلسلے میں وہ قدم بہ قدم میرا ساتھ

”آئی ایم سوری میڈم۔“

”گٹ لاسٹ۔“ جواب میں نفرت کا اظہار کیا گیا۔ پھر

قدموں کی آواز ابھر کر زور ہوتی چلی گئی۔ دروازہ بند ہونے کی مدد آواز بھی سنائی دی۔
اذہن آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا، میری حس بیدار ہو رہی تھی، گرو کا ایک جملہ میرے
وں میں گونجا۔ اُس نے روی شکر کے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ میں ہوٹل سے
کہ جہاں گیا تھا وہیں موجود ہوں اور وہاں موجود ہونا ہی میری بے گناہی کا ثبوت بھی
۔ اس وقت میں شاید اسی جگہ موجود تھا جس کا اشارہ گرو نے دیا تھا۔ وہی مجھے چھوڑ گیا ہو
لیکن وہ ایسی کون سی جگہ تھی جو میرے لئے اتنی محفوظ ہو سکتی تھی؟

میرے ذہن میں گزری ہوئی باتیں ترتیب وار ابھرنے لگیں۔ میں ذہنی جناسک میں
مصرف تھا جب بھینے بھینے خوشبو کا ایک معطر جھوکا میرے وجود کو ٹٹکنے لگا، مجھے احساس
ہو جیسے کوئی میرے بہت نزدیک موجود ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز نے میری چھٹی حس
بڑا احساس بنا دیا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن میں عالم تصور میں دیکھ رہا تھا کہ ایک
مرد حسین میرے آس پاس کہیں منڈلا رہی ہے۔ وہ میرے ہوش میں آنے کی منتظر تھی۔
میں نے چپکے چپکے نگاہیں میرے بند پتلیوں کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لے رہی ہوں گی۔
میں جہاں تھا وہاں میرے اور اُس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ ہوتا تو اُس کی آواز بھی ضرور
سنائی دیتی۔ میں وہ کون تھی؟ میں کہاں تھا؟ مرلی کون تھا؟

کئی سوالات میرے ذہن میں بکرانے لگے۔ میں نے آہستہ آہستہ کسمپاس شروع کیا۔
کسی کی نرم گرم انگلیاں میری پیشانی پر حرکت کرنے لگیں۔ وہ انداز نفرت کا نہیں تھا،
میرے چہرے پر گرم گرم سانسوں کی سحر آمیز ہوا کی دلالت کر رہی تھی کہ ایک
چہرہ میرے چہرے کے اوپر جھکا ہوا ہے۔ اس کی ہون کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے
گدگدا رہی تھی، اُس کی انگلیوں کا لمس مجھے بے چین کر رہا تھا۔

میں پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ کھلیں کھولیں، پھر پلکیں
بھپکا کر اُس چاند چہرے کو حیرت سے دیکھنے لگا جو میری دسترس سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں
ذرا ہاتھ بڑھا کر شوشی کرتا تو سارے فاصلے ہل بجھ رہے تھے۔ وہاں انداز میں چمکی
کھڑی تھی کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتی، میری آغوش میں ڈھیر ہو جاتی۔

دے گا۔ کچھ اُتر گا کے سراپ نے اُسے بھی سامنے آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میری
ساری تو یہی تھی جی تھیں، انکا پہلے ہی رُخ کمر سے اُتر گئی تھی، گرو بھی نہ آتا تو کہاں ہی
شتم ہو جاتی، سارا بچھڑ جاتا۔

میرا ذہن تاریکی میں ڈوبا ہوا، گرو کی مالا کے سوکھے پھول کی کڑواہٹ کا چٹکار تھا جس
نے مجھے ہر فکر سے بے نیاز کر دیا۔ میں کتنی دیر ہوش کی کیفیت سے دوچار رہا؟ اس طرح
میں میرے اوپر کیا کیا بیتی؟ اس کے بات میں شاید گرو ہی بہتر جانتا تھا۔ مجھے صرف اتنا
یاد ہے کہ ایک نسوانی آواز نے مجھے دوبارہ ہوش دلانے کا احساس دلایا تھا، میں اس آواز
سے ناواقف تھا، مجھے وہ آواز کہیں دُور سے آئی محسوس ہو رہی تھی۔

”مرلی سے بات ہوئی۔۔۔۔۔؟“ زندگی کا احساس دلانے والی اسی ٹھنکی آواز نے کسی کو
مخاطب کیا تھا۔

”لیس میڈم۔۔۔۔۔“ جواب میں ایک اور نسوانی آواز ابھری۔ ”بات ہوئی لیکن وہ بات
زیادہ مصروف ہیں۔ واپسی میں سے لگے گا۔“

”تم نے اُسے بتایا تھا کہ میں بات کرنا چاہتی ہوں؟“ اس بار سوال کرنے والی نے
لہجے میں غرور جسٹن بھی شامل تھا، اُس کی آواز میں ٹھنکت تھی، برتری کا احساس بھٹک رہا تھا۔
”میں نے کہا تھا میڈم، لیکن۔۔۔۔۔“

”کیا جواب دیا مرلی نے؟“ اُس نے پوری بات سے بغیر جھلا کر دریافت کیا۔

”وہ ایک ضروری کام میں مصروف ہیں۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ اُس کی آواز میں تکبر تھا۔ ”کیا وہ کام مجھ سے زیادہ ضروری ہے۔۔۔۔۔؟“

”میں دو بارہ کال کرتی ہوں میڈم۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ اُس نے پھٹکارے ہوئے حکیمانہ لہجہ اختیار کیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے

اُسے کال کرنے کی۔۔۔۔۔ اور سنو۔“ اُس نے سرسراہٹے لہجے میں کہا۔ ”اگر مرلی کا فون آئے،

میرا پوچھتے تو کہہ دینا کہ میں مصروف ہوں، بات نہیں کر سکتی۔“

”اور اگر سراپ کی مصروفیت۔۔۔۔۔“

”شٹ اپ۔۔۔۔۔“ وہ جھلا گئی۔ ”ساوحتا۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم اپنی اوقات بھولتی

جا رہی ہو۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم میرے مقابلے میں مرلی کو۔۔۔۔۔“

”مہاراج، تم نے اپنی داسی کو پہچانا نہیں؟“ اُس کی آواز کا ترنم دوبارہ سنائی دیا تو میں سنچل گیا۔

”تم؟“ میں نے کچھ کہنا چاہا، میری آواز کپکپا کر رہ گئی۔

”میں سروجنی ہوں مہاراج..... تمہارے چروں کی دھول۔“

میں سروجنی کا نام سن کر چونکا۔ مجھے وہ سرچراڈ پٹی سرنٹنڈنٹ پولیس یا دایا جو مجھے جہاز پر مرنے والے اشوک نامی مسافر کے سلسلے میں شکوک سمجھ کر تفتیش کی خاطر دوسرے افراد کے ساتھ اپنے دفتر لے گیا تھا۔ انکانے وہیں مجھے پہلی بار سروجنی اور ڈپٹی کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا تھا۔ میں نے انکا کراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھا کر ڈپٹی کو حیران کر دیا، وہ میرا بے دام غلام بن گیا تھا۔ اس وقت میں شاید چوپائی میں اُسی کے اپارٹمنٹ میں تھا جس کا ذکر انکانے کیا تھا۔

میں سروجنی کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا لیکن اُس کا القاد، اُس کی گھٹکھٹا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھے برسوں سے جانتی ہے۔ معا میرے ذہن میں انکاراتی کا تصور ابھرا۔ میں اُس کی سی مسکرایا۔ وہ ڈنوں کو پلٹ دینے کی حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی لیکن اُس کے لئے اُس کا مطلوبہ شخص کے سر پر ہونا لازم تھا۔ میں سمجھا گیا کہ سروجنی کے سر پر اس وقت میری انکاراتی مسلط تھی۔ سروجنی کی زبان سے وہی الفاظ ادا ہو رہے تھے جو انکا چاہ رہی تھی۔ گرو نے اُس کے لئے سروجنی کے اپارٹمنٹ پر پہنچا دیا تھا تو اس میں بھی اُس کی کوئی خاص معلومات ضرور کارفرما ہوئی۔ انکا مجھے بتا چکی تھی کہ ڈپٹی کی پہنچ سروجنی کی وجہ سے بہت اوپر تک تھی۔ وہ اپنے تعلقات کے لئے ملے ہوئے پرائے افسروں کو کبھی کسی قطار شمار میں نہیں گردانتا تھا۔ افس میں شیر بنارہتا تھا لیکن میری پہچان کو لکھی سمجھ کر اُس کے تلوے چائے کو بھی اپنے لئے اعزاز سمجھتا تھا۔

”سروجنی، ڈپٹی کی سب سے بڑی کمزوری ہے..... انکاراتی نے مجھے یہی بتایا تھا۔

میں سروجنی کو سر تا پا دیکھتا رہا۔ وہ حقیقت پرستش کے قابل تھی۔ جب بھی اس وقت اس کی خوابگاہ میرے لئے سب سے زیادہ محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔ وہ مجھے تمام اُونچ نیچے سوچنے سمجھنے کے بعد ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ کیا ہوگا، ممکن ہے انکا بھی یہی چاہی ہو، میرے لئے بھی حالات کے پیش نظر تاج ہوئی واپس جانا مناسب نہیں تھا۔ میرے ذہن

حالات کے پیش نظر میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ گرو نے بھی یہی تلقین کی تھی کہ جس دم تک میں اپنے کچھ سیٹ کر رکھوں، اُونچی اُڑان سے گریز کروں۔ میں نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا، میرے لئے وہ ماحول کسی ظلم خانے سے کم نہیں تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ رہا تھا۔ اس میں خواہاں کو دیکھنے لگا جس کی ایک ایک نے اپنا جواب آپ تھی۔ وہ کسی چھوٹے موٹے کمرے کی طرح دکھائی دیتی تھی، کسی راج محل کا ایک حصہ، ایک پُر سکون آرام گاہ محسوس ہو رہی تھی جسے غنی اشراف، خوبصورت بینکنگ، دیہی قالین اور حسین ساز و سامان سے آرائش دیا گیا تھا۔ میں حیرت میں رہ گیا تھا وہ بھی بے حد آرام دہ تھی۔ لندن اور ہندوستان کے بڑے بڑے مالیشان ہوٹلوں کے کمروں کی سجاوٹ اور طلسمی ماحول نے بھی مجھے کبھی اتنا متاثر نہیں کیا تھا، میرے لئے یہ ماحول میں اس کا بیان ناممکن ہے..... رنگوں کا استعراج، روشنیوں کے زاویے، ہر شے کا اُس کی مخصوص جگہ پر ہونا، سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔

”اتنے اچھے سے کیا دیکھ رہے ہو مہاراج.....؟“

میں اُس کی آواز سن کر چونکا، وہ اپنے بدن کو کوچہ دیتی، لہراتی مل کھاتی میرے سامنے کرڑک گئی، میری پکوں نے جھپکنا بند کر دیا، میں اُس کے حسن کی رعنائیوں میں گم ہونے لگا۔ وہ کسی مصور کا خواب نظر آ رہی تھی، کسی ماہر رنگ زاش کی ساری زندگی کا نچوڑ لگ رہی تھی جس میں قدرت نے رُوح پھونک دی تھی، اُسے اندر کے اکھاڑے کی اپسرائیں دیکھ لیتیں تو شرما کر سرنگوں ہو جاتیں، وہ کوئی چور تھی، کوئی پری تھی جو غلطی سے زمین پر اُتر آئی تھی۔ اُس کے شرے کے ایک ایک انگ سے نفس کی پھوٹ رہی تھی۔ اُس نے جسم کی رنگت کی مناسبت سے لباس کا انتخاب بھی کیا تھا، لباس میں ہونے کے باوجود بے لباس بھی نظر آ رہی تھی۔ زلفوں کی ٹھنیری لٹیں اُس کے شانوں پر تاگوں کی طرح مل کھادی تھیں۔ مجھے بے اختیار مالا رانی یاد آ گئی..... وہ ہوشربا منظر دوبارہ آنکھوں میں گھوم گیا جب میں نے اُسے میسور کی پہاڑیوں میں ایک جھرنے پر سر تا پیریاں غسل کرتے دیکھا تھا۔ میرا خیال تو وہ منظر میری زندگی کا حامل تھا، میں دوبارہ کبھی اتنے حسین حادثے سے دوچار نہیں ہو رہا۔ لیکن مجھے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ خواب گاہ میں موجود وہ کافر اداسینہ بھی مالا رانی سے کم نہیں تھی۔ میں مجھو کر رہ گیا۔

”صبح سے ابھی تک اُس کا کوئی فون نہیں آیا۔؟“

”نہیں مہاراج، لیکن آپ۔۔۔“

”تم نے برا کیا۔۔۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”جہیں مرلی

کورٹ ابھی میرے آنے کی خبر کر دینی چاہتی تھی۔“

”بات کیا ہے۔۔۔؟“ سروجنی نے میرے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے بے

چینی کا اٹھار کیا۔ ”آپ کچھ بالکل معلوم ہوتے ہیں۔“

”تو نہیں سمجھ سکے گی۔“ میں گھبر لہجے میں بولا۔ ”مرلی اور تیری بھلائی کی خاطر مجھے

یہاں سے جانا ہوگا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے مہاراج؟“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”اسنے عرصے بعد تو آپ

کے درشن ہوئے ہیں، ابھی تو ہم نے آپ کی کوئی سیوا بھی نہیں کی اور آپ جانے کی بات کر

رہے ہیں۔ ہم سے غلطی میں کوئی بھول ہوگئی ہو تو شکر دیجئے۔“

میں نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، سروجنی نے کہا تھا کہ میں رات سے اُس کا مہمان

تھا یہ بات میرے حق میں جاتی تھی۔ لیکن ریش لکنا یا مرلی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ میرے

دماغ میں اقل تھقل شروع ہوگئی۔ اگر مرلی بھی رومی شکر کی اس ٹیم میں شامل تھا جو مجھے

تلاش کرنی پڑ رہی تھی تو پھر اس کی بات میں کوئی وزن باقی نہ رہتا، اس کی گواہی کو اور بھی

بہت سارے نام دئے جاسکتے تھے۔ بات اگر کسی عام آدمی کے قتل کی ہوتی تو شاید معاملہ اتنا

تعمین نہ سمجھا جاتا، مرلی کا بیان تسلیم کر لیا جاتا۔ لیکن دو بڑے دھرماتماؤں کا خون معمولی

بات نہیں تھی، کالی داس اور اوم پکاشی ہتھیار چھوٹے موٹے پنڈت پجاریوں میں نہیں ہوتا

تھا، اس کے علاوہ ڈرگا کی آواز مندر میں مہو جو تمام دیو داسیوں، پجاریوں اور دیگر لوگوں

نے بھی ضرور سنی ہوگی، گرو نے بھی دبی زبان میں کہا تھا کہ میں نے ڈرگا کو لاکر غلطی

کی تھی۔ لیکن اُس نے رومی شکر سے میری موجودگی میں بات بھی بڑے غصے لہجے میں کہی

تھی کہ میں جہاں ہوں، وہاں میرا ہونا ہی میرے بے قصور ہونے کا ثبوت ہے۔

میں ابھی اسی شش و پنج میں گرفتار تھا کہ ایک اور حینہ کمرے میں داخل ہوئی، اُس کے

ہاتھ میں فون دیکھ کر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ سادھنا ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ غلط

نہیں تھا، سروجنی کے چہرے پر ابھرنے والے ناخوشگوار تاثرات اس بات کی تائید کر

میں بہت سارے سوالات ابھر رہے تھے۔ سروجنی میری مشکل حل کر سکتی تھی۔

”مرلی جہاں ہے۔۔۔؟“ میں نے اُسے ٹولنے کی خاطر اندر رے میں تیر چلا یا۔

”تم شاید جہاں گئے مہاراج۔۔۔“ سروجنی کرسی کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ ”ریش

یہ نام تم ہی نے پیار سے لگایا تھا۔“

مجھے وہ نیم پلیٹ یاد آئی جو مجھ پر کمرے کے باہر لگی تھی، اُس پر ریش لکنا تھا۔

سروجنی گھر پر اُسے مرلی کے نام سے یاد کرتی تھی، میں نے مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی، اگر

ریش ہی کا نام مرلی تھا تو پھر سروجنی کو اُس کے یاد دلانا چاہیے تھا، جبکہ معاملہ اس کے

برعکس تھا۔

”وہ گھر پر نہیں شاید۔۔۔؟“ میں نے سنجیدگی پر قرار دیا۔

”میں نے اُسے فون کیا تھا لیکن وہ کسی اہم کام میں مصروف ہے۔“ سروجنی نے

سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”اہم کام۔۔۔“ میں نے مسکرا کر معنی خیز انداز میں کہا۔ ”دوسروں کی طرح وہ بھی بھلا

پھر رہا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں مہاراج۔۔۔؟“ سروجنی نے یکھت پہلو بدل کر مجھے ٹونٹی نظروں سے

دیکھا۔

”وہ گھر سے کب گیا تھا۔۔۔؟“ میں نے سروجنی کو کریدنا شروع کیا۔

”ساڑھے آٹھ بجے۔“ اُس نے کہا۔ ”سادھنا بتا رہی تھی کہ دفتر سے کوئی ضروری فون

آیا تھا۔“

”سادھنا۔۔۔؟“

”میری سیکرٹری کا نام ہے۔“

”کیا مرلی کو میرے آنے کی خبر نہیں ہے؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”آپ رات کو جھکے ماندے آئے تھے مہاراج، ٹھیک سے بھوجن بھی نہیں کیا تھا۔“

سروجنی کہتی رہی۔ ”مرلی دیر سے واپس آیا تھا، میں نے آپ کی نیند خراب کرنے کی غلطی

نہیں کی، میں نے سوچا تھا کہ صبح جب وہ آپ کو اچانک دیکھے گا تو خوشی سے اچھیل پڑے گا

لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ صبح میں آپ کے کمرے میں تھی جب مرلی دفتر چلا گیا۔“

کہ مرلی کو بھی حالات کا علم ہو چکا ہے۔ انکارانی نے سروجنی کے بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں وہ حرف بہ حرف درست تھیں۔ اُس کی پہنچ ڈرنک نہ ہوتی تو شاید وہ کسی برسرِ اقتدار ڈی آئی جی کے لئے وہ الفاظ کبھی استعمال نہ کرتی جو میں اپنے کانوں سے سن چکا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اُسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اُس کا غصہ کانور ہو گیا، ہنسی مسکراتی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے گداز جسم کا لمس میری قوت برداشت کو آزمانے لگا۔ میرے ذہن میں کن سمجھو رہے کھلانے لگے۔ یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ وہ ایک آبرو باختہ حسینہ تھی، جس نے اپنے جوان جسم کی گرمی سے بڑے بڑے کارآمد لوگوں کے دلوں کو پکھلایا ہوگا، اپنی کافراواؤں کے سحر میں مبتلا کر کے اپنا غلام بنایا ہوگا، اُس کی پہنچ ڈور ڈور تک ہوگی، اُس کی باتوں سے مجھے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اُس نے کئی گولیاں نہیں کھیلی ہوں گی۔ اُس نے جن بڑے لوگوں کو نوازا ہوگا، اُن کی کمزوریاں بھی ضرور اپنی مٹھی میں رکھی ہوں گی۔ روی شکر کیا پہنچا تھا، سروجنی کے ترش کا ایک تیر حکومت کے اہم ستونوں کو بھی اندازہ بر اندام کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا، وہ ایک طاقتور مقامی تھی جس کی کشش نے مائے بے بڑے بڑے سورما بھی پانی بھرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے، اُس کی آنکھوں میں جادو تھا، وہ لوگوں میں پانگن تھا، اُس کے قرب میں وہ نشہ تھا جو انسان کو عقل و خرد سے بیگانہ کر دینے میں لاسا جاتی نہیں رکھتا۔ اُس کی نگاہ غلط انداز میں وہ بیٹھا نہ رہتا جو جس مخالف کو مفلوج کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ حشر بد اماں اس وقت میری دسترس میں تھی، انکارانی کی لازوال قوتوں نے اُسے میرے حق میں موم بنا دیا تھا۔

میں نے سروجنی کا ہاتھ تھام کر اُس کے سر پر کرلیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اپنی زوحانی قوتوں کے ذریعے عرش پر پرواز کر رہا ہوں۔ مجھے اس کے برعکس تھی، میں اپنے پریشان ذہن کو اُس کے جسمانی رابطے کے ذریعے پرسکون رکھنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ مجھے اپنے ارادے میں ناکامی نہیں ہوئی، سروجنی کے پُر کشش جسم کی لذت انگیز پیش میرے اعصاب کو سکون پہنچانے میں بڑی موثر ثابت ہو رہی تھی۔ میں جادو کا بول میں گم رہا تو سروجنی کی مزاحم آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”کہاں گم ہو گئے مہاراج.....؟“ شاید اُس کے حجبے نے میری محویت کا راز اجاگر کر لیا تھا۔

رہے تھے اُسے سادھنا کی مداخلت پسند نہیں آتی تھی۔
”میں نے سادھنا کے چوبیٹھن بھانپ کر بڑی کمزور آواز میں کہا۔ ”سر کی کال ہے۔“
”میں نے چوبیٹھن کوئی حکم دیا تھا۔؟“ سروجنی اپنے غصے کے اظہار پر قابو نہ رکھ سکی، وہ قہر آلود نظروں سے سادھنا کو گھور رہی تھی۔

”آئی ایم سوری میڈم، سادھنا نے بڑی معصومیت سے اپنی حیثیت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”اچھا ہوا جو اُس کا فون آگیا.....“ میں نے سادھنا کی مشکل حل کرنے کی خاطر سنجیدگی سے کہا تو سروجنی جلی جلی کھا کر رہ گئی۔ اُس نے سادھنا کو دیکھ کر فون اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا، پھر ہاتھ کے اشارے سے اُسے واپس جانے کا حکم صادر کرتے ہوئے بڑے زور کے انداز میں گفتگو کی ابتداء کی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی پالتو بچے کو اس کی غلطی پر سرزنش کر رہی ہو۔

میں سروجنی کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا اندازہ لگا رہا تھا۔ میری موجودگی کے سبب وہ بڑی رعایت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اُس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ دوسری طرف سے بولنے والا مرلی کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اُس نے گفتگو کے دوران میری موجودگی کی اطلاع بھی دی، پھر دوسری جانب سے جو کچھ کہا گیا اسے بہت غور سے سنتی رہی۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک چارہ تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مرلی.....“ اچانک وہ بل کھا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے بڑے سرد مگر نرم لہجے میں کہا۔ ”تم ابھی روی سے رابطہ قائم کرو۔ اُسے کہو کہ مہاراج کل رات سے ہمارے مہمان ہیں..... تم اگر روی کی ٹیم میں شامل ہوتے تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔ میں جانتی ہوں کہ اُس ڈی آئی جی کے بچے کی کیا اوقات ہے، اُسے میرا نام لے کر کہو کہ زیادہ دیر نہ بننے کا دھیان من سے نکال دے ورنہ سڑکوں پر بھیک مانگتا نظر آئے گا..... فون پر بحث مت کرو، گھر آ کر بات کرنا..... ہاں، میں مہاراج کے پاس ہوں۔“

سروجنی نے فون بند کر کے نفرت سے ایک طرف پھینک دیا۔ میں اُس کے پیور دیکھ رہا تھا، روی شکر کا نام درمیان میں آنے کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی

”تو جتنا مت کر.....“ میں نے سنبھل کر اُسے فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ وہ سر پھرے مجھے کھوجنے کی خاطر ادھر ادھر کی خانوں کے اندر سے پھر رہے ہیں، مجھے پھانسنے کی خاطر سڑکوں پر جال ڈالے بیٹھے ہیں۔ میں چاہوں تو انکس لاہا کر سکتا ہوں۔ وہ تمام زندگی ہاتھ ملتے رہیں تب بھی مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ لیکن میں نے کچھ اور سوچا ہے.....“

”تم نے کیا سوچا ہے مہاراج.....“ سروجی نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

”میں خود چل کر اُن کے پاس جاؤں گا.....“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”اپنی وجہ سے میں تمہیں اور مرلی کو کسی مصیبت میں نہیں گرفتار کرنے دوں گا، اپنے ہاتھوں سے لگائے پودوں کو کولن بر باد کرتا ہے؟“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”ہمارے ہوتے ہوئے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم نے جوج بویا تھا وہ اب تناور درخت کا روپ دھار چکا ہے، مجھے ہوا کا سونچ دو مہاراج۔ پھاران کے ہوتے دیوتا پر کوئی آنچ آئے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ اپنی موت پر شواہس کرو، پوری سبھی کی پولیس مل کر بھی تمہارے اوپر ہاتھ ڈالنے کی غلطی نہیں کر سکتی۔“

”مرلی گھبرا جائے گا.....“ میں نے سروجی کو اور لپکا کرنے کی خاطر سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اُس کی راہ میں کانٹے نہیں کھیرتا چاہتا۔ تو میری فکر مت کر، ابھی وہ مورکھ لوگ بری قوت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ ذات پات کے پتھر میں الجھ کر مجھے نیچا دکھانے کے سنے دکھا رہے ہیں، ان کا انجام خطرناک ہوگا، میں ڈھیل دے رہا ہوں، وہ اسے میرا کمزوری سمجھ کر غزا رہے ہیں۔ جس دن میں نے دھول کی ایک چٹکی بھر کر اُن کی سٹ اچھال دی اُس دن انہیں بھاگے راست نہیں ملے گا۔ سب ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔“

”میں جانتی ہوں مہاراج، برتنو تمہیں میری بھتی مانتی پڑے گی۔“ وہ کارواہ حسینہ مجھ اٹھا بیٹھ گئی۔ ”جیوں میں کیول ایک بار اپنی داسی کو بھی سیوا کرنے کا موقع دو، میں تمہیں نراش نہیں کروں گی۔“

”مرلی کو آ لینے دے.....“ میں نے غصے سے توقف سے کہا۔ ”دیکھیں، وہ کیا کہتا ہے؟“ ”وہ میرے ہوتے کیا کہے گا.....؟“ سروجی مسکرا کر بولی۔ ”تم میری بھتی سو بیکار کرو، میں وچن دیتی ہوں کہ تمہارے دشمنوں کو تم تک پہنچنے سے پیشتر میری لاش سے ہو کر گزرتا ہوگا۔“

میں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ میرے لئے گرو کی بات پر عمل کرنا ضروری تھا، اُس نے کہا تھا کہ دُرگا کا عتاب اکیس روز تک میرے اوپر بھاری رہے گا، میری اپنی قوتیں بھی پراسرار طور پر میرا ساتھ چھوڑ چکی تھیں، پرہم لال کی آتما نے بھی دُرگا کی شقی سے ٹکرانے کا خیال دل سے نکال دیا ہوگا، اسی لئے سامنے نہیں آیا تھا۔ مجھے اکیس روز تک صبر سے کام لینا ضروری تھا۔ ماضی میں جلد بازی کا مظاہرہ کر کے میں بہت کچھ گنوا چکا تھا۔ حماقتوں کو دہرانا دانشمندی کے منافی ہوتا۔ میرے لئے گرو نے جس ٹھکانے کا انتخاب کیا تھا میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، اسی میں میری بہتری تھی۔

”تمہیں میری سوگند.....“ سروجی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”کسی دبدھا میں من کو بے چین مت کرو، مجھے وچن دو مہاراج کہ تم داسی کو نراش نہیں کرو گے، ایک بار مجھے بھی سیوا کا ادھیکار بھیک دے دو۔“

میں نے آنکھیں کھول دیں، سروجی کی آنکھیں منناک دیکھ کر میں تڑپ اُٹھا۔ میں نے اس حسن مجسم کو اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لینے کا ارادہ کیا۔ وہ اگر داسی تھی تو پھر دیوتا کو اُس پر پورا یو راق حاصل تھا، جذبات طوفان کی شکل اختیار کر لیں تو پھر پاپ اور پن کے بیکھڑوں کو کھینچتا ہے؟ میں نے بھی اپنے ارادے کی تکمیل کی خاطر پیش قدمی میں پہل کرنے کی کوشش کی۔ انکا سروجی کے سر پر تھی، سروجی میرے قدموں میں اپنی جوانی کی بھینٹ چڑھائے میں اس کی پیش قدمی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میری حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی.....

مرلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، میں نے پھرے ہوئے جذبات پر قابو پانے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا، سروجی بدلتی ہوئی میرے قریب بیٹھی رہی۔ کچھ دیر تک مرلی میری آمد پر اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہا، چنانچہ میں نے میرے استفسار پر جو کہانی سنائی وہ میرے انداز سے مختلف نہیں تھی۔

”بات اب پولیس کی حد سے بھی تجاوز کر چکی ہے، چنانچہ پولیس اور سادھوؤں نے قانون کا گھیرا شروع کر دیا ہے، وہ ایک ہی راگ الاپ رہے ہیں، مجرم وارفتار کر کے سب کے سامنے پھانسی پر لٹکایا جائے۔ دوسری کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں.....“ ”وہ کسے مجرم سمجھ رہے ہیں.....؟“ میرے بجائے سروجی نے ہونٹ چباتے ہوئے

”میرے سوا وہ کچھ اور بھی لایا ہوگا.....؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔
میرے ذہن میں سید ہندوب کی متبرک لاٹھی کا خیال کلایا تھا۔ گرو نے یقین دلایا تھا کہ وہ
لاٹھی مجھ لے جائے گی، میرے علاوہ کسی اور کے کام نہیں آسکے گی۔
میرے سوال کے جواب میں سروجنی نے سید ہندوب کی لاٹھی لا کر مجھے پیش کی تو میرا
دل ایک انجانی مسرت سے سرشار ہو گیا۔ میری آنکھوں میں امید کی کرنیں چمکنے لگیں۔
”کیا بات ہے مہاراج؟“ سروجنی نے میری خوش محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ
لاٹھی تمہیں بہت پیاری ہے.....؟“

”تو ان مجیدوں کو نہیں سمجھ سکے گی۔“ میں نے اُسے ماننے کی خاطر جواب دیا۔ پھر مرلی
سے بولا۔ ”تیرا کیا خیال ہے؟ کیا پنڈت اور پجاری میری گرفتاری کے بنائے ہوئے ہٹ سے باز
آجائیں گے؟“

”میں وشواس سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ مرلی نے پہلو بدل کر کہا۔ ”ابھی کوئی بھی یقین
سے نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا۔ جہاں دھرم کی بات آجائے وہاں قانون کی حکمت بھی بے بس ہو
جاتی ہے۔“

”پولیس کے کارندے یہاں تک پہنچ گئے تو.....؟“ میں نے لاٹھی پر اپنی گرفت
مضبوط کر کے سوال کیا۔

مرلی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی اس سوال پر شپٹا جاتا۔
”وہ اگر یہاں تک پہنچ گئے تو انہیں خالی ہاتھ واپس جانا ہوگا۔“ سروجنی نے بڑے
یقین سے کہا۔ ”میں نے نہیں دیکھا یا ہے مہاراج، وہ میری زندگی میں تمہارے اوپر ہاتھ
الانے کی ہمت نہیں کر سکیں گے۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ سروجنی کی زبان سے انکارانی کے بدلے ادا ہو رہے ہیں۔ لیکن میں اس
بات سے بھی واقف تھا کہ دیوی دیوتاؤں کے معاملے میں انکا بھی میری کوئی مدد نہیں کر
سکے گی۔ مجھے پریتم لال یاد آ گیا، اُس نے لندن کے ہسپتال میں انکا بھی مدد کی لاٹھی دیکھ کر
کہا تھا اس میں طاقت کے ہزاروں خزانے پوشیدہ ہیں مگر میرے ہاتھ کے باوجود اس
سے کچھ بتانے سے گریز کیا تھا۔ میں بدری نرائن کے سلسلے میں لاٹھی کی کچھ کتابچے دیکھ چکا
تھا۔ اس متبرک لاٹھی نے امرال کا منڈل توڑ دیا تھا۔ بدری نرائن بھی اس لاٹھی کے وار

”اُس نے میری بات سننے سے انکار نہیں کیا، لیکن کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کی
لاٹھوں نے پنڈت پجاریوں کو دیوانہ کر دیا ہے۔ باغی بن کر دیکھو، زندگی کے سارے کاروبار
ٹھپ ہو گئے ہیں۔ ہر طرف آگ بھڑک رہی ہے۔ حالات قابو سے باہر ہوتے جا رہے
ہیں۔“ مرلی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈرگا کے محلہ میں اوم پرکاش کی موت
کے بعد ایک آواز ابھری تھی جس نے جمیل احمد خان مہاراج کا نام لے کر کہا تھا کہ مہاراج
نے ڈرگا دیوی کی مہان شتی کو لگا کر اچھا نہیں کیا، وہ آواز دور دور تک سنائی دی تھی۔
پنڈت پجاریوں کا کہنا ہے کہ ڈرگا کی آواز ہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا ڈرگا دیوی اتنا بڑا جھوٹ بول سکتی ہے؟“ سروجنی نے سوال
سے غناظ ہو کر کہا۔ پھر وہ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”تاج ہوٹل کے
منیجر نے کل رات مہاراج کے آنے سے پہلے مجھے فون کیا تھا۔ اس کے علاوہ پرتھوی بھی گواہ
ہے جو مہاراج کو ہوٹل سے یہاں لایا تھا۔ کیا یہ دونوں ثبوت مہاراج کو زوروش ثابت کرنے
کے لئے کافی نہیں ہیں؟“

”مجھے تمہاری باتوں پر وشواس ہے، میں بھی مہاراج کو دوشی نہیں سمجھ رہا۔ لیکن اس سے
کسی سے کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔“ مرلی نے بے بسی کا اظہار کیا۔ ”روی شتکر نے وچن دیا
ہے کہ وہ اس طرف آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ لیکن وہ اور اس کے ساتھی ابھی تک مہاراج
کو کوئے کھدروں میں کھوجتے پھر رہے ہیں۔“

”پرتھوی کہاں ہے.....؟“ میں نے پورے حالات سننے کے بعد مرلی سے دریافت کیا۔
”تم پریشان مت ہو مہاراج.....“ سروجنی نے جواب دیا۔ ”پرتھوی تمہیں پھوڑ کر
واپس ہوئے چلا گیا تھا، وہ اپنا آدمی ہے۔ پرکھا ہوا بندہ ہے۔ مر جائے گا لیکن اپنے بیان
سے نہیں پھرے گا۔“

کے بعد بھلانے لگا تھا۔ اور بھی کئی واقعات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے۔

”لوگے، جی کے اپارٹمنٹ کو میرے لئے محفوظ سمجھا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ میں اکیس روز تک اپنے کاپٹ کھنڈے کا پو میں رکھوں ورنہ کسی جنجال میں پھنس جاؤں گا۔ لیکن اگر پنڈت پجاریوں کا ریلوے آجاتا تو وہی اپارٹمنٹ میرے لئے چوہے دان بھی بن سکتا تھا۔ میں مختلف زاویوں سے درجیل صورت حال کا جائزہ لیتا رہا۔ گرو نے خلاف توقع عین وقت پر آکر مجھے پولیس ٹریپ سے بچا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا تو پولیس والے اندھے ہو گئے۔ سرچ لائٹ کی تیز روشنیاں بھی یہی تلاش میں ناکام ہو گئیں۔ وہ بے خبر ہوتا تو سامنے کیوں آتا؟ ”میں ممکن ہے کہ اس وقت تک کسی دیکھنے والے اطمینان سے بیٹھا میری بوکھاہٹ کا تماشا دیکھ رہا ہو۔“ میں نے سوچا۔ ”وہ پچھلے سال کا دوست ہونے کے باوجود میری مدد کر رہا تھا، مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا، میری حفاظت کے لئے اس نے یقیناً کچھ انتظامات ضرور کئے ہوں گے۔ اگر وہ مجھے ہاتھ تمام کر دوسروں کی نظروں سے اوجھل کر سکتا تھا تو سرورجی کے اپارٹمنٹ کے راستے میں ایسی رکاوٹیں بھی کھڑی کر سکتا تھا جن سے وہ محفوظ رہتا۔ میرے دشمنوں کے لئے آسان نہ ہوتا۔“

میں خیالات میں غرق تھا کہ معا ایک سوال بجلی بن کر میرے ذہن میں کودا۔ ”ڈرگا کی آواز نے اگر اکیس روز تک مجھے مفلوج رکھنے کی خاطر تمام راستے بند کر دیے تھے تو پھر گرو پر اس کا اطلاق کیوں نہیں ہوا؟ کیا گرو کو کسی خاص وجہ سے چھوٹ دی گئی تھی؟ اس رعایت کی پشت پر کیا مصلحت کا فرما تھی؟“

”تم کیا سوچ رہے ہو مہاراج۔“ مرلی نے پوچھا۔ ”کس بات کی چتا تمہیں پریشان کر رہی ہے۔“

”میری ایک بات مانے گا بالک۔“ میں نے مرلی کو بخجیدگی سے مخاطب کیا۔ ”بہرہذوب کی لاٹھی میں نے پوری مضبوطی سے تمام رکھی تھی۔“

”تم حکم دو مہاراج۔“

”تو اپنے کسی واقف کار پولیس آفیسر کو فون کر کے یہاں بلا لے۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو مہاراج۔“ سرورجی نے احتجاج کیا۔ ”کیا تمہیں مجھ

یامرلی پر بھروسہ نہیں ہے۔۔۔؟“

”بھروسہ نہ ہوتا تو اس وقت میں یہاں نہ ہوتا۔“

”بھروسہ۔۔۔ تم پولیس کو بلانے کی بات کیوں کر رہے ہو۔۔۔؟“

”تو نہیں سمجھ سکے گی سرورجی۔“ میں نے بڑی بخجیدگی سے کہا۔ ”میرا کہا مان لے اسی

میں ہم سب کی بھلائی ہے۔“

”دو چار دن اور ڈک جاؤ مہاراج، اس کے بعد کوئی آخری فیصلہ کرنا۔“ مرلی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اس سے ڈرگا کی آواز نے پنڈت پجاریوں کو اشتعال دلا رکھا ہے، دو پاگل ہو رہے ہیں۔ تمہاری ایک جھلک دیکھ کر ان کا جنون اور بھڑک اٹھے گا۔ وہ مارنے اور مر جانے پر تے بیٹھے ہیں، کسی کی بات نہیں سنیں گے، ذرا آگ سرد ہو جائے، پھر کچھ سوچنا۔“

”مجھے اپنے سے زیادہ تم دونوں کا خیال ہے۔“ میں نے انہیں ایک امکانی پہلو سے آگاہ کرنا چاہا۔ ”جہاں سوال زندگی اور موت کا آجائے وہاں انسان زندگی کو موت پر ترجیح دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، یہی مجبوری اُسے زبان کھولنے پر آمادہ کرتی ہے۔ فرض کرو، وہ پوری بات تمہاری خاطر دیدہ و دانستہ موت کے کنوئیں میں پھلانگ نہیں لگائے گا، سچ جان لینے کے بعد وہ پھر جانیں گے، تمہارے اس بڑے سکون آشیانے کی ایک ایک تیلی اُن کی دیوانگی سے جل کر راکھ ہو جائے گی۔ وہ پوری عمارت کو فگنڈر بنا دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ تم نے اگر مجھے جو خیالات سنا دیے تو تمہاری وفاداری پر کوئی حرف بھی نہیں آئے گا، میں بھی محفوظ ہو جاؤں گا۔“ میں نے انہیں میری ایک شرط مانی ہوگی۔“

”وہ کیا۔۔۔؟“ مرلی نے بڑی مردہ آواز میں پوچھا۔

”یہ لاٹھی میرے ساتھ رہنے دی جائے۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔۔۔؟“ مرلی کسمسا سے پوچھا۔

”تم ایک طرف ہو جاؤ مرلی۔“ سرورجی سمجھ کر بولی۔ ”اگرچہ مجھے ہرے تاس ہے، میری راج سبھا میں کیول میرا حکم چلے گا، تمہیں میرے اور مہاراج کے درمیان بڑھنے کا کوئی اور حکم نہیں ہے۔“

”شانت رہو سروجی.....“ میں نے اس کے بگڑتے تیور دیکھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔
 ”میں دیکھ رہی ہوں کہ تیرے اندر سمندر کی پھری ہوئی لہریں سر اُبھار رہی ہیں۔ لیکن تو ابھی
 نادان ہے۔ کل بابا نے والا ہے؟ تو نہیں جانتی۔ میری بات مان لے، مجھے یہاں سے چلا
 جانے دے۔“

”میں جانتی ہوں مہاراج کہ تم مہمان شہتییوں کے مالک ہو، میرے مقابلے میں تمہارا
 تجربہ بھی زیادہ ہے۔ تم نبوش میں جھانک سکتے ہو، تمہاری آگیا کا پان کرنا میرا دھرم ہے۔
 میں وجہ دیتی ہوں کہ جیون میں پھر کبھی تم سے کوئی غصہ نہیں کروں گی۔ لیکن آج تمہیں اپنی
 پیمان کا کھانا مانا ہوگا۔ آج تم نے فراش کرو یا تو میری بات مان لے جائے گا.....“

”سروجی.....“ میں نے کچھ کہنا چاہا، اُس نے میری بات کاٹ دی۔
 ”نہیں مہاراج..... نہیں۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ لئے، میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ”آج
 اپنی داسی کو کوئی حکم نہ دو، مجھے میرے من کی آشا پوری کر لینے دو۔ میں کچھ کچھ تمہاری بھلتی
 کر لوں، تمہاری آرتی اتار لوں، پھر تم جو کہو گے میں مان لوں گی۔“
 ”سروجی کی بات مان لو مہاراج، میں بھی تم سے یہی پرارتھنا کروں گا۔“ مرلی کے کچھ
 میں بھی التجا تھی۔

میں شش و پنج میں گرفتار ہو گیا۔ انکا کے علاوہ میری کلہ پپ نے بھی بار بار یہی کہا تھا کہ
 میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیا کروں۔ گرو نے بھی تاکید کی تھی کہ اکیس روز تک ہاتھ چڑ
 مارنے کی غلطی نہ کروں، سید مجذوب بھی اشاروں کنایوں میں مجھے زندگی کے باریک
 فلسفوں اور معارف کی باتیں سمجھانے کی کوشش کرتا، اُس کی دقیق باتیں میرے سر سے گزر
 جاتیں، میں وضاحتوں کی درخواست کرتا تو وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا نظروں سے
 اوجھل ہو جاتا، میں ہاتھ ملتا رہ جاتا۔

سید مجذوب کی متبرک لاٹھی مل جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا تھا، بڑے
 غور و خوض کے بعد مرلی کے فلیٹ سے چلے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سروجی میرے پیروں کی
 زنجیر بن رہی تھی، کوئی اور موقع ہوتا تو میں اُس کی درخواست کو اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتا،
 اُس کے جسم کے گداز میں بشیب و فراز میں گم ہو جاتا۔

”اپنا ارادہ بدل دو مہاراج..... میری خاطر۔“ سروجی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا، پھر

میرے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ مرلی بھی اُس کی دیکھا دیکھی قریب آ گیا..... مجھے وقتی طور پر
 سروجی کا فیصلہ قبول کر پڑا۔
 ”شک ہے.....“ میں نے اُس کی گھٹیری زلفوں میں انگلیاں پھنسا کر کہا۔ ”میں
 تمہاری بات مانے لیتا ہوں.....“

سروجی نے اپنا چہرہ اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا، پھر دوبارہ بے اختیار میرے
 قدموں سے لپٹ گئی۔ مرلی کے چہرے پر بھی اطمینان بھیلنے لگا.....!



KHANBOOKS
 STATIONARY AND LIBRARY
 F/8504 NISHTAR ROAD SHAHR AL BAZAR
 RAWALPINDI - 19136302
 PROF. A. KHAN

<http://urdu-novel.com>

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F-1930/4 NISHAT ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI F-11535632
PROP. ALI KHAN

ایک ہفتہ گزر گیا۔۔۔۔۔

میں سروجنی کے اپارٹمنٹ تک محدود ہو رہا تھا۔ وہ ہر وقت میری پذیرائی میں لگی رہتی۔ مرلی کی زبانی مجھے حالات کا علم ہوتا رہتا تھا۔ کئی دنوں کا روبا رو روز تک شپ رہا۔ پھر پولیس کمشنر اور کچھ پنڈت پجاریوں کے سمجھانے، بھلاؤ اور سادھوؤں اور پجاریوں نے سڑکوں سے اپنا دھرتا اٹھا لیا، زندگی کے کاروبار معمول پر آنے لگے۔ لیکن مرلی کی اطلاع کے مطابق پولیس نے میری تلاش جاری رکھی تھی، جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے۔ تاج ہوٹل کے میئنر نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ میں نے ہوٹل چھوڑنے سے قبل سارے واجبات ادا کر دیئے تھے، میں ہوٹل چھوڑ کر کہاں گیا۔۔۔۔۔ اس کے بارے میں اُسے کوئی علم نہیں تھا۔ پرتھوی کے کسی بیان دینے کی نوبت نہیں آئی، رومی شکر کے مشورے پر مرلی نے اُس کچھ دنوں کے لئے بمبئی سے باہر بھیج دیا تھا۔

خطرہ بقا ہوٹل گیا تھا لیکن بہت ساری باتیں وضاحت طلب رہ گئیں تھیں۔ مجھے بڑی شدت سے انکارانی کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس نے ابھی تک پلٹ کر میری خبر نہیں لی تھی۔ سید مجذوب، کی لالچی مل جانے کے بعد مجھے اپنے تحفظ کا یقین آ گیا تھا۔ میں اس اعتماد کی کوئی وضاحت نہیں کر سکتا مگر کوئی بات ایسی ضروری تھی جس نے مجھے ہر فکر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ شاید سید کی زوجانی قوتوں کا فیض تھا جس نے مجھے سنبھال رکھا تھا۔

سروجنی شب و روز میری دلجوئی میں لگی رہتی۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھتی، رات گئے تک میرے بستر سے لگی دینر قائلین پر بیٹھی رہتی۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اُس نے سادھنا کو میرے کمرے میں آنے جانے سے منع کر رکھا تھا۔ میں نے ایک بار دوبی زبان میں سروجنی سے اس ضد شے کا اظہار کیا تھا کہ کہیں سادھنا کی زبان دوسروں کے سامنے پھسل نہ جائے، جواب میں سروجنی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ سادھنا میرے بارے میں

زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گی۔ میں نے اس یقین کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی۔ اُس روز بھی سر ہفتی نصف رات گئے تک میرے پاس بیٹھی دنیا جہاں کی باتیں کرتی رہی۔ مرلی بھی قریب ہی بیٹھا تھا جب نوں کی گھنٹی بجی۔ نوں مرلی نے اٹھا لیا، پھر ایک دو چلے ادا کرنے کے بعد اُس نے راگت نمبر کہ کر ریور واپس رکھ دیا۔ اُس کے چہرے پر تشویش کے بڑاٹا اُبھرتے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اُس کی اضطرابی کیفیت بلاوجہ نہیں ہو سکتی تھی۔

”کس کا فن تھا۔۔۔؟“ میں نے لا پرواہی سے دریافت کیا۔

”مہاراج۔۔۔۔۔“ مرلی نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے کسما کر پوچھا۔ ”کیا آپ کسی ایسے آدمی کو جانتے ہیں جو میرے اپارٹمنٹ میں آپ کی موجودگی کے راز سے واقف ہو۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“ سروجنی چونک اُٹھی۔ ”فون کرنے والے نے کیا کہا تھا؟“ اُس نے مرلی سے پوچھا۔ میرے ذہن میں بھی خدشات سرسرا رہے۔ ”اُس نے کیوں اتنا کہا تھا کہ اپنے مہمان کا پوری طرح دھیان رکھنا۔ سیوا میں کوئی کی ضرورت نہ پڑے۔ اُس سے کہنا کہ کچھ سمیٹ کر لے۔“

”کیا نہیں جانتا تھا۔۔۔۔۔؟“ سروجنی کسی ناگن کی طرح مل کھانے لگی۔

”دھنیں۔۔۔۔۔“ مرلی نے غلامی میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے راگت نمبر کہنے کے بعد اُس نے قہقہہ ہنسا۔“

”کون ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“ سروجنی نے خود کھائی کا انداز اختیار کیا، اُس کی کشادہ پیشانی پر ابھرنے والی مسلوٹیں اس بات کی گواہی دیتی تھیں کہ وہ کسی نیچے پر پہنچنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

”گورو۔۔۔۔۔“ میرے ذہن میں پرتاپ کا تصور ابھرا۔ اُس نے جو ملے ادا کئے تھے اس سے یہی غاہر ہوتا تھا کہ گورو میری طرف سے بے خبر نہیں ہے۔

”اگر ایسا ہوا تو میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ سروجنی نے سختی سے بھنج کر بڑے زہریلے انداز میں کہا۔ ”اُس کے شریر کے کھوے کھوے کر کے کون سے کھوے کھوے کر کے۔“

نے اُس پر کوئی گہرا اثر چھوڑا تھا، بڑی بھیجی بھیجی لگ رہی تھی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انکارانی میرے ذمہ درد کی ساتھی تھی، میری ہم راز تھی، میری محبوبہ دلنواز تھی۔ مجھے بڑی شدت سے اُس کی واپسی کا انتظار تھا، وہ آگئی تھی لیکن بے سدھ پڑی سو رہی تھی، میں نے اُسے جگنا نامناسب نہیں سمجھا، والہانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

مجھے یقین تھا کہ میری خاطر انکا کے شب و روز کتنی مصروفیت میں گزرے ہوں گے۔ میرے تحفظ کی خاطر وہ ادھر ادھر پکراتی پھری ہوگی۔ کبھی کسی بیماری کے سر پر کبھی روی فکر کا ذہن پلٹنے کی خاطر اُسے زور لگانا پڑا ہوگا، کبھی ان فیصلوں کو تبدیل کرانے کی خاطر جدوجہد کرنی پڑی ہوگی جو میرے خلاف صادر ہوئے ہوں گے۔ وہ سرجنی کے سرے سے بھی دور نہیں رہ سکتی تھی، میری خاطر اُس نے سادھنا کے دل و دماغ کو بھی ضرور کربیدار ہوگا۔ چمکی لڑتے وقت ایک ذرا سی غفلت بازی پلٹ دیتی ہے۔ انکا نے یقیناً کئی راتوں تک اپنی پلکیں نہیں جھپکی ہوں گی، اُسے پر تیم لال نے میرے حوالے کیا تھا۔ پر تیم لال نے مجھے خودکشی سے روک کر کلڈ پیپ کے مشن کو پورا کرنے کا وعدہ لیا تھا۔ اُس نے انکارانی کو بھی مستقبل کے بارے میں بہت ساری باتیں سمجھائی ہوں گی، مشورے دیئے ہوں گے، اپنی اونیچے بیچ سے آگاہ کیا ہوگا۔

میں انکا کو معصوم اور سوگوار چہرے پر نظریں جمائے اپنے خیالات میں مستغرق تھا جب اُس نے اچانک ہنر بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ شاید نیند میں بھی وہ میرے خیال سے غافل نہیں تھی، کسی حد تک غافل بھی ہو سکتی ہے احساس نے اُس کی نیند اچاٹ کر دی۔ اُس نے محکم زور کرنے کی خاطر بدن اُٹھ کر مچھلی اُٹھڑائی لی، پھر آنکھیں ملنے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ ”تم آگئیں؟“ میں نے اُس پر ہنر بڑا کر مخاطب کیا۔ ”میں کئی دنوں سے

تہیاری راہ دیکھ رہا تھا۔ تمہارے بغیر دل نہیں تھکتا تھا۔“ جواب میں انکارانی کے ہونٹوں پر ایک اُداس مسکراہٹ لکھ رہی تھی، وہ ابھی تک مجھ سے شامی تھی۔ اُس کی خفگی بھیجتی تھی۔

”بہت زیادہ ناراض ہو.....؟“ میں بڑے لاڈ سے بولا۔ ”معاذ کی بھانجی ہے؟“ ”جھیل.....“ وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ ”کبھی کبھی تمہاری باتیں میرے دجور میں آتی ہیں۔“

”تمہارے ذہن میں کس کا نام ابھر رہا ہے؟“ مرلی نے چونک کر پوچھا۔ ”انکا کے ہونے والا کوئی گھر کا بھیدی ہی ہو سکتا ہے۔“ سرجنی کے تیور خطرناک ہونے لگے۔

”نہیں سرجنی.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اُسے بے قابو ہونے سے باز رہنے کا اشارہ کیا۔ ”تیرے من میں کس کا نام ابھر رہا ہے وہ نزدوش ہے، میں سمجھ گیا کہ فون کس نے کیا تھا.....“

”وہ کون ہے مہاراج؟“ مرلی اور سرجنی نے ایک زبان ہو کر سوال کیا۔ ”میں اُس کا شبہ نام نہیں لے سکتا، صرف اُنکا کا نام ہے کہ وہ بڑی مہمان شکتیوں کا مالک ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ آنکھ بند کر کے دھڑکی کے کسی کو نے میں بھی پہنچ سکتا ہے۔ ساگر کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتا ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔“ وہ ہوتا تو میرا اتنا دھیان کبھی نہ رکھتا.....“

میں نے وہ وضاحت سادھنا کو سرجنی کے مکتب عتاب سے بچانے کی خاطر ضروری سمجھی۔ ”گھر کے بھیدی“ کے اشارے پر میں سمجھ گیا تھا کہ سادھنا کو شبہ کی نظروں سے شناخت کیا جا رہا ہے۔ میری بات سن کر سرجنی کا غصہ ختم ہو گیا، مرلی نے بھی مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلے گئے تو میں نے روشنیاں بجھا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں تھکا ہوا تھا اس لئے جلدی سو گیا۔

رات کے دو پہر گزر جانے کے بعد میں واش روم جانے کی ضرورت کے پیش نظر بیدار ہوا تو میرے کانوں میں کسی کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے کی آواز گونجی۔ وہ آواز میرے لئے غیر مانوس نہیں تھی۔ میں نے عالم تصور میں اپنے سر پر نظر ڈالی، میرا اندازہ غلط نہیں ثابت ہوا، انکارانی میرے سر پر اپنا نازک بدن سیٹے، ہاتھوں کے پتلیے پر سر رکھے پائیں کروٹ لیتی چھوٹے چھوٹے خراٹے نشر کر رہی تھی، اُس کے چہرے پر جھکن کے گہرے تاثرات موجود تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُسے کئی راتیں جاگنے کے بعد دو گھڑی سونے کی فرصت ملی ہو۔ وہ کسی نوجوان بیوہ کی طرح لٹی لٹی اور سوگوار سی نظر آ رہی تھی۔ اُس کے پتلے پتلے نرم نازک سے تراشیدہ ہونٹ جو ہمیشہ مسکراتے رہنے کے عادی تھے اس وقت بڑے پتلیے پتلیے سے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اُسے پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ شاید میرے ناروا سلوک

”مجھے احساس ہے۔ لیکن غصے اور دیوانگی میں زبان پر قابو نہیں رہتا۔“ میں نے اصرار کر دیا۔

”اُس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔
”تمہاری آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار چل رہا ہے۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”کچھ دیر اور آرام کر لو۔“

”اتنی محبت کا اظہار مت کرو میں تمہاری یہی باتیں مجھے تڑپا دیتی ہیں۔“
”اسنے دنوں کہاں رہیں۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔
”کہاں ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔؟“ اُس نے عجیب سی بے جواب دیا۔ ”تمہارے دشمنوں کے راستے کاٹنے میں مصروف تھی۔“

”گر پرتاپ کو جانتی ہو۔۔۔۔۔؟“
”تم بڑے خوش قسمت ہو جیسے کہ گرو پرتاپ تمہاری مدد پر آمادہ ہو گیا۔ برتن مال مہاراج کے بہت سارے احسانات ہیں اُس پر، شاید وہ انہی احسانوں کا بدلہ لے رہا ہے۔
ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا۔۔۔۔۔؟“ میں نے انکا کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے وضاحت چاہی۔
”بڑا دوغلا اور کمینہ خصلت آدمی ہے۔ اُس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔“ انکا نے کسمسا کر کہا۔ ”وہ درمیان میں نہ آ جاتا تو روی شکر کے آدمی تمہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔“

”کیا تمہاری ساری قوتیں بھی دُرگہ نے چھین لی ہیں؟“
”نہیں۔۔۔۔۔“ انکا نے ہنست چہاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں براہ راست کسی دیوی دیوتا کے تابع نہیں ہوں، لیکن پراسرار قوتوں کے درمیان بھی کچھ درجہ بندی ہوتی ہے، ایک دوسرے کے مرتبے کا خیال غلط خاطر رکھا جاتا ہے۔ مجھے بھی دُرگہ دیوی کی آواز کا پانا ہے، میں براہ راست تمہارے کسی کام نہیں آ سکتی لیکن اتنی بے بس بھی نہیں ہوں کہ تمہارے اور تمہارے دشمنوں کے درمیان سینہ تان کر دیوار نہ بن سکوں۔“

جواب میں، میں نے اُس کے کچھوں کے برابر سینے پر نظر ڈالی تو شوشی سے پہلو بدل کر بولی۔

”تمہیں اس وقت بھی بد معاشی کی باتیں سوچ رہی ہیں۔“

”تمہارا سب سے پرانا اور سچا عاشق ہوں میری جان۔“ انکا کی شوشی کو محسوس کر کے میں بھی ترگم میں آ گیا۔ بڑے ظلم ہے ہیں تمہارے۔ کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں دو گی کہ میں تمہارے نشیے اعضاء سے ہی دل بہلا سکوں؟“

”حالات ابھی سازگار نہیں ہوئے ہیں جیل صاحب۔“ انکا سنجیدگی سے بولی۔ ”پنڈت نول کشور نے چندرا کی طرف پھر اپنے ہرکارے دوڑا دیے ہیں۔ کالی داس اور اوم پرکاش کی موت اُن کے لئے بہت بڑا حادثہ ہے، میرا خیال ہے کہ اب چندرا بھی پازویوں سے نیچے اترنے سے انکار نہیں کرے گا، میں اُس کی طرف سے بھی غافل نہیں ہوں۔“

”کیا دُرگہ کو اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ گرو پرتاپ نے میری مدد کی ہے۔۔۔۔۔؟“ میں چندرا کا نام سن کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”دیوی دیوتاؤں کی نظروں سے کوئی بات اوجھل نہیں ہوتی۔ دُرگہ کو معلوم ہے کہ گرو پرتاپ نے تمہیں اُس کے عتاب سے بچانے کی غلطی کی ہے۔“ انکا کا لہجہ معنی خیز تھا۔
”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں تمہیں قبل از وقت نہیں بتا سکتی لیکن ایک بات طے ہے۔
گرو واسی کی فرمائی کی سزا ضرور ملے گی۔“
”تم نے کئی چندرا کو دیکھا ہے۔۔۔۔۔؟“

”تمہارے دل میں کچھ بد شروع ہو گئی؟“ انکا نے میری کیفیت بھانپ کر کہا۔ ”فی الحال اپنے دل و دماغ کو صاف کر لو۔ گرو پرتاپ نے اکیس روز والی بات غلط نہیں کہی تھی۔ دو ہفتے اور گزر لینے دو، پھر دل کی ساری بھاری کھال لیتا۔“

”میرا دل ایک ہی ماحول میں رہنے دیتا ہے۔“ میں نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا۔ ”چندرا اور پنڈت نول کشور کھلے میدان میں اپنے اپنے گھوڑے سر پٹ دوڑا رہے ہیں، میں یہاں ایک اپارٹمنٹ میں بند بیٹھا ہوں۔“

”تم یہاں بھی اپنی دل بستگی کا سامان تلاش کر سکتے ہو۔“ انکا صر سے پھدک کر میرے کندھے پر آ گئی۔ بڑی لگاؤ سے بولی۔ ”سرو جی تمہاری داسی ہے، یہاں ہے، مندر میں تو چھوٹے موٹے پجاری بھی کسی سندر پجاریں کو اپنی بانہوں میں دو بیٹھ کر پیاس

اُچھے ہوئے ذہن میں پنڈت اوم پرکاش کا نام کبلانے لگا۔ میں نے اُسے بھی راستے سے ہٹانے کی ٹھان لی۔ چندر امیرے ذہن سے نکل گیا۔ اب میں دُگ کے اکیس روز کے عتاب میں گرفتار تھا۔ انکا میری توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے کچھ اور ٹھان رکھی تھی۔
”نہیں۔۔۔“ انکا نے میرے چہرے کے بدلتے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”پنڈت نول کشور بڑا گھاگ اور دُور اندیش آدمی ہے، جب تک چندرا واپس نہیں آ جاتا وہ کالی کے مندر میں ہی اپنے منڈل میں دیکا بٹھا رہے گا۔ کالی داس اور اوم پرکاش کے انجام نے اُسے اور محتاط کر دیا ہے۔ وہ اوچھا وار نہیں کرے گا، سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائے گا۔“

”بدری نرائن نے بھی امرالال کی چھاؤں میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی۔“ میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ ”تم اُن دونوں کا انجام دیکھ چکی ہو، چندرا اور نول کشور کا انجام اُن دونوں سے زیادہ بھیانک اور ہولناک ہوگا۔“

”مجھے اپنی ذات سے الگ مت سمجھو جمیل۔۔۔“ انکا نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”میں بھی اپنی جاتی ہوں کہ ایک ایک کر کے تمہارے راستے کی تمام زکاوٹیں دُور ہو جائیں۔ لیکن اس کے لئے ہمیں ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرنا ہوگا، جلد بازی میں غلط قدم اٹھا کر ہمیں پتہ نہیں چلے گا۔ ہوگا۔۔۔ تم نے جہاز پر بھی اشوک کے سلسلے میں جذباتی فیصلہ نہ کیا ہوتا تو وہ ٹھیک میری نظر میں آ جاتا۔“

میں نے انکا کی بات کوئی جواب نہیں دیا، شاید وہ ابھی تک اس بات سے ناواقف تھی کہ جہاز پر گرو کی حیثیت سے کون کون سے امور ہوتے ہیں۔ جہاز کے حوالے پر مجھے اسر تیا د آ گئی۔ اُس نے گرو کے ساتھ سفر کرنے کا ذکر کیا تھا۔ میں گرو پر تاپ سے امریتا کے بارے میں بھی کچھ دریافت نہیں کر سکا۔ بے درپے نہیں آ سکتا۔ واقعات نے اتنی مہلت ہی کہاں دی تھی؟

”ایک بات کہوں جمیل۔۔۔؟“

”کہو۔۔۔“

”اب تم بھی اپنی انکارانی سے اپنے دل کا بھید چھپانے لگے ہو۔“

بجھائے ہیں، تم تو سرجنی کے لئے دیوتا ہو، ایک بار مجھو لے سے اشارہ کر کے دیکھو، وہ تمہیں نہیں مٹنے کی خاطر تمہارے قدموں میں سمجھ جائے گی۔“
”تم میرا ذہن ہٹانے کی کوشش کر رہی ہو۔۔۔؟“ میں نے انکا کا مفہوم سمجھ کر کہا تو اُس نے جھک کر میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

”ایک راز کی بات بتاؤ جمیل، سرجنی سادھنا سے جلتی ہے۔ اُس نے سادھنا کو تمہارے قریب پھینکنے سے بھی منع کر رکھا ہے، کبھی ایک نظر بھر سادھنا کو دیکھو۔۔۔ وہ زندگی کی چلتی شاخ پر ایک بندگی کی مانند چل رہی ہے، ابھی کسی ہمنور کے کیسی نظر اُس تک نہیں پہنچی۔ تم اشارہ کرو، میں اُسے کپے پھل کی طرح تیار کی آغوش میں ڈال دوں گی۔“
”کیا پنڈت نول کشور یہی نہیں آیا۔۔۔؟“ میں نے انکا کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ چندرا کا نام درمیان میں آ جانے سے میرے من میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی، کلدیپ کے زخم پھر سے ہرے ہونے لگے۔ میں نے سوچا تھا کہ چندرا کو دھبیا چل کی پہاڑیوں سے نیچے اترنے کی رحمت نہیں دُوں گا، خود سیدناں اُس کے سر پر پتھر لگا دوں گا، ایک بار تو اُس کی نگاہیں بھی مجھے خلاف توقع دیکھ کر پھٹی کی پھوٹ جاتیں۔ وہ حرامزادہ آخری سانس تک جمیل احمد خان کو فراموش نہ کر سکتا۔ مرنے کے بعد میرا تصور بھی اُس کی آتما کو کسی کروٹ چین نہ لینے دیتا۔ وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ جس کے خلاف صف آراء ہونے کی خاطر وہ دنیا کے ہنگاموں سے دُور بر فانی گیمہا میں بیٹھا دیوتاؤں سے لازوال قوتوں کی بھیک مانگ رہا ہے وہ سامنے آ کر اُسے منڈل سے باہر نکل کر مقابلے کی دعوت دے گا۔ اُس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے، ممکن ہے اُس کی حرکت قلب بند ہو جاتی، سکتے کے عالم میں اپنی جگہ ہمیشہ کے لئے منجمد ہو کر رہ جاتا۔ مگر میری حسرت دل کی دل میں ہی رہ گئی۔ لندن سے روانگی کے بعد مجھے ہوائی سفر کے دوران اشوک سے اُلجھا دیا گیا، مرلی سے چھٹکارا پا کر میں تاج ہوٹل پہنچا تو کلدیپ کی آتما نے پچادان نندی کا جسم اپنا کر بھرا کا نام اختیار کر کے میری توجہ پنڈت کالی داس کی طرف مبذول کرادی۔ میں کالی داس سے بے خبر رہتا تو وہ اندھیرے میں وار کر جاتا۔ میں نے نندا کے علم اور اپنی قوتوں کو بروئے کار لا کر کالی داس کو اس طرح جہنم رسید کیا کہ سارے ہندوستان کی پولیس مل کر بھی قاتل کا سراغ نہیں تلاش کر سکتی تھی۔ کالی داس کے بعد میرے

”تم نے کیسے اندازہ لگایا.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”تم نے اس وقت کیا سوچ رہے تھے، میں نہیں جان سکی۔“ انکا کے لہجے میں شکوہ تھا۔
”پہلے میں تمہارے اصرار سے صبر کرتی تھی، لیکن اب تم نے بھی درمیان میں رُکا دیا۔“
”کرتی شروع کر دی۔“

میں انکا کی بات سن کر ہلکا سا ہنسنے لگی۔ ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا۔
”گرو پر تپ نہیں چاہتا ہوگا کہ انکا کوئی غم کے دوران امریتا اور اُس کے ہم سفر ہونے کے راز سے واقف ہو۔ اُس کی اپنی کوئی معلومات ہوگی۔ شاید اُسی نے درمیان میں کوئی پردہ حائل کر دیا ہو۔“

”اب کیا سوچ رہے ہو جیل.....؟“

”میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ایک ی جگہ بیٹھ بیٹھ میرے پیارے گھٹنے لگا ہے۔“
”کہاں جاؤ گے.....؟“

”جہاں بھی قسمت لے جائے۔“ میں نے لمبی سانس بھری۔

”ایسی غلطی بھول کر بھی مت کرنا۔ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔“

”مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو.....؟“

”میری مصروفیات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں سرجنی کے سر سے زیادہ دیر تک ڈور نہیں رہ سکتی۔ اُسے غافل کر کے مجھے باہر کی سُن گن بھی لینی پڑتی ہے، تم نہیں جانتے۔ روی شکر کی کچھ کمزوریاں سرجنی کی مٹھی میں ہیں، اسی لئے اُس نے مرلی کی بات مان لی، لیکن وہ موقع کی تاک میں ہے، تم نے اگر اُسے موقع فراہم کر دیا تو بات بہت بگڑ جائے گی۔“ انکا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”میری بات غور سے سنو جیل۔ گرو پر تپ تمہیں یہاں پہنچانے کے بعد اب ڈرگا کے غلاب سے بچنے کی فکر میں مصروف ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ اگر اکیس دن پورے ہونے سے پیشتر تمہارے اوپر وہ بارہ کوئی آفت آئی تو وہ بھی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔“

”تم تو میرے ساتھ رہو گی.....؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنے دل سے جواب مانگو، وہ کیا کہتا ہے؟“ اُس نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھا۔

”انکارانی.....“ میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔ ”رنجنی یاد ہے تمہیں..... اشوک کی بیوہ۔“

”اس وقت تمہیں اچانک رنجنی کی یاد کیسے آ گئی؟“ انکا نے مجھے گہری نظروں سے گھورا۔
”تم نے مجھے بتایا تھا کہ اشوک سے اُس کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے، دو ماہ بعد رنجنی کے ہاں وہ خوشی ہونے والی ہے جس کی حسرت دل میں لئے اشوک دینا سے منہ موڑ گیا۔“
”قسمت کی بات ہے جیل۔“ انکا اُداس ہو گئی۔ ”تمہیں یہ سن کر اور ڈکھ ہوگا کہ اشوک کے بعد اُس کے رشتے داروں نے رنجنی کو منحوس سمجھ کر اُس سے منہ پھیر لیا ہے۔ آج کل وہ اپنی بہن کے ساتھ ہے۔“

”میں اشوک کی موت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ لیکن رنجنی کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتا ہوں۔“
میں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”مجھے حکم دو، تم اُس کی کیا مدد کرنا چاہتے ہو.....؟“

”کچھ ایسے حالات پیدا کرو کہ اُس غریب کو سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا مل جائے، اُسے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلا نا پڑے، کسی کے دست نگر اور محتاج نہ رہے، سکون سے زندگی گزار سکے۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں، تم فکر مت کرو، میں رنجنی کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔“

میں انکا سے بڑی اطمینان سے کہتا رہا، وہ مجھے سرجنی، سادھنا اور روی شکر کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتاتی رہی۔ چندرا اور پنڈت نول کشور کے علاوہ کچھ اور سرجے پنڈت اور پجاری بھی۔ سادھنا نے دو چار جتن منتر سیکھ لئے تھے، میری گھات لگائے بیٹھے تھے، اُن کے بارے میں بھی انکا نے اُسے سنا دیا۔ ہم اور کارآمد باتیں بتائیں۔ میں غور سے اُس کی ایک ایک بات ذہن نشین کرتا رہا۔

وہ دوبارہ میرے سر پر پاؤں پسا کر لیٹ گئی۔ مسکرا کر کہتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ جب وہ مجھ سے ملے گی تو رنجنی ہوگی، مجھ سے میری سردہمی کی جگہ بیک کرے گی، شکوے کرے گی۔ لیکن اُس نے مجھے معاف کر دیا تھا، میری باتوں نے اُس کی ہمت بڑھائی اور وہ بھی نہیں، وہ کسی جلیل کی طرح چپک رہی تھی، میں اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ اُس کی

میرے ذہن میں شعلے بھڑک اٹھے۔ شاید انکا انہی شعلوں کو بجھانے کی خاطر مجھے سادھنا کی زلفوں میں الجھانا چاہتی تھی۔

”کیا بات ہے جمیل؟ تم نے سادھنا کے سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا۔“ انکا نے مجھے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ ”پہلے تو تمہاری رال بڑی جلدی مٹکتی لگتی تھی۔“

”آج میں کسی اور کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”وہ ایک بارقا بو آجائے تو سادھنا جیسی ہزاروں حسنا میں میری ہانپوں میں چلنا اپنے لئے کسی اعزاز سے کم نہ سمجھیں گی۔“

”سروجنی کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ انکا کے لہجے میں تعجب تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ میں نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ”کچھ دنوں پیشتر وہ مجھے رات گئے پونتا کے ریس کلب میں ملی تھی، بڑی رس بھری تھی۔ غصے میں قیامت لگ رہی تھی۔ شعلہ بدن، فخر و دین، رشک چمن، حورین۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا تو دیکھا ہی رہ گیا۔“

”پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“ انکا نے شوخی سے پوچھا۔

”میرے اندر ایک ابال آیا تھا۔۔۔۔۔ وہام مچھلی کی طرح تڑپ کر ہاتھ سے نکل گئی۔“

”تم اتنے سیانے تو کبھی نہیں تھے جتنے بالغ اب ہو گئے ہو۔“ انکا نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”مجھے تم مجھ سے اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپاتے تھے، اب تم نے کتنا سیکھ لیا ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں جمیل صاحب کتم سادھنا کی بات کیوں ٹال رہے ہو؟“

”آج۔۔۔۔۔ چھا۔۔۔۔۔ میں نے تم سے غلط ہو کر بے پرواہی کا مظاہرہ کیا۔“ اب تم نے بھی تذکران شروع کر دیا۔

”پرستم لال مہاراج کی کچھ باتوں نے مجھ کو کر دیا ہے۔“ وہ ہونٹ کانٹنے لگی۔ ”ورنہ میں اب بھی وہی انکا ہوں تم جس کے اشارے پر چلتا تھا۔ یاد ہے نا۔۔۔۔۔؟“

انکا کے لہجے میں طنز تھا، سمندر جیسی گہرائی تھی۔ میں نے اس کے بغیر نہ سکا کہ اس کے اور پرستم لال کے درمیان میرے سلسلے میں کوئی معاہدہ سرور ہو چکا تھا جسے وہ مجھ سے لٹی رکھنا چاہتی تھی۔

انکا نے جو کہا وہ غلط نہیں تھا، ایک زمانہ تھا جب میں اس کی چٹکی کی چٹکی سے مجھ کو مجھڑتا تھا، اس کی کسی بات کو رد کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھ پر رحم چلانے کی

ایک ایک ادھر پر شمار ہو رہا تھا۔ بڑے دنوں بعد ہمارے درمیان خوشگوار ماحول میں چھیڑ چھاڑ ہو رہی تھی۔ انکا نے کروٹ لے کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے سادھنا کے بارے میں کیا سوچا۔۔۔۔۔؟“

”بڑی سفارش کر رہی ہو سادھنا کی۔“ میں نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ”نہیں اس کے کنوارے بدن میں چھلکا ہوا خون تو پسند نہیں آگیا؟“

”اُسے دیکھ کر دل تو لپٹا تا ہے کبھی ابھی اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔“ انکا شوخی سے بولی۔ ”ابھی تو غریب نے کچھ بھی کھلے نہیں۔“

”تم اُسے کیا کھانا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟“ میرے لہجے میں شرارت اُتر آئی۔

”ہر بڑے کا روبرو کا افتتاح کسی بڑے آدمی سے کرنا چاہیے۔“ میں چاہتی ہوں کہ سادھنا کو جس کا روبرو میں جھونکا جانے والا ہے اس کی ابتدا تمہارے ساتھ کرنا چاہتی ہوں۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔؟“

”سروجنی کسی آکٹوپس سے بھی زیادہ خطرناک اور ڈوراندیش ہے، بڑی چالاک و مہارت ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے نواب اور راج منتری بھی اس کی کسی بات کو ٹانے سے

چوشر اپنا آگاہ پچھا ضرور دیکھ لیتے ہیں، سروجنی نے اپنی جڑیں ڈورڈور تک پھیلا رکھی ہیں۔ کاروبار جتنا بڑا ہو اس کے لئے خام مال کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے۔“ انکا نے

سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”سروجنی کا خام مال وہ حسین اور نوجیز کلیاں ہیں جو صرف کا آمد آدمیوں کی آنکھوں میں ہی چمکتی ہیں، سادھنا کو سروجنی نے بلاوجہ اتنا سنبھال کر نہیں رکھا

ہے، ایک راج منتری کو جال میں پھانسنے کی خاطر سادھنا کو چارہ بنایا جائے گا، جس راج منتری کے لئے جال تیار کیا جا رہا ہے وہ پروہان منتری سے بھی زیادہ طاقتور ہے، تمہیں یہ

سن کر ڈکھ ہوگا کہ اس کی جوان بچی کی عمر بھی سادھنا کے برابر ہے۔ پورے بھارت میں اس کا حکم کھرے سونے کے سکتے سے زیادہ چلتا ہے۔“

انکا مجھے سادھنا کے بارے میں اُکساتی رہی۔ راج منتری کی بابت تفصیل بتاتی رہی، میں خاموشی سے سنتا رہا۔ سادھنا ایسا تراشیدہ ہیرا تھا قدردان جوہری جس کے لئے اپنی

تجویریوں کے منہ کھولنے سے بھی دریغ نہ کرتے، پہلی بار دیکھنے کے بعد میرے دل میں بھی شیطان سے کروٹیں بدلتی شروع کر دی تھیں لیکن چندرا کا ذکر درمیان میں آ جانے کے بعد

وقت کے خزانوں کو دیکھ لیا تھا، میں نے غصے میں آکر پنڈت ہرچن کو ٹھکانے لگا دیا۔ انکا

بڑی طویل کہانی ہے، بڑے المناک اور ناقابل یقین واقعات ہیں۔ انکا سے کئی بار
میری رفاقت کا سلسلہ ٹوٹا، کئی بار جڑا۔ وہ میرے سر کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کو آمادہ نہیں
تھی۔ ہم نے متعدد بار سمجھوتا کیا، کئی بار وہ تنگ کر ڈھنڈھ جاتی، کبھی میں بھڑک کر اسے
خیر انداز کر دیتا، لیکن ان تمام تلخ و شیریں واقعات اور حادثات کے باوجود میں حلیم کرتا
ہوں کہ برسوں پر محیط ہماری طویل رفاقت نے ہمیں ایک دوسرے کا گرویدہ بنا دیا تھا۔
اسے وجود گندھ کر رہ گئے تھے، ہم زیادہ دنوں جدا نہیں رہ سکتے تھے.....!

سانپ کے کانے کا لال نہیں ہوتا لیکن کسی اپنے کی ایک بات نشر بن کر دل میں اتر
جاتی ہے۔ چندرا اور پنڈت نول کشور کے خلاف میرے وجود میں بارود بھرا تھا، انکا نے
میں ماضی کے زخم کریدنے کی غلطی کی تو بارود میں آگ لگ گئی۔ میں اسے جھٹکی نظروں
سے دیکھنے لگا، وہ میرے خیالات پڑھ رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ وہ مجسم التجا بن گئی۔
”تم جو سمجھ رہے ہو میرا وہ مطلب ہرگز نہیں تھا، اپنی انکاراتی کو غلط مت سمجھو۔ میں
خوبصورتی کی تم یہاں سے نکلنے کی سوچ رہے ہو، سادھنا کا ذکر چھپر کر میں تمہاری توجہ بٹانا
چاہی۔“ انکی زبان کی بجائے کی خاطر کبھی کبھی مارفا کا انجکشن بھی دینا ضروری ہوتا ہے۔
میری بات کا یہ اثر نہ ہوا۔ میں نے تم سے صرف ایک شکوہ کیا تھا کہ تم نے میری بات
نی چھوڑ دی ہے، کہ تم اہل مہاراج کی قسم کھا کر کہتی ہو کہ میں نے تمہاری بیٹی
میری پر کوئی نشر لگانے کی جاسکتی تھی۔ میں تو تمہیں صرف یہ باور کراتا چاہتی تھی کہ
رو پر تاپ نے جو کہا ہے وہ غلط ہے، اکیس روز تمہارے اوپر بھاری ہیں، مقررہ
ت پوری ہوئے بغیر تمہارا سروجنی کے اپنا شہر ہے باج جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ پھر کبھی
تمہیں میری بات ناگوار گزری ہے تو میں.....

”مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو.....“ میں نے جھلا کر اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔
اس وقت تمہاری وضاحتیں میرے اعصاب کو سکون پہنچانے کی بجائے لگاتار مشتعل کر دیا
کی۔ میں سن چکا ہوں کہ پریم لال نے تمہیں ہر قیمت پر میرا خیال رکھنے پر مجبور کیا ہے
لیکن اس معاہدے میں میری کوئی مرضی شامل نہیں تھی۔ گرد و تاپ نے جو کہا وہ میرے

عادی تھی۔ اس نے میری نرس کی ایک ذرا سی غلطی پر اسے بھی معاف نہیں کیا۔ نرس میری
زندگی کے اچھے میں خوشبو کھیرنے والا سب سے مہکتا پھول تھی۔ میرے پیار کی خاطر
اس نے اپنا سب کچھ تمہیں مان کر دیا تھا، اپنے والد اصفہانی صاحب کی دولت اور شہرت کو ٹھکانے
کر میری ہم سفر بن گئی تھی۔ وہ میرے دکھ درد کی شریک تھی، میری ٹنگسارتھی، انکا کے جھنجھوٹوں
سے حجات والائے کی خاطر انکا کے درگاہان دین کے مزاروں پر جا کر جھولی پھیلانے کی
ٹھان لی۔ انکا کو اس کے ارادوں کی تکلیف لگتی، میں نے انکا کو جوانی انتہائی کارروائی سے
باز رکھنے کی خاطر محنت ساجت کی مگر اس نے کسی لمحے کی خاطر مجھے ایک ہاتھ سے محروم کر
دیا۔ نرس کی عصمت بھی واندار ہوگئی..... میں ہاتھ دھو کر

ماضی کا بھیا تک تصور اُٹھرا تو میں کسمسانے لگا، میرے اندر چھپے آتش فشاں کا ادا
کھد کھدائے لگا۔ میری داستان حیات پڑھنے والے گواہ ہیں کہ میں نے واقعات کو من و
بیان کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ جو گزری، وہ قلمبند کر لیا گیا۔ میرے
بسیا تک واقعات کا طویل سلسلہ کبھی ڈھکا چھپا نہیں رہا، میں چاہتا تو بہت سے واقعات
حذف کر چاتا، کوئی میری ذات کی پرچائیں کے ساتھ ساتھ نہیں چل رہا تھا، کوئی گواہ کے
تھا میں کیسے عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوتا رہا، میں نے اپنی زندگی کے کچھ
بڑے غراب میں گزارے تھے۔ سڑکوں پر بھیک مانگتا بھرا تھا، تربیتی مجھے ٹھوکریں مارتا۔
اس کے حکم پر روندے ہوئے خوبصورت جسموں کو ٹھکانے لگانے کا مذموم کام انجام دیتا
رہا۔ میں نے کبھی کوئی پہلو چھپانے کی کوشش نہیں کی، کبھی پارسی کا دعویٰ نہیں کیا،
پچھے خان بنا کر کبھی نہیں پیش کیا۔ لیکن میرے اندر آگے بڑھنے کی ایک لگن ضرور موجود تھی۔
میں اپنے اندر شاہین کا دماغ، عقاب کی نظریں، لومڑی کی سی چال اور آدم خور شیر کا عزم
حاصل پیدا کرنے کی تنگ و دو میں لگا رہا۔ دشمنوں کی نگاہوں میں انکا میں ڈال کر زندہ رہنے
کی آرزو میرے کمزور وجود میں ایک ننھے پودے کی طرح پروان چڑھتی رہی، مجھے کمال
نہیں ہوتی قسمت نے یاد دی کی، میں چٹان بن گیا، انکا بھی ششدر رہ گئی۔ ایک وقت
بھی آیا جب انکا پنڈت ہرچن کے سر پر تھی، وہ اپنے کسی آقا کے حکم کی سرطانی کی عزت
نہیں کر سکتی تھی، اس نے مجھے ہرچن کے آگے جھکنے پر مجبور کیا، میں نے انکا کر دیا
تلملانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس کی دور بین نظروں نے میرے اندر چھپے

کان سن چکے ہیں۔ لیکن میں اپنے اوپر کسی کے حکم کا اطلاق ضروری نہیں سمجھتا۔ کل کیا ہونے والا ہے تو مجھے یقین سے نہیں کہہ سکتیں۔“

”بس کرو انکارانی“ اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ ”اس وقت تمہاری کوئی بات میری کچھ میں نہیں آئے گی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میری انگلی پکڑ کر چلنے پر مجبور نہ کرو۔“

انکا کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے میرے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی، زندگی میں پہلی بار میں نے کسی شخص کو برستے دیکھا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں ان آنسوؤں کو پی جاتا، انکا کے احسانات میرے دل کے لیے شہادت تھے، میں انہیں بیکسر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت میری ذہنی رو بہک چکی تھی، میں اپنے رویے میں تبدیلی نہ کر سکا، انکاروتی بسورتی مجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھتی دیکھتے سے اڑ گئی۔ میں پھر خیالات کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔

انکا ایک نئے بعد میرے سر پر آئی تھی، مجھے اس کا انتظار تھا، مجھے اس کی ضرورت تھی۔ لیکن ہمارے درمیان پھر دُوری ہو گئی، وہ قصور وار نہیں تھی، میں نے اس کی بات کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی تھی، ایک ہی جگہ پڑے پڑے انسان اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مجھ پر اکیس روز کی پابندی کا ذہنی دباؤ نہ ہوتا تو سرجنی اور سادھنا کی رفاقت میں اکیس مہینے بھی گزارے جاسکتے تھے۔ وہاں مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی، سرجنی پچارنوں کی طرح مجھے دیوتا سمجھ کر خدمت کر رہی تھی۔ میں اُسے کوئی بھی حکم دینا وہ انکار کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ انکا کا خیال تھا کہ اُس نے سادھنا کو میرے پاس آنے سے اس لئے روک دیا ہے کہ میں میرے اندر کی آگ اُس کی دوشیزگی کو نہ جھلسا دوں۔ میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ میں سات روز سے سرجنی کے رنگ و ڈھنگ دیکھ رہا تھا، میری خاطر اُس نے بھی خود کو پارٹنر کی چہار دیواریوں میں قید کر رکھا تھا، پہلے وہ ڈال ڈال پات پات اُڑتی پھرتی ہوگی، پھر سے میں بند ہو کر پرندہ بھی پھڑ پھڑانے لگتا ہے، سرجنی بھی تڑپ رہی ہوگی۔ سہ خوار کو ایک روز بیٹے کو نہ ملے تو اُس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگتے ہیں، سرجنی تو بایا نوش تھی۔ اُس کی اپنی ذات بھی کسی بھری بوتل سے کم نہیں تھی، اُس کا پورا وجود نہ تھا، وہ سیل بند بھی

نہیں تھی کہ مجھے اُس کے حصول میں دُشواری ہوتی، میں ایک اشارہ کرتا بوتل کی کاک خود بخود کھل جاتی، وہ گھر کی مالک تھی، پہلا حق بلاشبہ اُس کا تھا، بعد میں وہ سادھنا کو بھی خدمت کا موقع دے سکتی تھی، لیکن جب ذہن الجھا ہو، نگلن کی شدت وحشتوں اور جنون کو ہوا دے رہی ہو اُس وقت انسان کو ہری ہری نہیں سمجھتی۔ میں جس خوبصورت پنجرے میں قید تھا وہاں کے دروازے بھی بند نہیں تھے لیکن مجھے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی، اسی احساس نے میرے اندر جوار بھائے کی کیفیت پیدا کر دی تھی، مہر کی برداشت نہیں تھی مجھ میں۔ میں ساری پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر وہاں سے بھاگ نکلنے کی سوچ رہا تھا، میرے دشمن آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے، اپنی مرضی سے جی رہے تھے۔ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش دم سادھے ایک گوشے تک محدود رہوں، یہ مجھے منظور نہیں تھا۔

پہلے بھی کئی بار میں نے مصلحتوں کو نظر انداز کیا تھا، دل کے کہنے پر عمل کیا تھا، مجھے اپنی غلطیوں کی پاداش میں اذیت کا حالات سے دوچار ہونا پڑا، میری حماقت سے میرے اپنوں کو بھی نقصان ہوا لیکن مجھے کبھی اس کا ملال نہیں ہوا۔ دوفریق لڑتے ہیں تو فتح صرف ایک کی ہوتی ہے، دوسرے کو جھکنا پڑتا ہے۔ جو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، کسی پناہ گاہ میں چھپ کر بچنے والے اُسے بزدل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے وجود پر کبھی بزدلی کی پٹائی نہیں لگنے دی۔ بدری نرائن جیسا کمینہ خصلت پنڈت بھی میری وحشتوں سے ڈر کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کئی بار اُس نے خود کو کالی کے مندر میں محفوظ کرنا چاہا، انکا نے مجھے مندر میں جانے سے روک دیا، میرے مناج سے آگاہ کیا، میں نے اُس کی نہیں سنی، دند تاتا ہوا مندر میں داخل ہو گیا، پھر سے بت اور اُن سے منسوب روایتی ہولناک اور پراسرار باتیں میرا راستہ نہیں روک سکیں۔ میں ان فریب دہانوں کو نگلن، پراسرار اور خوفناک کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ بدری نرائن سے خودی کے وقت اگر میری کلدیپ میری مدد کو نہ آجاتی تو میں بدری نرائن کے بعد امر لال کو بھی اپنی کھچکی چوٹ پر ضرور لگا کرتا۔ موت سے ڈر کر بھاگنے والے دانشمند نہیں کہلاتے، خود کو فریب دینے کے موت تل نہیں جاتی۔ جو لمحہ جو وقت، جو جگہ لوح محفوظ پر رقم کی جا چکی ہے اُسے دیکھ کر ساری خودی مل کر بھی نہیں ٹال سکتیں۔ پھر موت سے کیا ڈرنا.....؟

میں ایک مسلمان گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے

پچانے میں دھوکہ نہیں کھایا تھا.....!

اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، کپڑے پھٹے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ سر کے بال خود رو جھاڑیوں کی طرح بکھرے بکھرے تھے، انہیں برسوں سے کتنی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس کے تلووں میں مٹی کی جھیں جی نظر آرہی تھیں، ایزویوں کی دراڑیں بھی بہت واضح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔ جسم کا لباس بھی خستہ تھا جس میں گتے مختلف رنگوں کے پیوند اپنا رنگ پیکر کر چکے تھے۔ لیکن اس چہرے پر ایک جلال موجود تھا۔ اس کی نگاہیں اُبلے، نادر و نایاب ہیروں کی مانند چمک رہی تھیں۔ بظاہر اپنی آجڑی کیفیت میں بھی وہ بادشاہ لگ رہا تھا، ایک عجیب سی مہ وقار بے نیازی سے سرشار نظر آ رہا تھا۔

سید مجذوب کو سامنے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنوں میں اُبال آنے لگے، میری پلکوں نے جھپٹنا بند کر دیا، بڑی مدتوں کے بعد اس کی دید کی لذتوں سے فیض یاب ہوا تھا، اندیشہ تھا کہ کہیں میں آنکھیں بند کروں، وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

”کتنے میں خریدایہ عالی شان کا بگ؟“ سید نے دیدے نچا کر خواب گاہ پر ایک اچلتی نظر ڈالی۔ ”بڑے ٹھانڈے نظر آ رہے ہیں۔“

”میرا دیر شد.....“ میں نے ہاتھ جوڑ لئے۔ ”میری رہبری کرو، میں الجھ گیا ہوں۔“

”تم میرے حق میں ہو سید.....“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں دُرگہ کی قوتوں کے شکنجے میں جکڑ گیا تھا، تم نے مجھے تھام کر اس دلدل سے نہ نکالا ہوتا تو میں.....“

”اگرچہ پرمسوار ہا ہے، لیکن اس کے لیے نجات دہانے کے لیے“ ”ایجاب و قبول کے چکر میں پڑا تو گھن چکر بن جائے گا نظر نہیں آئے گا۔“

”آج مجھے مایوس مت کرنا..... مجھے راستہ نہیں ملے گا، تم میرا ہاتھ تھام لو.....“

”آکھ پھولی کھیلنا بند کر دے، اوندھا ہو جا۔“

”تم نے پھر اشارے کنایوں میں باتیں شروع کر دیں۔“ میں نے گڑگڑا کر کہا۔ ”میرا دم گھٹ رہا ہے سید..... میری انگلی پکڑ کسی راستے پر لگا دو۔“

”آج تیری بلبل نہیں دکھائی دی.....“ سید نے معنی خیز انداز میں گردن کو جنبش دی۔ ”ہو گئی بکھر.....“

”اُس نے دُرگہ کا پجاری ہونے کے باوجود اس کی پرواہ نہیں کی، پریتم لال کی دوستی کی خاطر.....“ کے سمندر میں چھلانگ مار دی۔ میں کیوں چوروں کی طرح چھپا بیٹھا رہوں.....“ اس کی بات سن رہی ہو؟ سمجھ رہی ہو میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں.....؟“

دوسری سمت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں تھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں پہلے ہی خطبہ پھا، مجھے اور پریشان مت کرو۔“ میں نے اس بار قدرے اونچی آواز میں کہا۔ ”میری دوستی کا مجھ پر چھپ کر تماشہ مت دیکھو۔ میرے اعصاب چنچنے لگے ہیں، سن رہی ہو انکارانی، میں ایک کراہہ دنوں برداشت نہیں کر سکتا۔ پریتم لال نے تمہیں ہر قیمت پر میری حفاظت کرنے کی ہر صورت کی ہے، تم اس کی پابند ہو۔ لیکن میرے اوپر ایسی کوئی بندش نہیں ہے، تمہیں پریتم لال کی پابندی سے بچنے کا واسطہ، اپنے زہریلے بیجوں کو میرے سر میں چھپونے کی کوشش مت کرنا، اگر تم بھی دُرگہ کے ملک سے خوفزدہ ہو تو بے شک مجھ سے دور رہو۔ لیکن میری ایک بات کان کھول کر سن لو اگر تم نے میرا راستہ روکنے کی غلطی کی تو پھر ہمارے درمیان برسوں کی رفاقت ختم ہو جائے گی۔ مجھے مذمت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ میں کئی بار موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کی سوچ چکا ہوں۔“

”کدھپ نے اپنی قسم دے کر میرے پیروں میں زنجیر پہنا دی، کبھی تم نے اپنے بیجوں کی کر بناک چھین سے مجھے گھپ اندھیروں میں دھکیل دیا، ابھی پریتم لال نے درمیان میں آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ لیکن آتش فشاں کے اُٹنے لاوے کو زیادہ عرصہ نہیں روکا جاسکتا، اس پر بند نہیں باندھے جاسکتے۔ میری دیوانگی حد کو پہنچ رہی ہے، تم میرے قدموں میں سادھنا کی دوشیزگی کی بیڑیاں ڈالنے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ سروجنی میرے راستے کا پتھر نہیں بن سکتی۔ اگر تم کو اتنا ہے تو میرے سر پر اہلس آ جاؤ ورنہ آج رشتے کی تمام بندشیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔“

”کس کو آوازیں دے رہا ہے؟ کیوں ریگستانی اونٹ کی طرح پانی کے لئے بلبل رہا ہے.....؟ بھونکنا بند کر دے بد بخت.....“

”کمرے میں ایک مانوس آواز گونجی۔ میں پاگل ہو گیا۔ میں نے جنونی انداز میں پلٹ کر دیکھا، وہ لاؤنج میں کھٹنے والے دروازے سے ٹیک لگائے بیوی بے نیازی سے پاؤں پھیلائے بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ وہم نہیں ہو سکتا تھا..... میری نظروں نے سید مجذوب کو

”وہ بھی اب بات بات پر مجھ سے رُوٹھنے لگی ہے۔“ میں نے شکوہ کیا۔

”سید نے میرا جواب سن کر قہقہہ لگایا۔ اُس کے قہقہے میں طنز تھا، نفرت تھی، حقارت تھی۔ وہ دیر تک چپ چاپ قہقہے لگاتا رہا۔ پھر یکھنت خاموش ہو کر اس طرح ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے کوئی آہٹ نہ رکھا ہو۔ پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بڑی مدہم آواز میں بولا۔

”مشش... مشش...“ میں سو رہی ہے، جاگ گئی تو لٹو گھومنے لگے گا۔ اسی کے قدموں میں پزارہ، باقی سب بھول جا۔“

”تمہیں خدا کا واسطہ سید، آج مجھے ملاؤں سب کرنا۔“ میں نے انکاری سے کہا۔

”نقشب لگا۔ ڈبکی مار دے۔۔۔۔۔ تاک دیا کرو گی۔“ وہ سر کھاتے ہوئے بولا۔ ”کوئی جگنو پکڑ لے، اُس سے آنکھیں لڑایا کر۔۔۔۔۔“

”میں اس قید سے رہائی کا خواہشمند ہوں۔“ میں نے کھل کر بات کر لی تھی۔

”زودی کو دھکی لگ جانے دے۔ گھانٹیں کھل جائیں گی۔“ اُس نے بڑی رازداری سے جواب دیا، پھر داڑھی کھجلائے لگا۔

”میں تمہاری باتیں مجھ سے قاصر ہوں، مجھ سے کھل کر بات کرو دیر دیر شد۔“ میں نے عاجزی کا اظہار کیا۔

”لوٹن کیوڑ کی طرح قلابازی کھانی شروع کر دے۔ لاشی چلانا سیکھ لے۔“

”سید۔۔۔۔۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”پریتم لال کہتا تھا کہ تمہاری لاشی میں طاقت کے ہزاروں خزانے پوشیدہ ہیں۔ میرے لئے اور کچھ نہیں کر سکتے تو مجھے اس لاشی کے تمام راز سے ہی آگاہ کر دو۔“ میں نے منت کی۔

”پھر سٹھکھیلنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔؟“ اُس کی آنکھیں پٹپٹانے لگیں۔ ”جواری، شرابی، کبابی۔۔۔۔۔“

”میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا چراغ گل کر دوں گا۔“ میں نے الجھ کر کہا۔

”دُحوال بن کر اڑ جائے گا۔“ سید نے مجھے جیتی نظروں سے گھورا۔

”پھر کیا کروں۔۔۔۔۔؟“ میں جڑ بڑھنے لگا۔

”اُلٹا کھڑا ہو جا۔۔۔۔۔ ٹھکے لگانا بند کر دے۔“

”سید، تمہیں حضرت گیسو دراز کی قسم۔“ میں نے ٹھک آ کر کہا۔ ”میری رہنمائی کر دو۔“

جواب میں سید کی آنکھوں میں شیطاں قفس کرنے لگے، حضرت گیسو دراز کا نام سن کر اس نے مجھے تیز نظروں سے گھورا، پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیل گیا۔ وہ مجھے پاپس کر گیا۔ لیکن نہیں۔ اُس نے اپنے ڈھکے چھپے جملوں میں میری رہنمائی کرنے کی کوشش ضرور کی ہوگی، میری بہتری منظور نہ ہوتی تو وہ آنے کی زحمت کیوں مگوارا کرتا؟ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ تھا، شاید اُسے کھل کر کہنے کا اختیار نہیں تھا۔ میں ہی نا مجھ تھا جو اس کے رمز و اشاروں کی تہہ تک غوطہ لگانے سے قاصر تھا، اُس کی باتوں کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں بڑی دیر تک سید کی باتوں پر غور کرتا رہا، میری وحشتیں جنون کی سرحدوں کو چھونے لگیں۔ میں نے سر دھجی کے اپارٹمنٹ سے جانے کی ٹھان لی۔ سر دھجی والے دروازے پر دستک دینا بیکار تھا۔ وہ میرے راستے کی دیوار بن جاتی۔ میں کچھ سوچ کر آگے بڑھا، اوٹنگ والے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر آ گیا۔ سید کی لاشی میرے ساتھ تھی۔ میں باہر جانے والے راستے کی سمت قدم اٹھانے لگا۔۔۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر کی کھلی فضا میرے لئے کس قدر گہرا آلودہ تھی، پولیس کے فکاری کتے کھی کوچوں میں میری بوسو گھٹتے پھر رہے تھے۔ وہ کتے نہ کھیں، کسی گلی میں، کسی کوپے میں، کسی بازار میں مجھے ضرور دبوچ لیتے، مجھے پھر اذیتوں سے گھر لے کر رہا کرتا۔ اُن کے پاس بظاہر میرے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اگر افسانہ میں سانس لینے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔ انکا نے بھی کہا تھا کہ میں باہر قدم نکالنے سے گھر لے کر آؤں۔ اُس نے بتایا تھا کہ رومی شکر نے وقتی طور پر اپنی کچھ نجی کمزوریوں کے سبب مرلی کی بات مان لی تھی، لیکن وہ بھی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں مرلی کے گھر سے باہر کہیں پکڑا جاؤں، رومی شکر کہہ سکتا تھا کہ اس نے صرف مرلی کے اپارٹمنٹ کی حدود تک چشم پوشی کی ضمانت دی تھی۔ میں بھی حالات کی نزاکت کو سمجھ رہا تھا۔ گرو پر تاپ کوئی چھوٹا موٹا پنڈت نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ درگا کی آواز کو نظر انداز کرنے کی جسارت کبھی نہ کرتا، انکا نے مجھے یقین دلایا تھا کہ گرو پر تاپ کو کسی اس کی نافرمانی کی سزا ضرور ملے گی۔

پولیس کمشنر اور بڑے پنڈتوں نے درگا کے پیاریوں کو نہ سمجھا ہوتا تو شاید ابھی تک وہ بھی کسی شاہراہوں پر دھرتا جمائے بیٹھے ہوتے۔ کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کی اوپر

موت کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ اخباروں نے بھی اس کی خبر پڑے اور اچھے تقریر کئے ہوں گے، پولیس اور قانون کی ناکامی کی دھجیاں بکھیری ہوں گی۔ اس کی تک میری گرفتاری کے مطالبے پر زور دیا جا رہا ہوگا۔ حکومت کی جانب سے وضاحتی بیانات کی شائع ہو رہے ہوں گے، انکا کیا بات غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ روی شکر اگر موقع کی تلاش میں تھا تو اس نے اپنے اعتماد کے آدمیوں کو چوپانی کے ایک ایک چپے کی نگرانی پر مامور کر رکھا ہوگا۔ لیکن اس کا تھکا میں غارت سے باہر قدم نکالنے ہی دھریا جاتا۔ میری گرفتاری کے بعد سرجانی بھی سوائے چوپانی کے اور کیا کر سکتی تھی۔ بات کسی ایک آدمی کی ہوتی تو شاید اُس کے گداز بدن کے غضب اور مزاح میری سفارش کے کام آجاتے لیکن وہ جیل احمد خان کے سلسلے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ہندوستان کے تمام پنڈت پجاریوں کو جیل احمد خان کی تلاش تھی، وہ ایک عرصے سے میری کھات لگائے بیٹھے تھے۔ پنڈت نول کشور پرودا میں بیٹھا اپنے چیلوں کے ذہنوں میں میرے خلاف زہن بھر رہا تھا۔ بدری نرائن اور امر لال کی موت کا فسانہ ابھی تک اُن کے خیالوں میں گونج رہا ہوگا۔ چند رائے قسم کھاتی تھی کہ جب تک وہ مجھ سے اپنے باپ کا انتقام نہیں لے گا کسی موقع نازک کے بدن کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ بدری نرائن کے واقف کاروں نے بھی اُس کی چٹاکی راگھ ایک لٹیا میں محفوظ کر رکھی تھی۔ انہوں نے بھی کالی کے مندروں میں بیٹھ کر دیوی دیوتاؤں کو وچن دیا تھا کہ میرا جنازہ قبر میں اتارنے کے بعد ہی بدری نرائن کی راگھ کی آخری رسومات کی ادائیگی کے فرض سے سبکدوش ہوں گے۔

سروجنی، انکارانی کے زیر اثر تھی۔ اُسی کی فراہم کردہ معلومات کی وجہ سے میں نے مرلی کو بے دام غلام بنالیا تھا۔ ورنہ بات کب کی بگڑ چکی ہوتی۔

میں بچہ نہیں تھا کہ وقت کی نزاکت اور حالات کی سنگینی کو نہ سمجھ پاتا۔ لیکن مقدر کے کلمے کو مٹانا بھی میرے اختیار میں نہیں تھا، میں تمام مصلحتوں سے واقف تھا لیکن کسی اندرونی وحشت نے مجھے بیٹھے بٹھائے ورغلا دیا تھا۔ یہ وحشتیں، جنوں کی یہ باتیں نہ ہوتیں تو لمبی چوڑی کہانیاں اور افسانوی سلسلے کبھی جنم نہ لیتے، بات ایک لائن میں ختم ہو جاتی۔ ”ایک تھا راجہ، ایک تھی رانی، دونوں مر گئے ختم کہانی“..... آگے تمام شد لکھ دیا جاتا۔ کیا ضرورت تھی یہ بتانے کی کہ راجہ کون تھا؟ کہاں پایا ہوا تھا؟ کیسے پروان چڑھا تھا؟ راج گدی تک

پہنچنے کی خاطر اُسے کیا کیا پاپڑ بیٹھے پڑے تھے؟ رانی کس ماحول کی پروردہ تھی؟ راجہ کے دل میں اُترنے کی خاطر کن حالات اور واقعات نے اُس کی قسمت کی یاد دہی کی تھی؟ دونوں کی شادی کے سلسلے میں کیا کیا پیچیدگیاں اور دشواریاں پیش آئی تھیں؟ پھر راجہ کا مسن موہ لینے کے بعد رانی نے سارے راج پاٹ اور سنگھاسن پر کس طرح قبضہ جمایا تھا.....؟ وہ نور جہاں کس طرح بن گئی.....؟ اکبر نے راجپوتوں کی بغاوت فرو کرنے کی خاطر جو دھما بلی سے شادی کر لی لیکن جہانگیر کی محبت پر پھرے بٹھادیے گئے، انارکلی کو دیوار میں کیوں جودا دیا گیا تھا؟ کوئی نہ کوئی راز تو ہوگا؟ وہ راز کھل جاتا تو ایک اور کہانی وجود میں آ جاتی، یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا، بات سے بات نکلتی رہتی، فسانوں میں جوڑ و پیوند لگتے چلے جاتے۔ لیکن جب قدرت کا اشارہ ہو جاتا تو تمام ادیبوں اور مصنفوں کے قلم ٹک جاتے، سارے کلی پندوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا..... تری تمام ہو جاتی.....!!

میرے سلسلے میں بھی مقدر کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ میں اس اشارے کو کس طرح چل سکتا تھا.....؟

میں سینہ تانے قدم بڑھاتا اپارٹمنٹ کے خارجی دروازے پر پہنچا تو مضبوط اور منتقل دروازے نے مزاحمت کی کوشش کی۔ میں نے سید کی لاٹھی کو دروازے پر ٹکا کر آہستہ سے دباؤ ڈالا تو دروازہ اپنی جگہ سے ہل گیا، قفل ایک کھٹکے کی آواز سے کھل گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر قدم نکالنے کی کوشش کی۔

”پنڈت زاپ.....“ میں نے پشت سے لاکارا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، مرلی کی ایک گاؤں میں ملبوس ریوا اور تانے کھڑا تھا۔ شاید دروازے کی چرچاہٹ اور قفل کے کھٹکے کی آواز نے اُسے بیدار کر دیا تھا۔ مجھے پہچان کر اُس نے ریوا اور نچا کر لیا، تیزی سے میرے سر پر ایک کپڑا لٹکا کر مجھے لہجے میں بولا۔

”مہاراج..... تم اس سے کہاں جا رہے ہو.....؟“

”مرلی.....“ میں نے غصے سے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تم سے پہلے بھی درخواست کی تھی کہ مجھے جیل پہنچا دو۔ تم نہیں سمجھ سکو گے، لیکن میں جانتا ہوں اب تمہارا جیل ختم ہو گیا۔“ اُس نے محفوظ نہیں رہا، گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے، میں ایسا نہیں چاہتا۔

”مجھے بتاؤ مہاراج، تم کو کس بات کا خطرہ ہے.....؟“

”وقت مت ضائع کرو، میری بات مان لو۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔“

”وہ کونٹھک ہے۔ لیکن سروجنی.....“

”میں اسے بعد میں سمجھا لوں گا..... جلدی کرو، میرے پاس سے کم ہے۔“

”ایک منٹ شکوہ مہاراج، میں لباس بدل لوں۔“ مرلی نے درخواست کی۔ لیکن میں

نے اُسے منع کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لباس بعد میں تبدیل کرے گا، پہلے سروجنی کو بیدار کر کے میرے جانے کی اطلاع دے گا۔ سوچنی کے علاوہ انکا کو بھی میرے جانے کی بجھک مل جاتی تو بات مجز جاتی۔ وہ میرے سر پر لڑکھائے پنوں کے نشتر لگاتی، میں پھر سے بے بس ہو جاتا۔

”لباس کی فکر مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس لباس میں باہر کا راؤنڈ لینے نکلے تھے اتفاق سے تم نے مجھے مشتبہ حالت میں دیکھ کر چھپا لیا۔ میں نے غار ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ سمجھ رہے ہو میری بات؟ یہ کہانی زیادہ موثر ثابت ہوئی..... جلدی کرو۔“ مرلی ہچکچا رہا تھا۔ پھر اُس کی نظریں دروازے کی ہلی ہوئی چولوں پر پڑیں تو اُس نے آٹھویں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”تم سامنے نہ آ جاتے تو میں پورا دروازہ اُکھاڑ کر ایک طرف رکھ دیتا۔“ میں جھکا کر بولا۔ ”میری بات مان لو ورنہ وقت گزرنے کے بعد ایک بھاگے ہوئے مجرم کو اپنے اپارٹمنٹ میں پناہ دینے کے جرم میں تمہاری ورودی بھی اُتر جائے گی۔“

مرلی نے بالآخر میری بات مان لی۔ میں نے اُسے خوابگاہ میں جانے کا موقع نہیں دیا وہ بھی دروازے کا انجام دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا، اسی لباس میں میرے ساتھ نیچے آ گیا۔ کیراج سے گاڑی نکالی، مجھے لے کر تھانے کی سمت روانہ ہو گیا۔ لیکن اُس کے چہرے پر ابھی تک الجھن اور پریشانی کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ اُسے مجھ سے زیادہ سروجنی کا خطرہ لاحق تھا۔

”ایک بات کا دھیان رکھنا۔“ میں نے اُسے یاد دلایا۔ ”میری لالچی مجھ سے نہ لیا جائے، تم کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ کوئی ماتحت تمہارا حکم ماننے سے انکار نہیں کرے گا۔“

”حالات بدل چکے ہیں مہاراج.....“ مرلی نے کسمسا کر جواب دیا۔ ”ماتحت سامنے

ہوتے ہیں تو دم ہلاتے رہتے ہیں، اکیلے میں افسروں کی ماں بہن ایک کرتے سے بھی روکنے نہیں کرتے.....“

”انہیں کسی طرح سمجھا دینا۔“ میں نے دوبارہ زور دے کر کہا۔ ”لالچی مجھ سے لے لی گئی تو میں ذیل کی سلاخوں کے پیچھے سکون سے نہیں رہ سکوں گا۔“

”اس لالچی میں ایسی کیا بات ہے؟“ اُس نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”واپسی میں ایک بار پھر اپنے اپارٹمنٹ کے دروازے کو غور سے دیکھنا۔“ میں نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہیں خود ہی اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔“

رات سنسان اور ویران تھی، سڑکوں پر برائے نام گاڑیاں نظر آرہی تھیں، پولیس کی ایک سائزن کار دُور سے شور مچاتی ہماری جانب لپکی لیکن قریب آ کر انہوں نے مرلی کی گاڑی شناخت کی تو خاموشی سے آگے نکل گئی۔

”دیکھ رہے ہو مرلی؟“ میں سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”ایک ہفتہ گزر گیا، لیکن ابھی بری تلاش جاری ہے۔“

”ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ درست ہو۔ لیکن رات کے وقت جرائم پیشہ افراد کی وجہ سے بہت زیادہ چوکس رہتی ہے، آج کل دہشت گردی کی وارداتوں میں بھی اضافہ ہونے لگا ہے۔“

”روی غور سے جاگرت کرنا۔ لیکن اُسے اپنے من کے کسی مجید سے بھی آگاہ مت کرنا۔“ میں نے اُس کی بات کا اعجاز کر کے کہا تو وہ چونکا۔

”میں سمجھ نہیں مہاراج.....“

”وہ اوپر سے جتنا شائستہ نظر آتا ہے اتنا ہی کھونا بھی ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”میں دیکھ چکا ہوں کہ اُس کے علاوہ اس والے روز بروز اپنا گھبراہٹ کر رہے تھے، کسی نہ کسی بہانے اُس کے آدمی تمہارے گھر میں آ جاتے۔ میں تمہارے اپارٹمنٹ میں گرفتار ہوتا تو تم بھی لیپٹ میں آ جاتے۔ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔“

تھانہ قریب آنے لگا تو مرلی نے میری ہدایت پر میرے دونوں ہاتھ پٹھن کر کے باغداد دیئے۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کی حالت قابل دید تھی۔ میں اُس کے دل کی کیفیت کھڑا تھا۔

”میری کوئی چٹامت کرنا بالک.....“ میں نے گھیر آواز میں کہا۔ ”میں دو ہفتے سے اندازہ پولیس کا مہمان نہیں رہوں گا، ابھی ستارے گردش میں ہیں، لیکن سے گزرتے دیو بھی نہیں آئے۔“

مرلی اب اس میں گون بھلاتا رہا، تھا نے کے دروازے پر کھڑے سپاہی نے جھپٹ کر پھانک کھول دیا۔ مرلی نے کھانچ کاؤں میں نیچے اترا تو کوئی سپاہی موقع کی نزاکت بھانپ کر اندر کی طرف بھاگے، تھا نے کا ان کی اسپیڈ بلیئر وردی ٹھیک کرتا ہوا ہر آگیا۔ اُسے شاید سوتے سے بیدار کیا گیا تھا، نیند کا غلارہ بھی ایک اُس کی نظروں سے جھانک رہا تھا۔ مرلی کے قریب آ کر اُس نے بڑا زوردار سیلوٹ مارا۔

”سر..... آپ اس سے..... اس لباس میں.....“ میں ابھی تک گاڑی میں بیٹھا تھا۔ سید مجذوب کی لالچی میری پوشیدہ بڑی تھی۔ مرلی نے بلیئر سے کچھ کہا تو وہ اُچھل پڑا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ پھر میں مسلح سپاہیوں نے گاڑی کو گھیرے میں لے لیا۔ مرلی، بلیئر کو دکھانے کی خاطر سید تان کر کھڑے ہو کر گاڑی کا دروازہ کھول کر اُس نے مجھے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ اُس کی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ وقت وہ بڑے مشکل مراحل طے کر رہا تھا۔ میں آہستہ سے نیچے اترا اور دانستہ طور پر لڑکھاراز کرتے کرتے بچا۔ سید کی لالچی گود سے پھسل کر زمین پر جا گری۔

”خبردار.....“ بلیئر نے اپنا سر دوسریوں اور مجھ پر تان لیا۔ ”اگر چالاکی دکھانے کی حماقت کی تو پورا اثر پھیل چکی کر ڈوں گا۔“

”جب میں نے اسے لکارا تو یہ بھاگا تھا، لیکن پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے ٹنٹرا رہا تھا، اسی لئے مجھے زیادہ ڈشواہی نہیں ہوئی۔“ مرلی نے میرے لڑکھڑانے کا مقصد سمجھ کر کہا۔ ”اب لالچی شاید اس سے.....“

”یو ڈونٹ وری سر.....“ بلیئر درمیان میں بول پڑا۔ ”میں اس کو اسی لالچی کا ایسا جلاہ ڈوں گا کہ سارا کھایا پیا اُگل دے گا۔“

جواب میں مرلی نے مسلح سپاہیوں کو میری طرف سے ہوشیار رہنے کا اشارہ کیا، پھر بلیئر کو ساتھ لے کر تھوڑے فاصلے پر چلا گیا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ بلیئر ایک سخت گیر طبیعت کا ضعیف پولیس آفیسر ہے۔ مرلی شاید اُسے میرے سلسلے میں

جھاننے کی خاطر ایک طرف لے گیا تھا۔ میں پولیس کے درمیان گھرا خاموش کھڑا رہا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مرلی اور بلیئر دونوں بات کرتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ بلیئر مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

”میری ایک بات دھیان سے سن لو جیل احمد خان.....“ مرلی نے مجھے سر دلیچے میں مخاطب کیا۔ ”جب تک تمہیں جیل کسٹڈی میں نہ دیا جائے زیادہ اُچھل کود دکھانے کی حماقت نہ کرنا۔ میں نے اسپیڈ بلیئر کو تمہارے بارے میں ضروری ہدایت کر دی ہے۔ تم نے جڑ چالاک بننے کی غلطی کی تو ہم تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنانے میں دیر نہیں لگائیں گے۔“

”بھڑ ہے، ہو میری بات.....؟“

میں نے جواب میں ہونٹ چپانا شروع کر دیے۔ مرلی زیادہ دیر نہیں رکھا، اُس کے جانے کے بعد پولیس کے ارکان بلیئر کے اشارے پر مجھے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔ مجھے اتنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل کر قفل لگا دیا گیا۔ دو اُقتل بردار پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے۔ بلیئر، سید کی لالچی ہاتھ میں لئے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر بڑی حماقت سے ہلا۔

”مرلی کہہ رہا تھا کہ میں یہ لالچی تیرے پاس رہنے دوں۔ کیا کرے گا اس لالچی سے؟“ ”میرے گھنٹوں میں تکلیف ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجہ اختیار کیا۔ ”یہ لالچی میری ضرورت ہے۔“

”فکرمات.....“ ہم تیری ساری ضرورتیں پوری کر دیں گے، لیکن ایک شرط پر۔ ”بلیئر کی خوفناک نظروں سے دوکان کی جاک رہی تھی۔ ”تو ہمیں سب کچھ بتا دے.....“ سو فیصدی کا کچھ چمچ کرے گا تو یہی لالچی.....“ وہ جملہ مکمل چھوڑ کر بیہودہ اشارے کرنے لگا۔ اُس کے تیور خطرناک تھے، مرلی نے یقیناً اس سے میرے سلسلے میں نرم رویہ اختیار کرنے کی بات کی ہوگی، اُسے کسی طرح رضامند کر دینا ہو گا۔ لالچی کو میرے پاس رہنے دیا جائے۔ لیکن مرلی کے جاتے ہی بلیئر نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑا بلیئر کو نگاہوں نگاہوں میں ڈھک لیا۔

”کیا دیکھ رہا ہے؟“ اُس نے بڑے بازاری انداز میں پوچھا۔ ”یہ لالچی اپنے باب کو کبھی نہیں دیکھا تھا؟“

”تم.....“ میں نے برداشت کا مظاہرہ کیا۔ ”تم مجھ سے کیا اُگوانا چاہتے ہو.....؟“

بہی نکل پڑے کچر کے اولاد کی۔۔۔۔۔

بلیر، سید کی لاشی ہاتھ میں لئے کھڑا غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس کے حکم کی بیروی میں لاک اپ کا قفل کھول دیا گیا۔ چار سپاہی اندر گھس کر مجھ پر ٹوٹ پڑے، انہوں نے مجھے زمین پر گرانے میں دیر نہیں لگائی، میں نے مزاحمت کی کوشش نہیں کی، البتہ سر بچانے کی خاطر دونوں ہاتھ چلانے لگا۔ وہ میرے جسم پر جوتوں سے ٹھوکریں مار رہے تھے۔ سب تجربہ کار تھے، انسان کی ایک ایک رگ، ایک ایک جوڑے واقفیت رکھتے تھے۔ میں زمین پر پڑا ابلبلا تارہا۔ پچھاڑیں کھاتا رہا، بلیر دُور کھڑا مجھے مغلظات اور فحش گالیلیوں سے نوازتا رہا۔ میری حالت غیر ہونے لگی۔ ایک سپاہی کی ٹھوکر میرے بائیں ہاتھ کی کہنی پر لگی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پریم لال کی پراسرار تختی سے جڑا ہوا مصنوعی ہاتھ پھر ٹوٹ گیا، میری چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ چاروں سپاہی مشینی انداز میں مجھے لاتوں اور گھونٹوں سے نواز رہے تھے۔ میں مائیں بے آب کی مانند ترپ رہا تھا۔

”دشمنکھر۔۔۔۔۔“ بلیر نے چیخ کر اُس بٹے کٹے سپاہی کو مخاطب کیا جس نے میری کہنی پر شدید ضرب لگائی تھی۔ ”بہت آوازیں نکال رہا ہے یہ مسلا۔۔۔۔۔ اس حرای کے نر پریشاب کھڑے، پھر بھی آواز نکالے تو گھا دبا دینا۔۔۔۔۔ مر جائے تو اس کی لاش اٹھا کر ڈپٹی کے اہلکار کے باہر چھوڑ آنا۔ اُس ماں کے خشم نے بھی میرا حق مار کر ترقی حاصل کی تھی۔“

بلیر نے غصے کے عالم میں مرلی کے ساتھ ساتھ سروجنی کی آوارگی کے قصے بھی بڑے فحش انداز میں سنسنی مروج کر دیے۔ سپاہی اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے جب فون کی گھنٹی بجی۔ بلیر نے پلٹ کر دیکھا پچھلے فون سیٹ کی جانب دیکھا، پھر ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تو ایک سپاہی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر اتنی شدت سے دبایا کہ آواز کے ساتھ ساتھ میرا دم بھی گھٹنے لگا۔ بلیر نے آگے بڑھ کر دیکھا اُٹھ لیا، اُس نے بڑی دہک آواز میں ”بیٹو“ کہا تھا۔ لیکن دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سننے ہی ہکھلانے لگا۔

”جی۔۔۔۔۔ لیس سر۔۔۔۔۔ میں اسپیکر بلیر بول رہا ہوں۔۔۔۔۔ جی سر۔۔۔۔۔ آپ کی افغان مشن ٹھیک ہے سر۔۔۔۔۔ جی سر۔۔۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔۔۔۔۔ جی سر، میں حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگاؤں گا۔۔۔۔۔ م، میں سمجھ رہا ہوں سر۔۔۔۔۔ کسی کو کان نہ بنائیں ہوگی۔۔۔۔۔ رائٹ۔۔۔۔۔ رائٹ سر۔۔۔۔۔“

”پنڈت کالی داس کیسے مرا تھا۔۔۔۔۔؟“

”مجھ نہیں معلوم۔۔۔۔۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”پنڈت ام پرکاش کا نام سنا ہے کبھی۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں بولا۔۔۔۔۔ میں مسلمان ہوں، پنڈت پجاریوں سے میرا کیا لین دین؟“

”ایک ہفتے سے کبھی چھاپا دیکھا تھا۔۔۔۔۔؟“ بلیر نے پھکارتے ہوئے دریافت کیا۔

”بہنی کی ساری پولیس مل کر ہی تجھے نہیں تلاش کر سکی اور ڈپٹی مرلی نے تجھے چوہے کی طرح پکڑ لیا۔۔۔۔۔ اصل چکر کیا ہے؟ سیدھی طرح اگل دے ورنہ تیری کھات کھڑی کر دوں گا۔“

”میں تک تیرا حلیہ اتنا بگڑ چکا ہوگا کہ مرلی تجھ کو پہچان سکے گا۔“

”مجھے ایک سادہ کاغذ اور قلم لا دو۔۔۔۔۔“ میں نے غصے سے بولے انداز میں کہا۔ ”میں دستخط کے ساتھ ساتھ انگوٹھا بھی لگا دوں گا، تم جو چاہے لکھ لیتا۔“

بلیر اس طرح ہلکے آٹھ جیسے پٹرول کے کنوئیں میں کسی نے چلی ہوئی تیلی اُچھال دی ہو۔

”بھڑوے۔۔۔۔۔ حرای۔۔۔۔۔ سور کی اولاد۔۔۔۔۔“ وہ حلق کے بل چلایا۔ ”اسپیکر بلیر کھولنا“

”اُڑانے کی کوشش کر رہا ہے؟“

”آپ اپنی زبان کیوں خراب کرتے ہو صاحب؟“ ایک بٹے کٹے سنتری نے بلیر سے کہا۔ ”مجھے ایک موقع دو، میں ابھی اس مسئلے کو ٹھونک بجا کر گلزی کی طرح سیدھا کر دوں گا، اس کی زبان فر فر چلنے لگے گی۔ یہ ٹیکر کے جج آسانی سے زبان نہیں کھولتے۔۔۔۔۔“

بلیر نے کوئی جواب نہیں دیا، غصہ ناک نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے غرایا۔

”میں تجھے دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔۔۔۔۔ کچ بچتا دے کہ تیری اور ڈپٹی مرلی کی کیا

ساتھ گاتھ ہے؟“

”تم بار بار کس ڈپٹی کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ میں نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”میں مرلی کا نام تمہاری زبان سے پہلی بار سن رہا ہوں۔“

بلیر کے صبر کا پیمانہ بلیر ہی ہر جھلک پڑا۔

”نریمان۔۔۔۔۔ پر شوم۔۔۔۔۔ جوشیکھر، تم چاروں مل کر اس حرای کی دھنائی شروع کر دو۔“ اُس نے اپنے ارد گرد موجود سپاہیوں میں سے چار کا انتخاب کیا۔ ”اتنا مارو سائے کو کہ

بیورو رکھ کر وہ تیز قدم اٹھاتا لاک اپ کے قریب آیا۔ شیکھر بدستور میرے منہ پر پورا زور دے کر چڑھا بیٹھا تھا۔

”اُس نے سر دلچے میں غم دیا۔“ اس خرابی کو زور پہنا کر میری پرائیویٹ کار میں لے جا کر بیٹھا۔ سارے کا توڑ اسامیک اپ بھی ٹھیک ٹھاک کر دے۔ اس کی بہن کے سرال سے بلاوا لیا ہے۔“

وقتی طور پر مجھے بے رحم جلاوطن سے نجات مل گئی، مجھے جھکڑی پہنا کر لاک اپ سے نکالا گیا۔ چار نگین بردار مسلح سپاہی میرے ہاتھوں کو پوری طرح چوکس نظر آ رہے تھے۔ مجھے تھانے کے عقبی حصے میں کھڑی ایک کار میں بچھل کر ڈال دیا گیا۔ شیکھر نے اگلی سیٹ پر بیٹھ کر مجھ پر دیواروں تان لیا۔ وہ مجھے کہیں اور لے جانے لگے تھے۔ کہاں؟ مجھے علم نہیں تھا۔ دو منٹ بعد بلیر نے آکر اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

شیکھر شاید بلیر کے اعتماد کا آدمی تھا، اس کے سوا کسی اور کو اسے اچھے لے جانے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔ ممکن ہے مسلح سپاہی کسی اور گاڑی میں بیٹھے ساتھ ساتھ چلی رہے ہوں، مجھے اس کا بھی علم نہیں تھا۔ میرے ذہن میں بلیر کی غلیظ گالیاں گونج رہی تھیں۔ مجھے انکارانی بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ دو میرے سر پر ہوتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔ وہ بھی ڈرگ کی آواز کی وجہ سے ایسے ریزنگ براہ راست میری مدد نہیں کر سکتی تھی، لیکن دوسروں کو گتگی کا ناچ ضرور چھپا سکتی تھی۔ میں نے اُسے سروجنی کے گھر سے رخصت ہونے کی اطلاع بھی نہیں دی، وہ اس وقت سروجنی کے بالوں کی تاج پر لیٹی خزانے لے رہی ہوگی اور میں جلد بازی میں اٹھائے ہوئے قدم کی سزا بھگت رہا تھا۔ ڈرگ کے عتاب سے رہائی میں ابھی دو ہفتے باقی تھے۔ میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ بلیر کا حساب چمکا کرنے میں کسی ٹکڑے سے کام نہیں لوں گا۔

گاڑی کا سفر بیس منٹ تک جاری رہا۔ راستے میں بلیر اور شیکھر کے درمیان مختصر سے دو ایک جملوں کا تبادلہ ہوا۔ بلیر نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اُس کے اعتماد کو کبھی دھوکہ دینے کی غلطی نہ کرے، جواب میں شیکھر نے اُسے یقین دلایا کہ وہ مرتے دم تک اُس کا وفادار رہے گا، مگر دن کو اُسے گالین زبان نہیں کھولے گا۔

بیس منٹ بعد گاڑی روک دی گئی، شیکھر نے پچھلا دروازہ کھول کر مجھے باہر نکالا، وہ

ایک پرانے طرز کی دو منزلہ عمارت تھی، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ جان سکا۔ شیکھر نے ایک کمری کی نظروں پر بیٹھ باندھ دی۔ میرے ہاتھ کی کہنی میں ٹیسس آنڈری تھیں۔ شیکھر نے اسی بازو کو تھام کر مجھے دھکا دے کر آگے بڑھایا۔ میں نے کئی جگہ ٹھوکریں کھائیں، گرتے گرتے بچا۔ اس کیفیت میں بھی میں ٹنگڑا لنگڑا کر چلتا رہا۔ میں انہیں باور کرانا چاہتا تھا کہ مرلی نے انجی کی ضرورت کو میرے لنگڑے پن سے غلط منسوب نہیں کیا تھا۔

کئی موڑ درمیان میں آئے، مجھے سیزھیاں بھی ملنے لگیں۔ میری مدد کی کہنی کئی جگہ پھینکی دیوار اور لنگڑی کے دروازوں سے بھی ٹکرائی۔ پھر ایک جگہ مجھے روک دیا گیا، ہاتھوں کو پشت پر کر کے مجھے جھکڑیاں پہنائی گئی تھیں اس لئے مجھے زیادہ اُچھن چوری تھی۔

”تم اب باہر جا کر گاڑی میں میرا انتظار کرو۔“ بلیر کی مدھم آواز ابھری۔ ”ایک بار پھر تنبیہ کر رہا ہوں کہ اپنی زبان بندی رکھنا۔“

قدموں کی آواز ابھر کر زور ہوتی چلی گئی۔ شیکھر نے شاید اشارے میں جواب دیا تھا، مجھے اُس کی آواز نہیں سنائی دی۔

”جیل احمد خان.....“ ایک لمحہ بعد بلیر نے میرا بازو تھام کر سر دلچے میں کہا۔ ”تمہاری زندگی کے آخری لمحے قریب آ رہے ہیں۔ تم چاہو تو اپنی زبان سے سچ اُگل کر بھی سکتے ہو۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بلیر نے بھی دوبارہ کوئی بات نہیں کی، میرا ہاتھ تھامے خاموش کھڑا رہا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف روشنیاں بجھ گئی ہوں۔ میرا اندازہ غلط نہیں ثابت ہوا، مجھے نے دوسرے ہاتھ سے میری آنکھوں کی پٹی ایک جھٹکے سے ہٹا دی تھی۔

میں ایک مختصر سے کمرے میں کھڑا تھا جہاں ایک لڑکے کے علاوہ فرنیچر نام کی کوئی دوسری شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ پہلی نظر میں مجھے وہ کمرہ کوئی کچھ عجیب محسوس ہوائے خطرناک مجرموں کی زبان کھلوانے کی خاطر کام میں لایا جاتا ہوگا۔ میں ابھی بالکل کھوکھلے بازو لے رہا تھا کہ سامنے کا بند دروازہ کھلا اور میں حیرت بھری نظروں سے اس عجیب و غریب دکھاوے کا حجب خوابی کے لباس کے اوپر ایک قیمتی گاؤن پہنے میرے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کوئی ایسی روی

شکر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

پھر میرا ہاتھ چھوڑ دیا، اسٹینشن پوزیشن میں آکر زوردار سیلوٹ کیا، پھر اشارہ پا کر اسی برق رفتاری سے اپنا ڈٹ ٹرن ہوا اور لفٹ رائلٹ کرتا کمرے سے باہر چلا گیا۔ کمرے میں روی شکر اور میں رونگٹے کچھ دیر تک اس کی عقابی نظریں میرے چہرے پر منڈلاتی رہیں، پھر اس نے بڑے لمحے ہوئے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”تمہاری گرفتاری کس طرح ممکن ہوئی؟“

”مجرم اور قانون کی آنکھ بھولی کا سلسلہ اس سے قائم ہے، اہد تک یوں ہی چلتا رہے گا۔“ میں نے سنبھل کر جواب دیا۔ ”کسی مجرم قانون کی نظر ڈالنے میں دھول جھونک کر بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، کبھی قانون حاوی ہو کر مجرم کی گردن دیوچ لیتا ہے۔ آج قانون کی خوش قسمتی اور میری بد نصیبی کا دن تھا۔ میں فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، تمہارے ایک آفیسر نے ریوالورتان کر گرفتار کر لیا۔“

”تم شاید مرلی کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ ڈی آئی جی نے نفسیاتی انداز میں میری زبان کھلوانی چاہی، میں اس کی ریاکاری ٹاٹو گیا۔ انکارانی بتا چکی تھی کہ روی شکر نے ہمیں آنکھیں بند کر لی تھیں، وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

”میں اس۔۔۔۔۔ نام سے واقف نہیں ہوں۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

”مجھے اپنا دشمن مت سمجھو۔“ اس نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ ”دشمن ہوتا تو ملاقات کے لئے تم کو اپنے دفتر بھی طلب کر سکتا تھا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، روی شکر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتا رہا۔ ”انپیکٹر بلیر نے تمہارے ساتھ غالباً کوئی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔“ اس نے ہونٹ چبانے ہوئے کہا۔ ”جرم ثابت ہوئے بغیر کسی مشتبہ یا مشکوک آدمی پر تشدد کرنا پولیس کے ضابطہ اختیار میں نہیں آتا۔“

”مسٹر روی شکر۔۔۔۔۔“ میں نے زہر خند سے پوچھا۔ ”تم کو میری گرفتاری کی اطلاع کب مل گئی؟“

”میں ڈی آئی جی ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے پیٹیرا بدل کر جواب دیا۔ ”ہمارے اپنے بھی کچھ ذرائع ہوتے ہیں۔“

”مجھے اس وقت یہاں کس مقصد سے بلایا گیا ہے۔۔۔۔۔؟“

”تم جانتے ہو کہ پنڈت کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کے قتل نے پنڈت پجاریوں کو آپے سے باہر کر دیا ہے۔ اگر پولیس کثرت اور۔۔۔۔۔“

”میں کسی پنڈت اور پجاری کو نہیں جانتا۔۔۔۔۔ میں نے اس کا جملہ کٹ کر سنجیدگی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے تم درست کہہ رہے ہو۔ لیکن پولیس کو بہر حال تمہاری ذات پر شبہ ہے۔“ روی شکر کے لیوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ اُبھری، دہلی زبان میں بولا۔ ”ابھی تم اعتراف کر چکے ہو کہ تمہیں فرار ہوتے ہوئے کسی نے گرفتار کیا تھا۔۔۔۔۔“

”اب اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں بے گناہ ہوں، پولیس بلاوجہ مجھے پریشان کر رہی ہے، تو کیا تم یقین کر لو گے؟“ میں نے بڑے اعتدال سے کہا۔

”تم مجھے پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ اور مہذب شخص معلوم ہوتے ہو۔ پھر تم نے جرم کا راستہ کیوں اختیار کیا۔۔۔۔۔؟“ اس کے تئور میں نمایاں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔

”میں کل کر ایک بات کہوں۔۔۔۔۔ سنو گے؟“

”کہو۔۔۔۔۔“

”تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔۔۔۔۔“ میں نے نفرت کا اظہار کیا۔ روی شکر کی پیشانی میں لہجہ نمودار ہوئی۔

”کسی بات کو میں نے شاید تمہیں بڑی خوش فہمیوں میں جتا کر دیا ہے۔“ اس کے لہجے میں ترحی آ کر آئی۔ ”میرے پاس تمہارا پرانا ریکارڈ بھی موجود ہے، نہ ہوتا تب بھی میرا ایک اشارہ تمہارے لئے بہت کافی ہے۔۔۔۔۔ تمہارے بھائی کو میری بات؟“

”کیا قبول کرانا چاہتے ہو؟“ اس نے خشک آواز میں دریافت کیا۔

”تم پہلی فلائٹ سے لندن واپس چلے جانا، وہاں بھی بھیج کر بولا۔ ”یہ ستمبری موقع تمہیں دوبارہ نہیں ملے گا، بشرط یہ ہے کہ تم اس ملک میں کال واپس نہیں آؤ گے۔“

”اگر میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں تو۔۔۔۔۔؟“

”وقت ہاتھ سے نکل گیا تو زندگی بھر پچھتاو گے جیل احمد آباد۔“ اس نے جھلا کر کہا۔

”زندگی چاہتے ہو تو میری بات مان لو۔“

”پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں میرے ساتھ اتنی مدد کیوں ہو رہی ہے۔۔۔۔۔؟“

اس بار روی شکر نے جواب نہیں دیا۔ اُس کی نگاہوں میں چنگاریاں چمکنے لگیں، مجھے
تھا کہ اسے گھورتے ہوئے اُس نے جھلا کر اپنا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند کیا، دوسرے ہی
لمحے اسپیکر بلند رائٹ کرتا سامنے آگیا۔

”سر..... اُس کی قلم جوڑ کر روی شکر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا حکم ہے؟“
”اسے انڈر گراؤنڈ کر دو.....“ روی شکر کے لمبے میں سفاکی تھی۔ ”کوشش کرو کہ یہ تین
روز کے اندر میری بات مان لے۔ انکارانی صورت میں تمہیں میری طرف سے مکمل اختیار ہو
گا..... ایک بات اور..... کسی سے خوفزدہ نہ رہو۔“ کوئی کوشش مت کرنا، میں تمہارے
ساتھ ہوں۔“

روی شکر جس دروازے سے آیا تھا، اُسی سے واپس چلا گیا۔ میری آنکھوں پر بھر پٹی
باندھ دی گئی.....!!



KHAN BOOKS

STATIONARY AND LIBRARY
F/8904 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 5556532
PROP: ALI KHAN

KHAN BOOKS

STATIONARY AND LIBRARY
F/8904 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 5556532
PROP: ALI KHAN

وہ رات میرے لئے بڑی اذیت ناک تھی۔ روی شکر کے حکم کے بعد اسپیکر بلبر کو گویا
میری موت کا پروانہ حاصل ہو گیا تھا۔ مجھے یقینی کے کسی دور دراز علاقے میں لے جا کر ایک
زمین دوز تہ خانے میں ڈال دیا گیا جہاں ایذا رسانی کے تمام جدید سامان موجود تھے۔ جس
کمرے میں مجھے رکھا گیا، وہاں صرف شٹیکر میری نگرانی پر موجود تھا۔ کمانڈر پلیمر کے ہاتھ
میں تھی۔ اس عقوبت خانے کے باہر یقیناً سخت پہرہ رہا ہوگا.....!!

میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔ ایک ہاتھ میں پھٹکڑی پہنائی گئی۔ اس کا
دوسرا حصہ دیوار میں لگے مضبوط کنڈے میں ڈال دیا گیا۔ میں پختہ فرش پر پڑا تھا، اپنی جگہ
سے بمشکل ایک دو فٹ تک حرکت کر سکتا تھا۔ کمرے کی چھت سے مدغم پاور کا ایک بلب
لٹک رہا تھا۔ در دیوار پر جابجا خون کے چھینٹے سیاہی اختیار کر کے زبان حال سے اس ظلم و
ستم کی کہانی سناتے نظر آرہے تھے جو مجھ سے پہلے دوسروں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ ماحول
گھٹنا تھا اور وحشت ناک تھا۔ نہ جانے کتنی بد نصیب رُوئیں اب بھی وہاں اپنے اہڑے
ہوئے جسم کی سلامتی میں بھٹک رہی ہوں گی۔ میں ابھی گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک
کر بناک چیخ کی آواز میرے کانوں سے نکلرائی۔ اس کے ساتھ ایک گرج دار آواز ابھری۔
”دس منٹ اور باقی رہ گئے ہیں۔ غور بہ خطا۔ اب بھی زبان کھول دے۔ ورنہ ہم تجھے
بھی بغیر ٹکٹ کے لیے سفر پر روانہ کر دیں گے۔ اس کے بعد تیری جوان لگائی کو اٹھا لائیں
گے۔ کچھ دن اُس کے ساتھ موج مستی کریں گے۔“

”مم..... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ کوئی دردناک آواز میں دم کی درخواست کرنے
لگا۔ ”میں زد و کوب ہوں۔ بھگوان کے لئے.....“

”کھال ادھیڑ دھرمی کی۔“ کوئی تھکسانہ انداز میں چپنا۔ ”چپنا کی زبان سے بھگوان
کا نام لے رہا ہے۔“

کر بناک چیخوں کی آوازیں اور تیز ہو گئیں..... پلیمر سینہ تانے کھڑا میرے چہرے کے

تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اشارہ کیا تو شیکھر نے کمرے کے واحد دروازے کو بند کر دیا۔ غصے کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔

”سناؤ تو؟“ اُس کے ڈرائنگ روم میں ہمارے کارندے اپنے مہمان کا کیسا سواگت کر رہے ہیں؟“ بلیر نے اُس کے کمرے میں زہری نہ رہتا۔

”بڑے صاحب نے صرف میں (دو) مہلت دی ہے تجھے۔“ اُس نے حقارت سے کہا۔ ”کیا ارادے ہیں؟ سیدھی طرح جائے گا تو کن کن پاماش کرانے کا ارادہ ہے؟“

”میں لندن نہیں جاؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کر لیا۔ ”تم اپنے ارمان پورے کر لو۔“ لیکن میری ایک بات کان کھول کر سن لو تو میرے حق میں کانٹے پورے ہوتے۔ تم نے صرف میرا نام سنا ہے، میرے بارے میں تفصیل سے پوچھا ہوتا تو اس وقت میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے۔“

”ابھی تک مرلی کے کھونٹے پر اکڑ رہا ہے۔“ بلیر نے فحش کلامی شروع کر دی۔ ”مروجنی اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اُس کا سارا جوس نکل چکا ہے۔ اب صرف پلوں باقی رہ گیا ہے سالی میں۔ مرلی کب تک اُس کیتا کے بل بوتے پر چلے گا۔ اور تو۔۔۔۔۔ اُس نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ”تو مجھے تڑی لگا رہا ہے، بلیر کو۔۔۔۔۔ اپنے اسلی باپ کو؟“

”بلیر۔۔۔۔۔ میں پوری قوت سے چیخا۔ ”تم اپنی اوقات سے بڑھ رہے ہو۔ میرے ماں باپ کی شان میں گستاخی کرنے سے باز آ جاؤ۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ صرف رات رات کی بات ہے۔ صبح ہونے کے بعد تم۔۔۔۔۔“

”مالک پر بھونک رہا ہے۔۔۔۔۔ کتے۔“ بلیر نے اچانک بھر پور ٹھوکر میرے منہ پر ماری، میرے دانت بل گئے۔ ہونٹ پھٹ گیا۔ خون کے قطرے میرے لباس کو رنگین کرنے لگے۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔

شیکھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ برابر والے کمرے سے تعداد کی آوازیں پھر سنائی دیں۔ لگیں۔ بلیر نے دوسری ٹھوکر ماری۔ میں نے سچے کی کوشش کی لیکن بلبل کر رہ گیا۔

”صبح کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟ بول۔“ بلیر نے تیسری ٹھوکر میرے سینے پر مارنے کی کوشش کی۔ میں جھک گیا، اُس کے جوتے کی نو میرے سیدھے بازو سے ٹکرائی، درد کی لہر پورے

جسم میں دوڑ گئی۔ وہ بدستور گر جتا رہا۔ ”کیا ہوگا صبح؟“ اب چپ کیوں ہو گیا۔۔۔۔۔“

”تم۔۔۔۔۔“ میرے اندر جنون نے سر اُبھارتا شروع کر دیا۔ یہی جنون مجھے مرلی اور مروجنی کے اپارٹمنٹ سے باہر کھینچ لایا تھا۔ میں شاید پاگل ہو گیا تھا جو میں نے کسی کا مٹورہ قبول نہیں کیا، ایک محفوظ پناہ گاہ سے باہر آ گیا اور انجام کار کسی زیر زمین عقوبت خانے میں انجیروں میں بندھا بلیر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ لیکن میرے خون کا رنگ، اس کی سرخی اور گرمی ابھی باقی تھی۔ میں نے بلیر کو گھورتے ہوئے سرد لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تم میرے جسم پر نہیں، اپنی چٹائی بھر کئی آگ کو ٹھوکریں مار رہے ہو۔ تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ رات رات تم اپنے دل کی بھڑاس نکال لو، صبح میری باری ہوگی۔“

”پاگل بننے کی اداکاری کر رہا ہے۔“ اُس نے غضبناک ہو کر اپنی ہیٹ کھول لی اور بے حاشہ میری چمڑی اوجھڑنے لگا۔ میں نے پچھلا ہونٹ پوری شدت سے دانتوں تلے پھینچ لیا۔ دو متنازع میرے جسم پر ضربیں لگا رہا تھا، میرے اندر کا آتش فشاں کھول رہا۔ میں نے طعن سے کوئی آواز نہیں نکالی، جسم کو گھڑی بنا کر لوٹنے لگا۔

”شیکھر واپس آیا تو سینہ کی لائچی اُس کے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے میری کوئی اداکاری ہو گئی۔ میں ساری تکلیف بھول کر اُس متبرک لائچی کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔“

”تم ایک طرف آ جاؤ صاحب۔۔۔۔۔“ شیکھر نے آستین پڑھائی۔ ”میں دیکھتا ہوں کہ یہ سارا کتنے پانی میں ہے۔“

”جب تک یہ۔۔۔۔۔“ تھوکر مارنے چائے زمین پر ناگ رگڑ کر ڈی آئی جی صاحب کی بات ماننے کا اقرار نہ کرے اس پر لائچی برساتے ہوئے تھک جاتا تو اوپر سے کسی اور کو بلایا۔ میں کچھ دیر آرام کر کے واپس آتا ہوں۔“

بلیر حکم دے کر غصے میں تھماتا چلا گیا۔ شیکھر نے دروازہ بند کر لیا۔ اُس کے تیور بلیر سے زیادہ خطرناک نظر آرہے تھے۔

”کیا فیصلہ کیا نواب صاحب؟“ شیکھر نے لائچی فضا میں اڑاتے ہوئے زہر خند سے دریافت کیا۔ ”ہماری درخواست منظور کرو گے یا تمہارا یہ سیوک تمہاری ہیجیم اداکاری شروع کر دے۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اُس نے کسمسا کر کہا۔ ”بڑے صاحب نے تمہیں تین دن کی ہجرت دی ہے۔“

”نہیں ہے۔“ میں نے شکم سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”بلیئر آئے تو اُس سے کہہ دینا کہ میں نے لندن جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا ہے۔“

”تم۔ تم۔ تم۔ تم۔ تم۔ تم۔“ شکم کے چہرے پر زندگی کے آثار دوبارہ نمایاں ہونے لگے۔

”سچ اور جھوٹ کے چکر میں مت پڑو۔“ مجھے نے زور دے کر لہجے میں جواب دیا۔ ”زندگی بچانے کی فکر کرو۔“

اُس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، پھر اپنا کراؤ وہاں کر دیا اور بیٹھ کر مجھے دیکھتا رہا۔ دو گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی تو شکم بڑی پھرلی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے لپک کر دروازہ کھولا، آنے والا اسپیکٹر بلیئر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اُس نے مادہ لباس پہن رکھا تھا، کچھ دیر خاموش کھڑا مجھے نفرت بھری نظروں سے گھورتا رہا، پھر شکم کے دروازے پر کھڑا ہوا۔

”کیا رہا؟“

”شکم نے جیون میں کبھی بار مانی نہیں سیکھی صاحب۔“ اُس نے میری طرف مسکین نظروں سے دیکھتے ہوئے بلیئر کو بڑے دہنگ لہجے میں جواب دیا۔ ”لاٹھی سے صرف اس کی کمر اور کولے سہلائے تھے کہ جیس بول گیا۔ لندن تو کیا اب یہ آپ کے حکم سے رک میں بھی چھلانگ لگانے سے انکار نہیں کرے گا۔“

”کیوں مہاشے۔“ بلیئر نے فاحشانہ نظروں سے مجھے گھورا۔ ”نکل گئی تاساری بیکڑی۔ پہلے تو مجھے صبح ہونے کی تڑی دے رہا تھا۔ بڑے اونچے سروں میں بول رہا تھا۔ اتنی جلدی تانی مر گئی۔“

میں نے خاموشی اختیار رکھی۔ مجھے صبح ہونے کے بعد انکارانی کی واپسی کا انتظار تھا۔

”چپ کیوں ہے؟ کیا سروجنی کی یاد ستا رہی ہے؟“ اُس نے حقارت سے کہا۔

”لندن جانے گا تو اس ویشیا کو بھول جائے گا۔ وہاں تیری بہت ساری بہنیں تیرا سواگت کرنے کو۔“

”بلیئر۔“ میں اس بار ضبط نہ کر سکا، چیخ اٹھا۔ ”اپنی گندی زبان بند کر لے۔ ذور بولا

ہری نظروں سے۔“

”ارے۔۔۔۔۔“ بلیئر نے بڑے سفاک لہجے میں اپنے غصے کا اظہار کیا۔ ”شکم، بن رہا ہے تو۔۔۔۔۔ یہ حرام کا جناح بھربولنے لگا۔ اس کے بعد اسپیکٹر دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے بلیئر سے اوپر گھونسوں اور جوتوں کی ٹھکروں کی بارش شروع کر دی۔ میرے سینے پر چڑھ کر دیشیوں کی طرح اچھٹلنے لگے۔ میں نے حلق سے کوئی آواز نہیں نکالی لیکن میرا جواز جواز چیخ رہا تھا۔ بلیئر کی زبان سے میرے بزرگوں کی شان میں بڑے نازیبا جملے ادا ہو رہے تھے۔ میں خون کے ٹھونٹ پی کر برداشت کرتا رہا۔ پھر اچانک جوتے کی ایک شدید ضرب میری پٹیلی پر ایسی لگی کہ میری نگاہوں کے سامنے کئی سورج طلوع ہو کر غروب ہوتے چلے گئے۔ میرا ذہن گھپ اندھروں میں ڈوب گیا۔۔۔۔۔!

صبح میری آنکھ کھلی تو سارا جسم پھوڑے کی مانند ڈھک رہا تھا۔ میں نے ذرا کٹ لینی پائی تو کراہ اٹھا۔ اسی لمحے ایک مانوس آواز میرے کانوں میں گونجی۔۔۔۔۔

”جیل، تمہاری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی۔ تم اگر ہر قیمت پر سروجنی کے ہسٹنٹ سے ٹکنا چاہتے تھے تو کم از کم مجھ کو تو آگاہ کر دیا ہوتا۔“

”چیچی انکارانی میرے سر پر موجود تھی۔ اُس کا چہرہ غصے کی شدت سے تھما رہا تھا۔ اُس کے شعلے نکل رہے تھے۔ مجھے جس کا انتظار تھا، وہ آگنی تھی۔ اُس کے لہجے میں ہنس تھا۔ میں نے نظریں گھما کر دیکھا، کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ بلیئر اور شکم شاید مجھے مردہ سمجھ کر چلے گئے تھے۔“

”تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو۔“ میں نے عالم تصور میں اُسے مخاطب کیا۔

”یہ وقت شکوہ شکایت کا نہیں ہے۔“ اُس نے ہونٹ کانٹتے ہوئے جواب دیا۔ ”بلیئر نے تمہارے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے، اس کا بدلہ ضرور ملے گی۔“ مگر تم بھی تو میرا کہا نہیں مانتے۔ من مانی کرنے لگتے ہو۔“

”جو بچو چکا ہے بھول جاؤ۔“ میں نے بحث ختم کرنے کی خاطر کہا۔ ”قسمت میں جو کچھ ہے اسے نالا نہیں جاسکتا۔“

”تم اتنی جلدی مایوسی کی بات کیوں شروع کر دیتے ہو؟ کیا اب جیل میں اپنی لپٹا بھی اچھٹل رہا؟“

اڑ گئی۔ اس کے بعد جو ہوا وہ خود بلیر کے لئے بھی تعجب خیز تھا۔ سنے آنے والے سادہ لباس والوں میں سے ایک نے ریو اور نکال کر بلیر پر تان لیا، سفاک لہجے میں بولا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں کرنا انسپکٹر، پہلے میری ایک بات سن لو۔“

”تم.....“ بلیر نے پلٹ کر اُسے غور سے دیکھا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہاری زندگی کے دن بھی اب پورے ہو چکے ہیں.....“

”شیخمر اور دوسرے سادہ لباس والے کی نظریں بھی ریو اور والے کی جانب اٹھ گئیں۔ میں جانتا تھا، انکا ایک وقت میں صرف ایک ذہن کو کنٹرول کر سکتی تھی۔ وہ اس وقت ریو اور والے کے سر پر تھی جس کی نگاہوں میں شعلے لپک رہے تھے۔“

”تمہارے پاس اب زیادہ سوچنے اور سمجھنے کا سہ باقی نہیں رہا انسپکٹر۔“ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”تم نے شاید مجھے ابھی تک پہچانا نہیں۔ میرا نام اجیت جتندر ہے۔ بات آٹھ سال پرانی ہے۔ تمہیں شاید یاد بھی نہ رہی ہو، میں بتاتا ہوں۔ تم میری تلاش میں میرے گاؤں گئے تھے، تمہارے پاس میری گرفتاری کا وارنٹ تھا، تمہارے کالے ہاتھوں کا مجرم میں تھا۔ میری جوان بہن رادھیکا نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا لیکن تم اُسے زبردستی لٹا دیے۔ دو سال تک تم اور تمہارے ساتھی اُس مجبور کی عزت سے کھیلتے رہے۔ ہر ایک رات وہ تمہاری اس قتل میں قتل کر دی گئی۔ تمہارا شک اپنے ساتھی نوڈو پر تھا، لیکن ایسا نہیں تھا۔“ ریو اور والے نے انھیں بھیج کر بڑے کرب سے کہا۔ ”اُس غریب کو میری گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ میں اُسے مارا۔ تم لوگ اُسے اپنی ہوں کا نشانہ بناتے رہتے۔ اس کے بعد میں تمہارا اعتماد جیتنے کی خاطر جیسے بدلہ راحت کے روپ میں تمہارے قریب ہونا گیا۔ مجھے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔ میں رادھیکا کا انتقام تمہاری بہن سے لینا چاہتا تھا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری کوئی بہن نہیں۔ تم نے شادی کسی شخص کی دوتہ کچھ آنسو تمہاری دھرم پٹی کے شریر سے پونچھ لیتا..... آج مجھے وہ موقع مل گیا جس کی تلاش تھی۔ تم سمجھ گئے میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟“

”بلیر موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ.....“ انسپکٹر آپے سے باہر ہوئے لگا۔ ”میں مجھے مارنے کے بعد خود بھی زندہ نہیں رہے گا۔ میرے آدمی تیرے جسم کو ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں گے۔ جیون بیا رہا ہے تو ریو اور پھینک کر میرے پیر پکڑ لے۔ میں تجھے آخری موقع دے رہا

”زمنوں کو مت گرید و انکارانی.....“ میں نے سر آدھ بھری۔ ”تم میری مجبور یوں سے لاتعلقی ہو اس سے زیادہ بد نصیبی اور کیا ہوگی کہ میں اتنے دنوں سے بمبئی میں ہوں اور ابھی تک اپنی تفریق کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا۔ چہرہ گرد آلود ہو، دل میں طوفان اٹھ رہے ہوں، زخم بر سر زخم، خون تھنلیں سجاتا اچھا نہیں لگتا۔ اور..... کل وہ بھی آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ زوئی کو ایک بار دھکی لگا جائے، سب گر ہیں کل جائیں گی۔ اُس نے لقب لگانے کی بات بھی کی تھی۔ میں اُسی کے اشارے پر وہاں سے چلا آیا۔ میں سید کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کھٹی کھٹی آواز میں انکا کو بیوقوفی سے قتل تک کی تفصیل سناتے ہوئے کہا۔ ”ان کا فیصلہ ہے کہ میں تین روز کے اندر اندر انکا جان بچا جاؤں۔ انکار کی صورت میں زوئی شکر ہندوستان میں میرا وجود گوارا نہیں کرے گا۔ اُس نے انسپکٹر بلیر کو ختم دے رکھا ہے کہ مجھے مار کر میری لاش کو خاموشی سے ٹھکانے لگا دیا جائے۔“

”تم اپنے ذہن پر کوئی بوجھ مت ڈالو۔“ انکا نے میرے بالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اب آگئی ہوں۔ سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دو۔“

میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا، بلیر اور شیخمر کے علاوہ سادہ لباس والے اور بھی نظر آئے۔ دونوں چہرے بشرے سے بے حد خطرناک نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر بلیر کے ہاتھوں میں ہنرمو وجود تھا، میری آنکھیں کھلی دیکھ کر بڑی نفرت سے بولا۔

”مزاحی..... تو ابھی تک مر نہیں؟“

”اے اب شاکر دو صاحب.....“ شیخمر وہی زبان میں بولا۔ ”میں اسے سمجھاتا ہوں۔ یہ لندن جانے پر تیار ہو جائے گا۔“

”نہیں.....“ بلیر دھڑکنے لگا۔ ”اب یہ نہیں، اس کی ارجی لندن جائے گی۔“

”تم خاموش کیوں ہو جیسی.....؟“ انکا تسلا نے لگی۔ ”اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ اسے سزا ضرور ملے گی۔ اس کے پرلوک سدھارنے سے بیشتر اپنے دل کی حسرت پوری کر لو.....“

”انسپکٹر.....“ انکا کے اکسانے پر میں نے بلیر کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”بہت ہو چکا اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ ورنہ تمہارا انجام خطرناک ہوگا۔“

بلیر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اُس نے ہنر کھول کر ہوا میں لہرایا، انکا میرے سر سے

”ہوں۔“
مہاجر صاحب کو ریوا اور نے ایک شعلہ اگلا اور بلیر کی اٹنی ران سے خون بھل بھل بہنے لگا۔
شکیر نے وہ دھڑکے کی طرف بھاگنے کی حماقت کی، وہ بھی مارا گیا۔ دوسرا سادہ لباس والا
خاموش کھڑا رہا۔ (کلیں ہاں پکڑ کر لڑکھاتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔

”گھبراؤ مت انسپکٹر! میں آسان موت نہیں ماروں گا۔“ جتندر نے زہر خنہ سے
کہا۔ پھر دوسرا فائر کیا، بلیر کی ہاتھ کے گھٹنے کی ہڈی چخ کر کرچیوں میں تقسیم ہو
گئی۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے برے کی مانند زمین پر پچھاڑیں کھانے لگا۔ اُس کی چپٹیں
آسان سے باتیں کر رہی تھیں۔

”اب یہاں سے نکل چلو، ورنہ تمہارے ساتھ میں ملے جاؤں گا۔“ دوسرے سادہ
لباس والے نے جتندر سے کہا۔

”گھبراؤ مت، ہم ساتھ ساتھ ہی چلیں گے۔ پہلے تم، بعد میں، میں۔“ جتندر نے جیل
کے اختتام کے ساتھ ہی تیسرا فائر کیا، اُس کا ساتھی بھی آواز نکالے بغیر زمین پر گر گیا۔
کے بعد بھی اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی نظر آ رہی تھیں۔ چوتھی گولی نے وہ
کی زندگی کے چراغ کو گل کر دیا۔ کمرے میں تین لاشیں پڑی تھیں۔ انسپکٹر ڈوبتی ہوئی
آواز میں اپنے آدمیوں کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ بازی پل بھر میں پلٹ گئی۔ انکا دوبارہ
میرے سر پر آگئی۔

”تم نے میری خاطر تین آدمیوں کو لڑھکا دیا۔“ میں نے انکارانی کو پیار بھری نظروں
سے دیکھا۔

”تھیل تو اب شروع ہو گا جیل صاحب۔“ اُس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”تمہیں اندازہ ہو
جائے گا کہ پریتیم لال مہاراج کے سر پر رہ کر میرا سے برباد نہیں ہوا، اُس مہمان منش نے
تمہارے کارن مجھے بھی کچھ ہلکتیاں دان کی تھیں۔ یہ بھی کہا تھا کہ جب تک گھناؤں پ اندھیرا
نہ پھیل جائے میں ان ہلکتیوں کا استعمال نہ کروں۔ بلیر، رومی شکر کا خاص آدمی ہے۔“
بلیر کے زخمی ہونے اور تین آدمیوں کے قتل کی خبر سن کر پاگل ہو جائے گا۔ بات پھیلے گی تو
طوفان اٹھ کھڑے ہوں گے۔ پنڈت پجاریوں کے دلوں میں سلگنے والی چنگاریاں پھر
بھڑکیں گی۔ ہر طرف آگ لگ جائے گی۔“

میں بات کو طول نہیں دوں گا۔ تفصیل لکھنے بیٹھ گیا تو زندگی کی ساری نقدی خرچ ہو
جائے گی، کہانی اوجھری رہ جائے گی۔ بہر حال انکا نے جو کہا وہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ عقوبت
خانے کے محافظ مشورہ کرنے کی خاطر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ بلیر کو زخمی حالت میں ہسپتال منتقل
کر دیا گیا۔ پھر مجھے اسی حوالات میں ڈال دیا گیا جہاں پہلے بند کیا گیا تھا۔ انسپکٹر بلیر کی
جگہ نیا انسپکٹر آ گیا۔ میری گرفتاری کے کیس کو باقاعدگی کی شکل دینے کی خاطر عدالت میں
پیش کر کے دس روز کا ریمانڈ حاصل کیا گیا تو بات ڈھکی چھپی نہ رہ سکی۔ میرے دشمنوں کو
بھٹک مل گئی۔ سینکڑوں پنڈت پجاریوں نے اُس حوالات کو گھیر لیا جہاں مجھے سرکاری مہمان
بنایا گیا تھا۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا، مجھے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ قانون میں ایسی کوئی
شرٹ موجود نہیں تھی کہ کسی مجرم کو عوام کے سیلاب میں ڈھکیل دیا جائے۔ رومی شکر کے اختیار
میں ہوتا تو وہ اس بات پر عمل کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ لیکن مرلی اُس کے راستے کی دیوار
بن کر درمیان میں حائل ہو گیا۔ بڑے بڑے سرکاری افسران اور راج منتری سر جوڑ کے
بیٹھے، مندروں سے جوان پجاریں بھی چونیوں کی طرح نکل نکل کر دھرتا دیئے والوں کے
ساتھ شامل ہونے لگیں تو تماشا بینوں کا جہوم بھی بڑھنے لگا۔ حکومت کو مجبوراً فوج طلب کرنی
پڑی۔ پنڈت پجاریوں پر لڑھی چارج ہوا، آٹو گیس کے گولے داغے گئے، تب کہیں جا کر
حالت پختہ ہوئی آئے۔ تھانے کے علاقے میں باقاعدہ کر فیو لگا دیا گیا، کئی کو بھی بغیر
تحریری حکم کے تھانے میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

انکارانی کی سزا سننے سے بھی بڑھ گئیں۔ وہ دن بھر میری خاطر جوڑ توڑ میں لگی رہتی۔
رات کو تھکی ماندی واپس آئی تو مجھے دن بھر کی رُوداد سنانے بیٹھ جاتی۔ میں تھانے میں بڑے
سکون سے تھا۔ نئے انسپکٹر یا اُس کے جگہ کے افراد نے میرے ساتھ کوئی بدسلوکی کرنے کی
کوشش نہیں دہرائی۔ ابھی تک وہ عقوبت خانے میں ہونے والے تین قتل کی اصل وجہ بھی
دریافت نہیں کر سکے تھے۔ جو بیان انسپکٹر بلیر نے دیا اس میں کئی جھول تھے۔ انسپکٹر نے
جتندر کی کہانی توڑ مروڑ کر صرف یہ کہا کہ اُس کا ذہن میں اس کا ایک ہی پلٹ گیا۔ اُس نے
لہان سے کوئی جملہ ادا کئے بغیر ہی ریوا اور نکال کر فائرنگ کر دی، بعد میں خود کو بھی
گولی مار لی۔ ممکن ہے رومی شکر کے سامنے اکیلے میں اُس نے حقیقت اچھائی ہو۔ لیکن
ایکا رڈ پر جو بیان موجود تھا وہ نا کافی سمجھا گیا۔ رومی شکر بڑے مضبوط صاحب کا مالک

”جیل.....“ انکا میرے تاثرات بھانپ کر کسمسانے لگی۔ ”میں آئندہ اپنی زبان بند نہیں کرے گی۔ پھر مجھ سے کوئی شکوہ یا گلہ نہ کرنا۔“

”تم صرف ایک قوت ہو، علامت ہو، کردار ہو..... تم پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہو۔ اپنے کسی آنگام کے فشار پر اس کے دشمن کو جس نہیں کر سکتی ہو، خود کسی کا خون نہیں کر سکتیں۔ تمہیں جانوروں یا جانداروں پر بند میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارے اعضاء انسانوں سے ضرور ملتے جلتے ہیں لیکن انسانی احساسات اور جذبات کی قدرو قیمت سے ناواقف ہو..... واقف ہوتیں تو مجھے اسی دن مر جائے یا ہوتا جب میں اپنی کلدیپ کی لاش ہاتھوں میں اٹھائے میسور کی کسی بلند پہاڑی کے پہاڑوں پر چکا تھا۔ وہ موت کلدیپ سے میرے عشق کی معراج ہوتی۔ لیکن تم نے اسے اذہن معطل کر دیا۔ میں اپنی حسرتیں پوری نہ کر سکا۔ کلدیپ کی روح آج بھی میرے اندر جھٹک رہی ہے۔ پریم لال نے تمہیں ہی شکستیاں دان کر دیں، تمہارا قد پہلے سے زیادہ بلند ہو گیا لیکن میں بڑے خسارے میں رہا۔ اب تم زبان بند رکھنے کی بات کر رہی ہو، مجھے منظور ہے لیکن تمہاری میں رہ کر بھی تا مساعد حالات کا.....“

”بس کرو جیل..... خاموش ہو جاؤ۔“ انکارانی تڑپ اٹھی۔ ”اپنی انکارانی کو غلط مت سمجھو۔ میں نے تم سے رومی شکر کی خباثتوں کی بات کی تھی، تمہیں حالات سے باخبر کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں نے ہار تسلیم کر لی ہے، تم نے میرے بارے میں جو کچھ کہا میں اس پر بحث نہیں کروں گی لیکن ایک بات کا یقین کر لو..... اگر میں مجسم عورت کا رُوب اختیار کر سکتی تو تم صرف میرے ہوتے..... کوئی دوسری عورت تمہاری سمت نظر بھی نہ اٹھا سکتی۔ ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھ سے احساسات اور جذبات کی باتیں مت کرو۔ مجھے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی خاطر انسانی خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ خون پینے والے ان نازک باتوں کو نہیں سمجھ سکتے جو تم مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تمہارے سر سے ڈورہ کر میں مضطرب رہتی ہوں۔ مجھے کہیں سکون و آرام نہیں ملتا۔ تمہارے بغیر میں بڑی بے چین رہتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ آج بھی ہندوستان کے کونے کونے میں بڑے بڑے گنیانی دھیانی پنڈت اور پجاری میرے حصول کے لئے زندگی واپس لگانے کو فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن میں نے خود تمہارے سر کا انتخاب کیا تھا۔ تم مجھے ایسے لگتے تھے

کیوں؟ میں اس جذبے کوئی خوبصورت ہم دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ میں پریم لال مہاراج کی شکر گزار ہوں، اس مہمان پنڈت نے مجھے وہاں دلایا ہے کہ جب تک اس کی آتما مجھ سے منہ نہ موڑے کوئی دوسرا مجھے حاصل نہیں کر سکے گا۔“ انکا جذباتی انداز میں بڑی رہی..... ”تم مجھے آج بھی کمزور مت سمجھو..... میں حوراء کی پابند نہیں ہوں، رومی شکر جیسے ہزاروں کینینل کر بھی انھوں منصوبے بنائیں لیکن میری زندگی میں وہ اپنے سنے بھی رہے نہیں کر سکتے۔ میں جانتی ہوں کل کیا ہونے والا ہے۔ کچھ بندشوں کے سبب زبان کھولنے سے قاصر ہوں، مگر اتنا جان لو..... میری زندگی میں تمہارا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“

”جی انہوں نے مجھے زنجیروں میں بکڑ رکھا ہے۔“ مہری زبان سے روائی میں نکل گیا۔ انکا کچھ جھٹمانے لگا۔

”تم ان مصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتے جو میں سمجھ رہی ہوں۔ میں نے ان زنجیروں کو توڑ دیا تو وہ مجھوں کی طرح تم سے لپٹ جائیں گے، تمہیں مجھوں ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ میں یہ وقت میں کس کس کو قابو کروں گی؟ کچھ دن اور صبر کرو، ال کے بعد گن گن کر دل کے دروازے کھولنے سے کر لینا۔“

میں خاموش رہا۔ مرلی نے فغانے میں قدم رکھا تو سپاہی بھی تھکا ہو گئے۔ مرلی نے کسی سے بات نہیں کی۔ کیلوٹ کے جواب میں سر کو جنبش دینا سیدھا میری طرف چلا آیا۔ اس کے اشارے پر لاکھ لاکھ کھول دیا گیا۔ بلیر کی جگہ جن انسپکٹر کو سونپی گئی تھی وہ بھی اذکرا مجھے کینہ تو نظروں سے گزرنا تھا۔ حوالات کا رورواڑ دیکھتے ہی دو مسلح سپاہیوں نے انھوں کا رخ میری طرف کر کے پورے میں سنہال لیں۔ میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے اپنی بوائی کا احساس گدگد نہ لگا۔ اسی سے پابند زنجیر ہوتے کے باوجود مجھے خائف تھے۔ انکا مرلی کو دیکھ کر کچھ دیر سستا لے کر اپنی پانی مار کر بیٹھ گئی۔

”مہاراج.....“ مرلی نے قریب آ کر بڑی عدم آواز میں لالہ حوالات روز بروز بکڑتے جا رہے ہیں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں موجود تمام افرونی نظریں میرے سر پر مرکوز تھیں۔ میں انہیں یہی تاثر دینا چاہیے مجھے پولیس کی کارروائی کا کوئی خوف اتنی نہیں

”تو بھی اوقات سے بڑھنے لگا۔“ میں نے انہیں نظر سے گھورا۔ ”میری آنکھیں واپس کر دے۔ ورنہ دردی اتارنے کو تیار ہو جا۔“

”مہاراج، زنجیروں کے کارن تمہارے ہاتھ پیر میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔ میں انہیں
اٹھانے دیتا ہوں۔“ مرلی کے جانے کے بعد انپکٹر نے انکساری سے کہا۔ پھر وہ آگے
بڑھا، میں نے ہاتھ اٹھا کر دھتکار دیا۔

”میرا مرلی نظر میں تو اب مضمحل کر رہا ہے۔“ میں نے حقارت سے کہا۔ ”وردی یہاں
لے، جنگل کو تالا لگا کر چوکی کی کرسی سنبھال لے۔“

وہ وردی یہاں کر لاک اپ کو تالا لگا کر چلا گیا۔ میں نے سید کی لالچی اٹھا کر سینے سے لگا
لی۔ انکا دوبارہ میرے سر پر آگئی۔ اس کے چہرے سے بشارت ٹپک رہی تھی، مگر اگر
بولی۔

”اسی طرح دُور اندیشی سے کام لینے کی عادت والوں کے پاس بھی روی شکر کے ایک دو
اعتماد کے آدمی ضرور ہوں گے۔ انپکٹر کی کہانی سن کر اُسے بھی سوچنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کل
ہی اُس کی طرف سے تمہارا بلاوا آ جائے، وہ سو دے بازی کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ سچ ممکن
ہے کہ اس پنڈت کی قوت بھی آزما کر دیکھ لے جو اجدو دھیا سے ایک دور دور میں پہلے پہلے
والا ہے۔“

”تم نے اشوک کی بیوہ کے لئے کیا، کیا.....؟“ میں نے اُس کی بات نظر انداز کر کے
پوچھا۔

میں نے اُس کے لئے رہائش اور پیسوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ اب اُسے کسی کے
آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا پڑے گا۔“

”ترنین اور سید غوث کی کیا خبر ہے.....؟“ میں نے سر د آہ بھر کر سوال کیا۔
”دونوں خوش ہیں..... کہو تو اُن کو تمہاری خبر کر دوں؟“

”نہیں انکارانی.....“ میں تڑپ کر بولا۔ ”ذرا حالات سازگار ہو لینے دو، میں خود ہی
وہاں جا کر اپنی ترنین کو گلے لگاؤں گا۔“

”تم آرام کرو جیل، میں ذرا روی شکر اور ایک دو دوسرے افسروں کے دل کا سید لے
کر واپس آتی ہوں۔“

انکا سر سے اُتر گئی۔ میں کچھ دیر سید کی لالچی سینے سے لگائے بیٹھا رہا، پھر اسی کو تنکے بنا کر
لیٹ گیا۔ کمرے میں انپکٹر کے علاوہ عملے کے دوسرے تمام افراد بھی سب سے نظر آ رہے

تھے۔ انکا کے ایک ہی کمرے نے اُن کے کس بل ٹال دیے..... سب ہی کو جیسے سانپ
سجھ گیا تھا.....!!

دوسرے دن مرلی نہیں آیا۔ تھانے کاٹلہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی محتاط رہا۔ بلیر کی جگہ
تعبیات ہونے والے انپکٹر کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سچائی گئی۔ انکا مجھے مزے لے لے
کر سناتی رہی کہ نئے انپکٹر کی وردی اُڑوانے والے قصے نے روی شکر کو بھی بہت کچھ
سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مرلی نے خاص طور پر ڈی آئی جی سے مل کر ان حالات کا چشم دید
تھہرنا تھا۔

”ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ روی شکر نے خاص طور پر اجدو دھیا والے پنڈت کو آج
شام تک ہمیں پہنچنے کی درخواست کی ہے۔“ انکا نے مجھے کھانے کی کوشش کی۔ ”جیل،
میری درخواست ہے کہ تم اس پنڈت کے سامنے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا۔ وہ کئی شاستروں کا
ماہر اور ہندو دھرم کا مانا ہوا عالم ہے۔ پہلے اس نے پنڈت لال کشر کے شیطانی ٹولے میں
شمولیت سے انکار کر دیا تھا لیکن ڈرگا کی آواز کے بعد شاید وہ بھی تمہارے خلاف محاذ آرا ہو
جائے۔ گرو پتاپ بھی اس پنڈت کی عزت کرتا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کوئی قدم اٹھانا ہو گا۔“

”جیسا کہ تم نے انکارانی۔“ میں نے پہلو بدل کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
پھر سید جھنڈ بلی لالچی دیکھ کر بولا۔ ”جب تک یہ میرے پاں ہے دشمن میرے خلاف کوئی
بڑی کامیابی نہیں حاصل کر سکیں گے۔ مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا تو شاید میں مرلی کے
پارٹنٹ سے باہر نہ آتا۔ اب میں نے خود کو آگ اور خون کے حوالے کر دیا ہے۔ میں
بدترین حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارتا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ سید جھنڈ بلی میرے
اضطراب سے بے خبر نہیں ہو گا۔ وہ بھی دیکھ رہا ہو گا کہ ہندوستان کی وسیع و عریض زمین پر
میرے لئے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہ گیا۔ ہر طرف آگ کے آلاؤ بھڑک رہے ہیں،
دشمنوں کے بس میں ہوتا تو میں کب کا جل کر راکھ ہو چکا ہوتا۔ مجھے اذیت ناک سزا
دینے کے خواہشمند ہیں۔ بڑے نادان لوگ ہیں، یہ بھی نہیں جانتے کہ انسان کے لئے
سب سے بڑی سزا موت ہے۔ جو موت کو ہر دم گلے لگائے وہ تیار ہو وہ پنڈت جبار یوں
سے کیا ڈرے گا؟ سید کی نظر عنایت کے علاوہ تم بھی تو میرے ہاتھ ہو۔“
”مجھے تمہارے ارادے کچھ زیادہ اچھے نظر نہیں آتے۔“ انکا نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”ابھی تم سمجھداری کی بات کر رہے ہو، وہ سامنے ہوتے ہیں تو ایک دم بھڑک اٹھتے ہو، یہی نہیں سنتے۔“

انکا سے میری چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ اُس روز کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں رات کا کھانا کھا کر بے بعد جلدی سوئے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ تھانے کا عملہ مجھ سے دُور دُور رہی رہا۔ اب انہیں نے پھر سے اوپر رائل تانے یا حقارت کی نظروں سے گھورنے کی حماقتیں ترک کر دی ہیں۔ پہلی بنے ادھر ادھر بیٹھے رہتے۔ وہ میری وحشت اور طاقت کا تماشا دیکھنے کے بعد خائف ہو گئے تھے۔ کسی عجیب اور مضحکہ خیز بات تھی۔ قانون کے مسلح محافظ ایک قیدی سے نظریں چرائے تھے۔ وہ زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا۔ رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں لگا کہ میں کسی نے مجھے ہاتھ پکڑ کر سوتے سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے پتھڑ کر دیکھا تو گردن پر تاپ میرے برابر پختہ فرش پر آتی پائی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکا موجود تھا۔

”وہ راجبھاری چلی گئی۔“ گردن لہراتے ہوئے کہا۔ ”میرے بڑے بھائی جلدی آج اُس سندری کے درشن ہو گئے۔ بڑی آشتی اُسے دیکھنے کی۔“

میں نے گھوم کر دیکھا، ٹائٹ ڈیوٹی کا عملہ جاگ رہا تھا۔ حوالات کے بیرونی دروازے پر وزنی تالا بھی موجود تھا۔ گردن کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی.....؟

”کوئی چتا مت کر۔“ گردن بے پروائی سے بولا۔ ”میں نے اُن کی نگاہوں کے سامنے پردے ڈال دیے ہیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ دو گھنٹی بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔ میرا کہا سنا معاف کر دینا۔“

”کیا مطلب.....“ میں چونکا۔ ”تم کہا سنا معاف کرنے کی بات کیوں کر رہے ہو؟“

”تیری سندری نے تجھے بتایا تو تھا کہ میں بھی ڈرگا کے سراپ سے نہیں بچ سکوں گا۔“

وہ زہر خند سے بولا۔ ”میرا سے پورا ہو چکا بالک، دیوی کا بلاوا آ گیا ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔ پرتو تو بیا کل نہ ہو..... آخر میں وجے تیری ہی ہوگی۔“

”درمیان میں کیا ہوگا.....؟“ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

”وہ تجھے گھیرنے کے کارن اچھل کود سے باز نہیں آئیں گے۔“ گردن بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ روی شکر نے پنڈت پر بھو دیال کو تجھے قابو کرنے کے لئے

بایا ہے۔ وہ برا مہمان پنڈت ہے۔ کالی کا بڑا چیتا بھی ہے لیکن.....“ گردن پر تاپ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اُس کی زبان پکڑ لی ہو۔

”تم خاموش کیوں ہو گئے گردن؟ پنڈت پر بھو دیال کے بارے میں کیا بتانا چاہتے تھے.....؟“

”میرے پاس سے کم ہے بالک، کیوں اتنا سمجھ لے کہ دنیا دکھاوے کے لئے زمین پر متھامارنے والے کچھ پراپت نہیں کر پاتے۔“ من اُجلا ہو، جیون دان کرنے والے پروشاش ہو تو شریر پر نظر آنے والی گند سے بڑے بڑے بلوان بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں گردن؟ تم کس کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”اُس مہاراش کی جس کی شکتی اپرم پار ہے۔“ گردن جھومتے ہوئے کہا۔ پھر کسماسکر بولا۔ ”میں اب چلوں گا۔ تجھے آخری بار دیکھنے کو من چاہا تو چلا آیا۔ ورنہ میں دُور رہ کر بھی تجھ سے غافل نہیں تھا۔“

”گردن.....“ میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔ ”کیا میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں؟“

”اپنا دھیان رکھنا.....“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اُس سندری کی بات غور سے سنا کر جو کچھ سر پر ڈیر اڈال چکی ہے۔ بڑی نٹ کھٹ، بڑی پنچل ہے۔“

”کیا بات پوچھوں گردن؟“ میرے دل میں امریتا کا خیال اُبھرا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ گردن اور امریتا کا رشتہ تھا؟ وہ کون تھی؟ لندن سے واپسی پر اچانک اپنی سیٹ چھوڑ کر میرے پاس کیوں آئی؟ کیا جا رہی تھی؟

”امریتا کے بارے میں جانتا چاہتا ہے؟“ گردن نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اُس نے تجھ سے غلط نہیں کہا تھا کہ آزمائی ہوئی تیرا دل دھمکنا نہیں آ رہا تھا۔“

”لیکن.....“ میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے پورے یقین سے جواب دیا۔

”میں تیری نہیں..... امریتا کی بات کر رہا ہوں۔“ گردن کا لہجہ معنی خیز تھا۔ میں نے اُس کی بہم بات کی وضاحت طلب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اُس کے جانے کے بعد انکا دوبارہ میرے سر پر آ گئی۔

”یہ گردن تم سے کیا کہنے آیا تھا.....؟“ انکا نے پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ میرے اور گردن کے درمیان ہونے والی بات نہیں سن سکی۔ شاید گردن نے میرے اور انکا کے درمیان بھی

تھی طور پر کوئی دیوار حاصل کر دی تھی۔

مجھ سے آخری بار ملنے آیا تھا۔ میں نے لمبی سانس لے کر افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”کھد رہا تھا کہ دیوی کا بلاوا آگیا ہے۔“

انکا مجھے نونے لڑائی نظروں سے گھورنے لگی۔ میں نے جہاں ہی لے کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔!

رات سکون سے بیت گئی۔ صبح کی حالت کی سن گن لینے چلی گئی۔ میں ناشتہ کرنے کے بعد فارغ ہوا تو مرلی آگیا۔ اُس کے چہرے پر نظر آنے والے تاثرات اُس کے اندر کی پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہوئی۔

”میرے بیان کے بغیر تمہاری انکوائری مکمل نہیں ہو سکتی۔ تم جو چاہو لکھ لو، میں دستخط کر دوں گا۔ تمہارے اور سر جی کے کچھ احسانات ہیں مجھ پر۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم دونوں کو کوئی پریشانی لاحق ہو۔“

”میں اس وقت بیان نہیں، آپ کو لینے آیا ہوں۔“ اُس کے لہجے میں کوئی کھینچ کھنک رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو۔۔۔۔۔؟“ میں نے سنجیدگی اختیار کر لی۔

”روی شکر نے آپ کو ہیڈ آفس بلوایا ہے۔“ مرلی نے ہونٹ کانٹتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”اجودھیا سے ایک بڑے پنڈت کو بھی بلایا گیا ہے۔ روی شکر کو میں نے اسپیکر کی وردی اُترنے والی بات بتا دی۔ اُس کے خبروں نے پہلے ہی سے تفصیل سن رکھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ سے پھر سودے بازی کرنا چاہے گا۔“

”پنڈت پر بھو دیال کو کیوں بلایا گیا ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے زہر خند سے دریافت کیا تو مرلی کسمسا نے لگا۔

”آپ کو اُس کا نام کیسے معلوم ہوا۔۔۔۔۔؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔“ میں نے گول مول انداز اختیار کیا۔ ”روی شکر اگر

خود اپنے پیروں پر کلباڑی مارنے کا فیصلہ کر چکا ہے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔“

میں مرلی کے ساتھ جانے کو تیار ہوا تو انکا سر پر واپس آ گئی۔ اُس کے چہرے پر بھی گہری سنجیدگی مسلط تھی۔ میں نے فوری طور پر اُسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا، مرلی کے ساتھ

حوالات سے باہر قدم نکالا تو چار سنتری رائفل تانے فرائض کی خانہ پُری کی خاطر آگے بڑھے۔ مرلی نے انہیں اشارے سے روک دیا۔ ڈیوٹی آفیسر بھی دُور دُور ہی رہا۔ مجھے مرلی کے بے حد اصرار پر سینڈ کی لاٹھی تھانے میں ہی چھوٹی پڑی۔

تھانے کے باہر ایک بکتر بند گاڑی موجود تھی، اس کے پیچھے مسلح سپاہیوں کی ٹولی ایک ڈک نما بڑی دین میں موجود تھی۔ مرلی مجھے لے کر بکتر بند گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ پولیس کمانڈو بھی موجود تھے۔ مرلی نے ان دونوں کو نیچے اُترنے کا حکم دیا تو ایک ہانسنے کے لئے وہ ہچکچاہے، لیکن مرلی کے حکم سے انکار نہیں کر سکے۔

گھاڑی حرکت میں آئی تو مرلی نے انگریزی زبان میں بات شروع کر دی۔ اُس نے اپنی آواز کو اتنا بلند نہیں ہونے دیا کہ ڈرائیور کے کانوں تک پہنچ جائے۔

”مہاراج۔۔۔۔۔ مجھے زہر کے گھونٹ پی کر روی شکر کے حکم کی پیروی کرنی پڑ رہی ہے۔ مرو جی بھی آپ کے لئے پریشان ہے۔ صبح کبہ رہی تھی کہ میں استعفیٰ لکھ کر ڈی آئی جی کے منہ پر مار دوں۔ لیکن موجود حالات میں۔۔۔۔۔“

”میں تمہاری مجبوری سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ”سکون سے

تھامے۔۔۔۔۔ کہتے رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”جیل، مرلی سے کہو کہ ڈرائیور کو ہتھکڑی لگنے کی ہدایت کرے۔ اگلے چور سے سے گاڑی سیدھے کی بجائے اُلے ہاتھ موڑ دیا جائے گا۔“

”جیل، مرلی سے کہو کہ ڈرائیور کو ہتھکڑی لگنے کی ہدایت کرے۔ اگلے چور سے سے گاڑی سیدھے کی بجائے اُلے ہاتھ موڑ دیا جائے گا۔“

”مہاراج۔۔۔۔۔“ اُس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن میں نے اُس کی بات پھر کات دی۔

”سے کم ہے مرلی۔۔۔۔۔ ڈرائیور کو حکم دو کہ چورستے سے گاڑی ہائیں ہاتھ موڑ لے۔“ میں نے ٹھونکے میں کہا۔ ”سیدھے ہاتھ والے راستے پر موت کنڈلی مارے بیٹھی ہے۔ روی شکر میرے علاوہ ہماری بھی جان کا دشمن ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی آنکھیں کھلی رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔“

مرلی نے ڈرائیور کو گلا گلا کر ہاتھ بدلنے کی ہدایت کی تو وہ اپنی نشست پر کسمانے لگا۔ لیکن مرلی کے حکم کی خلاف ورزی کی نہ کر سکا۔ بکتر بند گاڑی نے طے شدہ راستہ بدلا تو وائرلیس سسٹم جاگ اٹھا۔ کسی کی کھر کھرانی ہوئی آواز ابھری۔۔۔۔۔ ”نمبرون، تم نے گاڑی لیفٹ پنڈ پر کیوں موڑ دی؟ سیدھے ہاتھ کی طرف لو جاؤ۔۔۔۔۔“

”ڈپٹی صاحب نے لیفٹ پنڈ چلنے کا حکم دیا ہے۔ ڈرائیور نے پاٹ لہجے میں جواب دیا۔“ میں نے اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا۔“

”بحث مت کرو۔“ تمکسانہ لہجے میں کہا گیا۔ ”جرورٹ بڑے سوکھنے والے ٹم کر دیا ہے اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ گاڑی واپس موڑو۔“

”تم اسی راستے پر چلتے رہو۔“ مرلی نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ پھر اپنا واکی ناکی آنکھ سے ہوئے بولا۔ ”میں ڈی ایس بی ریش کھنا بول رہا ہوں۔ مجھے انفارمیشن ملی ہے کہ سیدھے ہاتھ پر جانا خطرناک ہے۔ اس لئے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔۔۔۔۔ اور۔“

”سر۔۔۔۔۔“ دوسری جانب سے احتراماً کہا گیا۔ پھر بولنے والے نے مرلی کو اطلاع دی کہ پولیس وین طے شدہ راستے پر ہی نکل گئی ہے۔

”اُس سے فوراً رابطہ قائم کر کے میرے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دو۔“ مرلی نے جھلا کر کہا۔ ”کیا وین کا ڈرائیور اندھا تھا جو اُسے بکتر بند گاڑی نظر نہیں آئی؟ اُسے کنٹیکٹ کر کے مجھے انفارم کرو۔۔۔۔۔ اور اینڈ آل۔“

مرلی کے چہرے پر تشویش کے تاثرات پھیل کر گہرے ہونے لگے۔ بدلتی ہوئی چوہنشن نے اُس کے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔ میں جانتا تھا اُس نے واکی ناکی پر جو ہدایت جاری کی تھی اس کی قبول ممکن نہیں ہوگی۔ انکا کی سر پر موجودگی کے سبب پولیس وین کا ڈرائیور کسی دوسرے کے احکامات پر عمل کرنے سے قاصر تھا۔ مرلی نے بے چینی سے رو رہ کر پہلو بدلتا شروع کر دیا۔ بکتر بند گاڑی کا ڈرائیور بھی بار بار عقب نما شیشے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں

خاموش بیٹھا دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔۔۔۔۔ سات آٹھ منٹ گزر گئے، دوسری جانب سے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مرلی نے دوبارہ واکی ناکی آنکھ کی کوشش کی لیکن اسی لئے کہیں دُور سے اتنے خوفناک دھماکے کی آواز ابھری کہ بکتر بند گاڑی بھی لہر کر رہ گئی۔ باہر یقیناً انفارمزی پھیل گئی ہوگی۔ قرب و جوار کی عمارتیں بھی بل کر رہ گئی ہوں گی۔ شیشے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے ہوں گے۔ کئی بے گناہ افراد بھی زندگی سے ہاتھ دھو چکے ہوں گے۔ پولیس وین کے تو پر پنے اُڑ گئے ہوں گے، قرب و جوار کی اور بہت ساری گاڑیاں بھی ضرور لیٹ میں آئی ہوں گی۔ روی شکر تک خبر پہنچے گی تو وہ بھی بلبلانے لگے گا۔ اجودھیا سے خاص طور پر بلائے جانے والا پنڈت پر بھو دیال بھی سوچ و چار میں پڑ جائے گا۔

”سر۔۔۔۔۔“ بکتر بند گاڑی کے ڈرائیور نے بھی بھی آواز میں مرلی سے کہا۔ ”بھگوان کی دیاستے ہم بال بال بچ گئے۔ آپ کی انفارمیشن نے مجھے غریب کی جان بھی بچالی۔۔۔۔۔“

مرلی کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ وائرلیس سسٹم پھر جاگ اٹھا۔ ایک کھر کھرانی ہوئی آواز ابھری۔ ”نمبرون۔۔۔۔۔ تم تیزی سے ہیڈ آفس پہنچنے کی کوشش کرو۔ ڈی آئی جی کا حکم ہے۔ ڈپٹی صاحب تو خیریت سے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”کال۔۔۔۔۔“ ڈرائیور نے مُردہ آواز میں پوچھا۔ ”ہماری وین کا کیا بنا۔۔۔۔۔؟“ صاحب سے کہو کہ بڑے صاحب سے واکی ناکی پر بات کریں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ پھر رابطہ کر دیا گیا۔ مرلی نے واکی ناکی پر روی شکر سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ انکا میرے سامنے واپس آ گئی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے تھمٹا رہا تھا۔

”میں نے پنڈت پر بھو دیال کا مکان خراب کر دیا۔“ وہ سر پر آلتی پاتنی مار کر بیٹھے ہوئے بولی۔ ”حادثے کی خبر سن کر وہ بھی خراب ہو گئے، غصے میں اپنا منجھرا کھجلا رہا ہوگا۔ روی شکر کی چٹون بھی ڈھیلی پڑ گئی ہوگی۔۔۔۔۔“

”نرک پر ہر طرف خون ہی خون ہوگا۔“ میں نے انکا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تجھڑ خانی کی۔ ”تم اتنی جلدی کیسے واپس لوٹ آئیں؟“

”مجھے سکتے کراچے لوگوں کا خون پینے کی عادت نہیں ہے۔ وہی خون پی کر مجھے میں بولی۔“

”تم ذرا اطمینان کا سانس لو تو ہم دونوں مل جل کر جشن منائیں گے۔“

میں نے روی شکر اور مرلی کے درمیان ہونے والی گفتگو پر توجہ نہیں دی، انکا سے پھیز

پھاڑ کر رہا۔ وہ بھی میرا دل بہلاتی رہی۔ کچھ دیر بعد مرلی نے والی ٹاکی بند کر کے مجھے بلا لیا۔ ہماری سے مخاطب کیا۔

”مہاراج! تم نے آج میرے اوپر جوا بکار کیا ہے وہ میں سارا جہون نہیں بھولوں گا۔“
 ”تم بھول رہے ہو مرلی، اس گاڑی میں تم تنہا نہیں ہو، میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں۔“ میں سنجیدی سے بولا۔ ”میں نے اگر بروقت خطرے کی بوند نہ سمجھی ہوتی تو تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی پر لوک سدھار جا رہا تھا۔“

”ایک بات پوچھوں مہاراج.....؟“
 ”پوچھو.....“

”یہ دھماکے والی سازش کس نے کی تھی؟“
 ”ہم دونوں کے متر (دوست) روی شکر مہاراج کی۔ میں نے سمجھتے ہوئے لہجے میں کہا، پھر غلاء میں گھورتے ہوئے بولا۔ ”اب اُس کا برا وقت بھی نہیں آ رہا ہے۔“

میں مرلی پر اپنی پراسرار قوتوں کی دھماک جھاتا رہا، وہ مسکسی صورت کے منٹھا بڑی سعادت مندی سے میری باتیں سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد یکسر بند گاڑی پولیس ہیڈ آفس کے رُک کر تو وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں دروازہ کھلنے پر گاڑی سے نیچے اُتر تو پولیس کے مسلح سپاہیوں نے لپک کر مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مرلی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں ابھی تک زنجیروں کی قید سے آزاد نہیں کیا گیا تھا پھر بھی دشمن مجھے کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ پولیس ہیڈ آفس کے احاطے میں کئی افسران بھی موجود تھے۔ سبھی کے چہرے دُحوال دُحوال ہو رہے تھے۔ پولیس وین کی تباہی اور دھماکے کے سبب رواں دواں زندگی میں جو خصل پیش آ گیا تھا اس نے سب کو بولکھلایا تھا۔

مجھے مرلی کے ساتھ ہی اُس کمرہ خاص میں قدم رکھنا پڑا جہاں روی شکر کے علاوہ دروازہ قہر کا ایک ہٹا کتا پنڈت بھی موجود تھا۔ اُس کے تیر مجھے دیکھتے ہی خطرناک ہو گئے۔ اُس کی نگاہوں میں بلا کا اعتماد موجود تھا۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے دانوں کی مالا لے کر کوئی متر جب رہا تھا، کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ روی شکر نے بھی اُس کی پیروی کی۔ میں نے محسوس کیا کہ انکا پنڈت کو دیکھ کر میرے بالوں میں دھبک مچی تھی۔

میں پایہ زنجیر ہونے کے باوجود سینہ تان کر آگے بڑھتا رہا۔ پھر مرلی نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا تو میں پاؤں جما کر کھڑا ہو گیا۔ روی شکر کی نگاہوں میں میرے لئے نفرت کا احساس جھلک رہا تھا۔ ایک لمحے تک وہ مجھے تیز نظروں سے گھورتا رہا، پھر اُس نے میرے بجائے مرلی کو مخاطب کیا۔

”تمہیں خطرے کی اطلاع کب ہوئی تھی؟“ ڈی آئی جی نے سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔

”اسے میں نے بتایا تھا۔“ مرلی کو شہنشاہ دیکھ کر میں نے روی شکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”میری نظروں نے تمہاری یکسر بند گاڑی میں ہونے کے باوجود دیکھ لیا تھا کہ سیدھے ہاتھ پر خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں۔“

”تمہاری انکوائری رپورٹ کہاں تک پہنچی؟“ روی شکر نے میری بات نظر انداز کر کے پھر مرلی کی طرف دیکھا۔

”میں نے کوئی بیان دینے سے انکار کر دیا ہے۔“ میں نے دوبارہ مداخلت کی۔ ”انسپکٹر! اس وقت زندہ تھا جب مقبوت خانے میں تین لاشیں ڈھیر ہوئی تھیں۔ اُس سے یہ معلوم ہو گیا کہ کیسے بچ گیا۔“ ”میرے لہجے میں کتنی تھی۔ میں روی شکر اور پنڈت پر بھودیاں دوں گا یا نہ کرنا چاہتا تھا کہ میں ان سے خائف نہیں ہوں۔ پنڈت کی انگلیاں مالا کے دانوں پر بیٹھ کر چلے گئیں۔ وہ گرگٹ کی طرح رہ رہ کر رنگ بدل رہا تھا۔

”انسپکٹر بلیر! ابھی تک کہانے بیان پر اڑا ہوا ہے۔“ مرلی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ملوث شخص ہے۔ میں دوسرے ذرائع سے معلومات حاصل کر رہا ہوں۔ ایک دن بعد اپنی رپورٹ پیش کر دوں گا۔“

”اوکے.....“ روی شکر نے سپاٹ سے اٹھ کر کہا۔ ”تم باہر بیٹھو، ہمیں جیل احمد خان سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

مرلی نے ایڑیاں جوڑ کر سیٹھ کیا، پلٹ کر میری طرف دیکھ کر قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ ”جیل.....“ مجھے انکا کی سرگوشی سنائی دی۔ ”صبر سے کام لو۔“ ”مرلی کی بددعا کا وقت پورا ہونے میں کچھ ہی دن رہ گئے ہیں۔ میں نے پنڈت پر بھودیاں تو پیش کر دی ہیں، یہ بڑی نراں کے مقابلے میں زیادہ پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے اُلجھنے کی گنجائش نہ رہتی۔“

”لک چپ کر کیوں بیٹھی ہے سندری؟“ پنڈت نے پہلی بار زبان کھولی۔ اُس کے لیے میں نے وہی رکی کاٹ تھی۔ سانپ کا زہر گھلا ہوا تھا۔ وہ انکا سے مخاطب تھا۔ ”سانے آجا، میں بھی آج تیرا دکھائیں کروں۔“

”تم..... کس سے باتیں کر رہے ہو مہاراج؟“ رومی شکر نے حیرت کا اظہار کیا۔

”پنڈت پجاریوں کے گھانے دھیان کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ پر بھو دیال نے سیدھا ہاتھ اٹھا کر رومی کی طرف اشارہ کیا۔ میرے سر پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ ”میں تیری سندرتا، تیری کھانسی اور تیرے کھیل تماشوں کے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔ آ..... سانے آجا، مجھے بھی لکھی چھب دکھا دے۔ میری اچھا پوری کر دے، پھر بھلے چلی جانا۔“

”یہ کدو فریب کی باتیں کر رہا ہے۔“ انکا کی مدھم آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”اُس نے مجھے دیکھ لیا تو پھر اس پر میرا کوئی داؤا اثر نہیں کرے گا۔ میں جاری ہوں۔ تم احتیاط سے کام لینا۔“

انکا میرے سر سے ربک کر اتر گئی۔ پنڈت بل کھانے لگا۔ میں نے پہل نہیں لی۔ خاموش کھڑا رومی شکر اور پنڈت کو باری باری دیکھتا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر گہرا سکوت طاری رہا، پھر رومی شکر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”میں ایک بار پھر تم کو بھارت کی سرحدوں سے نکل جانے کی پیش کش کر رہا ہوں۔“

اُس کا لہجہ بڑا سرد اور کھرا تھا۔

”میں اپنے فیصلوں میں ترمیم کرنے کا عادی نہیں ہوں۔“ میں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

”نیچے واپس آجا مورکھ.....“ پنڈت پر بھو دیال نے مجھے تیز نظروں سے گھورا۔ اُس کی آنکھوں میں متناظر سی کشش تھی۔ مجھے اپنا وجود زلتا محسوس ہوا۔ میں نے جلدی سے اپنی توجہ دوسری طرف کر لی۔ ایک لمبے کی دیر ہو جاتی تو پنڈت کی پاسر اوتھیں مجھے اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہو جاتیں۔ مجھے سید کی لٹھی کا خیال آیا، وہ میرے پاس ہوتی تو شاید پر بھو دیال بھی اُسے دیکھ کر مجھے زیر کرنے سے پہلے دس بار غور کرنا ضروری سمجھتا۔ مجھے نظریں بچاتا دیکھ کر پنڈت نے ”جے کالی“ کا نعرہ بلند کیا، پھر الفاظ چباتے ہوئے بولا۔

”سانے تو نے تھانے میں کسی انسپکٹر کی وردی اترادی تھی، ہمیں بھی کوئی چسکا رکھا دے۔ زمین پر ٹھوکر مار کر شعلے بھڑکا، میرے شریر کے کپڑے بھی اتروانے کے لئے کوئی داؤ پیچ کر..... نظریں ملا کر بات کر.....“

پنڈت مجھے بھڑکانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ انکارانی کہیں آس پاس ہی موجود ایک ایک بات سن رہی ہوگی۔ اُس نے کہا تھا کہ پر بھو دیال، بدری نرائن سے زیادہ قوتوں کا مالک ہے۔ میں بدری نرائن کو کتوں کی موت مار چکا تھا۔ کلدیپ نے امرالال کے جسم کے کئی ٹکڑے کر دیئے تھے۔ جب اور بات تھی، کلدیپ میرے ساتھ تھی اس وقت میں تنہا کھڑا تھا۔ دُرگہ نے اکیس دنوں کے لئے میری قوتیں سلب کر لی تھیں۔ انکا کا شورہ تھا کہ میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ پنڈت مجھے اشتعال دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”چپ کیوں ہے.....؟“ پر بھو دیال نے حقارت سے کہا۔ ”اُوںچے سروں میں بات کر، نو جوان چمو کر یوں کی طرح نظریں کیوں چرا رہا ہے.....؟“

”پنڈت.....“ میں چپ نہ رہ سکا۔ ”میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے، کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم درمیان میں نہ آؤ تو بہتر ہوگا۔“

”کیوں؟“ وہ کینگی پر اتر آیا۔ ”مجھے دیکھ کر کئی شک ہو گئی؟ ڈیڑھ بالشت کی چھمیا سر سے اتر گئی تو مجھ کو یوں لگا۔ اُس کی موجودگی میں دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔ پھاڑ کے نیچے پاتا بلبلانے لگا؟“

”زبان کو لگام دو پر بھو دیال.....“ میں نے تھملا کر جواب دیا۔ ”تم بھی دُرگہ کے دیئے ہوئے سراپ کی وجہ سے اُوچی اور اُنس بول رہے ہو۔ میرے ہاتھ پیر بندھے ہیں اور تم اپنی مراد مانگی کی ڈینگیں مار رہے ہو۔ میںی ویشنوی اور جنوں کے قصے تم نے بھی ضرور سنے ہوں گے۔ نہیں سنے تو گرد پر تاپ سے جا کر پوچھو.....“

”بھول جا اُس مورکھ کو جس نے تیرے کارن اپنا جیون بھٹ کر دیا۔“ پنڈت جھلا کر بولا۔ ”وہ مہان شق کی کا مالک تھا لیکن بھول سے دُرگہ سے پھیر لائی گئی غلطی کر بیٹھا۔ تو نے نہیں دیکھا، میں جانتا ہوں کہ اُس کا انت کتنا بھیا تک ہوا۔ اُسے دُرگہ کے جھانچوں میں بھاریوں نے بونیاں نوج نوج کر ختم کر دیا۔ اُس کی اتھا اور شریر کا بندھن ٹوٹ گیا۔ آخری سانس تک اُس مہاریش نے جیون کی بھکھا بھی نہیں مانگی۔ بڑا مورکھ تھا، تجھ جیسے پانی کے

لے جان دے دی۔“

”نہایت.....“ میں نے استہزائیہ انداز اختیار کیا۔ ”تم نہیں جانتے کہ گرد نے میری خاطر فریاد کیوں دی..... جان لیتے تو آج وہاں سے چل کر یہاں تک آنے کی غلطی کبھی نہ کرتے۔“

میرا جواب سن کر وہی شکر کھانے لگا۔ پر مجھ کو دیال کی آنکھوں میں بھی شعلے بھڑکنے لگے۔ اُس نے اپنے سینے کا ایک ہاتھ توڑ کر بڑی قوت سے میری جانب اچھالا۔ میں تو ازان برقرار نہ رکھ سکا، تیوراً کر زمین پر گر پڑا۔ مجھے چھین تو اذیت سے کراہ کر رہ گیا۔ روی شکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”روی کی بات مان لے پانی.....“ پنڈت نے لڑکتے کہا۔ ”اس دلش سے دفع ہو جا..... سن رہا ہے میری بات، اسی میں تیری مٹی ہے۔“

”میرے فیصلے میں لپک پیدا کرنے میں تمہیں کبھی کامیابی نہیں ہوگی پر مجھ کو دیال.....“ میں نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم نے تھوڑی بہت تھیں جاسی کر رکھی ہیں مگر شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ تم سے پہلے تمہارے جیسے بہت سارے لوگ پہچاری میرا رستہ کھونا کرنے کی حماقت کر چکے ہیں۔ انہوں نے بھی جذبات اور دھرم کے نام پر امداد سے ہو کر اپنی اوقات سے تجاؤز کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن انجام کیا ہوا؟ ایک ایک کر کے سب پر لوگ سدھار گئے۔ تمہاری دُرگہ بھی صرف چندہ بیس روز کے لئے میرے اوپر حاوی ہو سکی، اُس کے اختیار میں ہوا تو گرد پر تپ سے پہلے مجھے زک میں جھونکنے کی.....“

”چپ ہو جا مرنکھ، پانی..... اپنی زبان کو تالا لگا لے۔“ پنڈت آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے دوسرا وار کیا۔ اُلٹا پاؤں اٹھا کر زمین پر مارا، برے چاروں طرف آگ بھڑکنے لگی۔ شعلے مجھے جلا کر خاک کر دینے کی خاطر میری سمت بڑھ رہے تھے جب کسی نے میرا بازو تھام لیا۔ میں نے بوکھلا کر دُرگہ ہوں کا زوہ بدلا۔ میں سمجھا کہ پنڈت کے جتنز منتر کے پیر میرا ہاتھ تمام کر آگ میں جھونکنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن میری نظر سید مجذب پر پڑی تو میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔

”مجھے یقین تھا پیر و مرشد.....“ میں نے تڑپ کر کہا۔ ”میرے مہر کی انتہا تمہیں میری

جانب ضرور متوجہ کر لے گی۔ تمہارے اشارے پر روی کو دھکی بھی لگ چکی، میں نے اُس وقت بھی اُف نہیں کی، اب کہو تو اپنے وجود و شعلوں میں جھونک دوں۔“

”دو لٹی جھاڑ کر کھڑا ہو جا..... آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ریگنا شروع کر دے۔“ سید نے اپنے جسم کا تھوڑا سا میل اُتار کر میرے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا، پھر یکت نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

بھڑکنے ہوئے شعلے تیزی سے بلند ہو کر میری طرف لپک رہے تھے۔ پنڈت پر مجھو دیال کے ہونٹ بدستور متحرک تھے۔ وہ مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کی خاطر کسی خطرناک جان لیوا منتر کا جاپ کر رہا تھا۔ روی شکر بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میں نے سید مجذب کے میل کو زبان کے ذریعے حلق کے نیچے اُتار لیا۔ بھڑکنے ہوئے شعلوں کا قریب لپک جھپکنے میں ختم ہو گیا۔ پنڈت اور روی شکر کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ مجھے اپنے اندر پرانی توانائی کروٹ لیتی محسوس ہوئی۔ میں نے ہاتھوں کو جھٹکا دیا، ہتھکڑیاں کاٹنے کی چوڑیوں کی طرح ٹوٹ کر ایک طرف جا پڑیں۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ دُرگہ کا عتاب سید کے جسم کے میل سے ختم ہو گیا تھا..... میں اُنھ کو بیٹھ گیا۔ پیروں کی زنجیروں کو کچے دھاگوں کی طرح ہاتھوں کی طرف اچھال دیا۔ مسکراتا ہوا کھڑا ہوا تو روی شکر دم بخود رہ گیا۔ پنڈت نے غصے میں کبھ کھڑا ہوا اُلٹا ہاتھ فضا میں بلند کیا، میں نے دم سادھ لیا۔ مجھے سید کی ذات پر اعتقاد تھا۔ پر مجھو دیال نے میرا دل کر جھلے کرتا رہا، اپنے ترکش کے سارے تیر ایک ایک کر کے اُڑاتا رہا۔ اُسے ناگامی دہی تو بل کھانے لگا۔

”میں نے تم سے کہا تھا پنڈت کہ اپنی وڈیا سے میرے بارے میں جان لیتے تو میرے مقابلے پر آنے کی غلطی کبھی نہ کرتے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تم نے اپنے دل کے سارے ارمان نکال لئے۔ اب میری پاؤں سے ہاتھ ہٹاؤ تمہیں بھی آنکھ کے ایک اشارے سے گرد پر تپ کے پاس بھیج دوں، لیکن نہیں۔“ میں زہر خند سے بولا۔ ”میں تمہیں ماروں گا نہیں۔ تم زندہ رہو گے تاکہ اپنی زبان سے چند راویوں کو شکر کو بتا سکوں کہ انہوں نے میرے خلاف پنڈت پجاریوں کے دلوں میں زہر گھول کر ٹھیک کیا۔“

پنڈت پر مجھو دیال اپنی جگہ کھڑا ہونٹ کا قاتل رہا، نگاہوں میں مجھے ٹوک رہا۔ میں نے روی شکر کی سمت دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

”جہیں یاد ہے روی شکر؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔۔۔۔۔“
 ”مم۔۔۔۔۔ میں قانون کی خانہ پڑی کرنے پر مجبور ہوں۔“ اُس نے بڑی مُردہ آواز میں جواب دیا۔

”ضرور کو جانچو۔“ میں نے حقارت سے جھکمانہ انداز میں کہا۔ ”میں جہیں منع نہیں کرتا۔ لیکن اپنے کاموں کو اپنی ہی زبان میں سمجھا دینا کہ مجھ سے چھیڑ خانی نہ کریں۔ ایک بات اور دھیان سے سن لو، کوئی پس پی ریش کھنا (مرلی) یا سرہ جنی نے اپنی خوشی سے مجھے اپنے گھر میں پناہ نہیں دی تھی۔ وہیں میری طاقت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس شخص نے بس نظر آرہے ہو۔ اُن دونوں کے خلاف کوئی گھنایا قدم اٹھانے کا ارادہ بھول کر بھی مت کرنا۔ تم نے؟ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“
 روی شکر کچھ جواب دینا چاہتا تھا، لیکن اُسے موقع نہیں ملا۔ پنڈت پر بھودیال کو اپنی شکست منظور نہیں تھی۔ اُس نے آخری حربے کے طور پر اپنے گلے میں بڑی ہولی مالا اُتار کر زور سے میری طرف جھینگی۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ مالا کے دانے دیوار سے ٹکرائے اور اُدھر بکھر گئے۔ پنڈت نے میرے جھانسنے کے باوجود کمینگی کا ثبوت دیا تھا۔ میں اُسے دیکھ کر ہنس رہا تھا۔
 پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے تندہا کا سکھایا ہوا عمل شروع کر دیا۔

”مجھے شہا کر دو جمیل احمد خاں۔۔۔۔۔“ پنڈت گونگزانے لگا۔ ”میں تمہاری شہتی کا اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ بھول ہو گئی مجھ سے۔“

میں نے جواب میں اُسے تیز نظروں سے گورا۔ پھر یہ میری تیز نگاہوں کا اثر تھا، میری مدتوں کی شب و روز ریاضتوں کا کرشمہ تھا، میرے ارٹکاز اور مراقبوں کی مسلسل مشقتوں کا نتیجہ تھا کہ پنڈت پر بھودیال کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ چکر اکر نیچے گرا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا جسم مجلس کر کو سکلے کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ روی شکر نے پنڈت کا بھیاک انجام دیکھا تو تھر تھر کا پٹنے لگا۔

انکارانی میرے سر پر اوپس آ کر خوشی میں دیوانہ وار دھنسنے لگی۔!!



بازی پلٹ گئی۔ سید مجذوب جیت گیا۔ دُرگا کی شہتی کا سراپ مل بھر میں دم توڑ گیا۔ روی شکر نے میری طاقت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ کمینگی سے انکساری پر اُتر آیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں کو محتاط رہنے کا اشارہ کر دیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ انکا بھی حیران رہ گئی۔ مجھے دوبارہ تھانے کے لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔ اس بار اُنہوں نے مجھے زنجیروں میں جکڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ سید مجذوب کی اُلٹی میرے پاس ہی رہی۔ انکا بار بار ایک ہی رٹ لگا رہی تھی۔

”جمیل، میں نے زمانے کی کئی کروٹوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بڑے بڑے سورماؤں سے پالا پڑا ہے، پراسرار قوتوں کے بارے میں اتنا تم نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں۔ دنیا میں آج بھی ایسی آبادیاں موجود ہیں جہاں تک تمہارے سائنس دان اور کونجیل کے درمیان نہیں ہو سکی۔ وہاں دیوتاؤں نے اپنے ماننے والوں کے لئے ایک منڈول کھینچ دیا ہے جس کے اندر اُن کے پجاریوں کے سوا کوئی دوسرا داخل نہیں ہو سکتا۔ زمین سے آسمان تک اس جگہ کے اندر جو شے بھی داخل ہوتی ہے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ تمہاری مہذب دنیا کے لوگ ان باتوں کو نہیں مانتے لیکن آئے دن ان مخصوص علاقوں سے گزرنے والے طیاروں کی تباہی کی کوئی دوسری وجہ ثابت نہیں کر سکے۔ کئی سر پھرے سیاہوں نے ان غیر مہذب علاقوں کو کھوجنے میں جان منوادی۔ جو کامیاب نہیں ہو سکے اُنہوں نے اپنی معلومات کا ذخیرہ کتابوں میں جمع کر کے لوگوں میں پھیلانے کی کوشش کی۔ لیکن انہیں مہماتی، پراسرار اور ہولناک کہانیوں کا نام دے کر انہیں میں سجاد دیا گیا۔ تم چاہو تو میں جہیں وہاں کے بارے میں بہت کارآمد باتیں بتا سکتی ہوں۔ مثلاً یہ کہ ان آبادیوں میں لکڑی اور گھاس بیوس سے بنائے گئے دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے، انہیں پوجا جاتا تھا، ان کی رسمیں بھی عجیب و غریب اور بڑی ہولناک ہوتی ہیں۔ تم ان کا تصور نہیں کر سکتے۔“

میں بھوس کے دیوتاؤں سے شگون لیا جاتا ہے۔ چھوٹے بڑے سب ان پر آگاہ بند کر کے اٹھائے گئے ہیں۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھی دیوی دیوتاؤں کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی طاقت کے کثرتوں سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ ان کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ انکا بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ”رگھا کی شقی بھی اپرم پار ہے۔ میں نے بھی تم سے یہی کہا تھا کہ اکیس روز کے لئے چھوٹی توہن تمہارے کسی کام نہیں آسکیں گی۔ تم گرو پرتاپ سے مل چکے ہو۔ وہ بھی پرہم لال مہاراج کے لڑکے کا بچاری تھا۔ تم گواہ ہو کہ اُس نے تمہارا ہاتھ تمام کر نہیں روی شکر اور اُس کے بہت سے تمہارے دشمنوں کی آنکھوں سے اوچھل کر دیا تھا۔ سرچ لاش کی تیز روشنیاں بھی پکار ہوئی تھیں۔ لیکن رگھا کے سامنے وہ بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ سینٹ کی رسم کی ادائیگی کے وقت تک رگھا کی آنکھوں میں مدھ کے پیالے کی گر وشنندہ رقص کر رہی تھیں۔ پنڈت پجاریوں کا جہم دُرگا کی شان میں لاپ بھلا رہا تھا، گرو کی شقی چھین لگئی، اُسے کڑے کڑے کر کے دُرگا کے چنوں میں ڈال دیا گیا۔ میں نے بھی تم سے یہی کہا تھا، گرو کو اُس کے کئے کی سزا ضرور ملے گی۔“ انکا ایک سے دوسرا کس نے کی خاطر دُرگی پھر ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”بیل..... مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ تمہارے ساتھ ایک انہونی بات کس طرح ہوگی؟ دُرگا کے عتاب کی مدت ابھی پوری نہیں ہوئی تھی لیکن تم نے سب کو حیران کر دیا..... مجھے بتاؤ، یہ کیسے ہو گیا.....؟“

”وہ بروقت آگیا تھا انکارانی۔“ میں نے سید کی لاشی چوم کر جواب دیا۔ ”ایک لمبے کی دیر ہو جاتی تو پنڈت پرہمو دیال کی بھڑکائی ہوئی آگ مجھے جلا کر خاک کر دیتی۔ اُس نے آ کر اپنے جسم کا میل میرے منہ میں ڈال دیا۔ دُرگا کی طاقت کے جال کیسے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گئے۔“

”تم قسمت کے دشمن ہو جو وہ بار بار تمہیں درشن دیتا رہتا ہے۔“

انکا میرے ساتھ باتوں میں مصروف رہتی، میرا وقت سکون سے گزر جاتا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اب چندر اور پنڈت نول کشوری باتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔ میں اُن کا نام سن کر بھڑک اٹھتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے دشمنوں کی طرف سے غافل نہیں ہو گی۔ جب وہ سر پر نہیں ہوتی تھی تو میں بھی چندر اور نول کشور کے انجام کے بارے میں منصوبے بناتا رہتا تھا۔

مرلی پہلے ہی میرا غلام بن چکا تھا، پنڈت پرہمو دیال کا انجام دیکھ کر اور بھی مرید بن گیا۔ اُس نے مجھے بتایا تھا کہ پنڈت کی لاش کو خاموشی سے ایک چڑی تھیلے میں بند کر کے بڑی رازداری سے ٹھکانے لگا دیا گیا۔ یہ کام روی شکر کے خاص آدمیوں نے سرانجام دیا تھا۔ مرلی صرف پنڈت کی کوئلہ بنی لاش ہی دیکھ سکا۔ روی شکر نے اُسے سخت الفاظ میں زبان بند رکھنے کی تاکید کی تھی۔ مرلی کو یہ ہدایت نہ کی جاتی تب بھی وہ زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ پنڈت نول کشور یا دوسرے پنڈت پجاریوں کو پرہمو دیال کے سلسلے میں بھٹک مل جاتی تو وہ پھر بے قابو ہو جاتے۔ مرلی کو بھی جان بچانی مشکل ہو جاتی۔

میں اُس روز بھی سید کی لاشی کو سینے سے لگائے بیٹھا نول کشور کے بارے میں سوچ رہا تھا جب مرلی آگیا۔ وہ کچھ بوکھلایا بوکھلایا نظر آ رہا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو مدھم آواز میں بولا۔

”کل رات انسپٹر بلیر بھی مر گیا۔ اُس کے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔ روی شکر نے بھی اُس کی آخری رسومات میں بطور خاص حصہ لیا تھا۔ اُس نے بلیر کے گھر والوں کو دہلی زبان میں سمجھا دیا ہے کہ وہ صبر سے کام لیں، بات پھینکنے نہ پائے۔“

”مہاراج! تم کو دوبارہ عدالت کے روبرو پیش کیا جائے گا۔“ مرلی کسمسانے لگا۔

”ریٹائرڈ کی مدت پوری ہو چکی ہے۔“

”مرلی.....“ میں نے اُسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم کچھ نروس دکھائی دے رہے ہو.....؟“

”کل کے لئے بڑے سخت انتظامات کئے جا رہے ہیں۔“ اُس نے متشکر انداز میں جواب دیا۔ ”کچھ پنڈت پجاری بارے میں آئے ہیں، دُرگا کے مندر میں سر جوڑے مشورے کر رہے ہیں۔ ڈی آئی جی کی نیندیں حرام ہوئی ہیں۔ اُسے اندیشہ ہے کہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور ہوگا۔ میری انکواری رپورٹ سے بھی وہ خوش نہیں ہے۔“

”تم نے ایسا کیا کھد دیا جو روی شکر کو پسند نہیں آیا؟“ میں نے بے پرواہی سے پوچھا۔

”میں نے جو لکھا وہ غلط نہیں ہے۔ پنڈت کالی داس اور اوم پرکاش کی موت میں مجھے

تمہارا کوئی عمل دخل نظر نہیں آیا۔“ مرلی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”میں نے رپورٹ میں جیسا کہ لکھا ہے۔ روی شکر کی توقعات اس کے عکس تھیں۔ اُس نے فی الحال تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن میرے خلاف اوپر والوں کے کان ضرور بھرے گا۔“

”تم ابھی با رہے اُنے والے کچھ پنڈت پجاریوں کا ذکر کر رہے تھے۔“ میں نے اُٹ کر کہا۔ ”میری بات نظر انداز نہ کرو گے۔“

”کیا تم اُن کے ناموں سے بھی واقف ہو.....؟“

”تم کس کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟“ وہ میری بات کا مقصد بھانپ گیا۔

”میں ہر دروازے کے پنڈت نول کشور کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ میرے لہجے میں نفرت اُتر آئی۔ ”وہ کالی کے بڑے مندر کا پوتا ہے۔ تم نے بھی یہ نام ضرور سنا ہوگا۔“

”وہ خود نہیں آیا.....“ مرلی نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ ”میں نے کچھ کارندے ضرور آئے ہیں۔“

”چندرا کا نام سنا ہے کبھی.....؟“ میں نے پہلو بدل کر حقارت سے پوچھا۔

”تم..... تم شاید سوگ باشی امرال مہاراج.....“

”میرے سامنے اُسے سوگ باشی اور مہاراج کہنے کی غلطی دوبارہ کبھی مت کرتا۔“ میں اُسے سے باہر ہو گیا۔ ”وہ بد بخت میرے سکون کا دشمن ہے۔ وہ درمیان میں نہ آتا تو بات یہاں تک نہ بڑھتی۔ اُس نے انسانیت کے نہیں کالی کے نام پر میرے دشمن بددی نرائی کی پشت پناہی کی تھی۔ ہندوستان کے سارے پنڈت پجاری مل کر بھی میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ پہلے بددی بھی دہتاؤں کے کھونٹے پر بڑی اُچھل کود کرتا تھا، میں نے حالت حاصل کی تو وہ حرامزادہ آنکھ پٹی کیلے لگا، چپ چپ کر وار کرنے لگا۔ میں اُسے لگانا وہ دُم دبا کر بھاگ نکلتا۔ پھر امرال نے اُس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُسی سو رکی وجہ سے میری کلدیپ کو میسور کی پہاڑیوں سے نیچے آنا پڑا۔ وہ غریب پریم لال کے استحقاق پر بھی حیران دھیان میں مصروف تھی۔ امرال نے اُس کی زندگی میں بھی پانچل چادی، زہر ٹھونک دیا۔“ میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”تم نہیں جانتے، بڑی لمبی کہانی ہے۔ بڑی دل برداشتہ داستان ہے۔ تم تفصیل سنو گے تو تمہارا کچھ بھی پیٹ جائے گا۔ صرف اتنا جان لو کہ امرال

کے قدم بھی میری کلدیپ کے مقابلے میں اکھڑ گئے تھے۔ وہ جان بچانے کی خاطر مندر میں چھپنے کے لئے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔ کلدیپ نے ہاتھ کے اشارے سے اُس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ بعد میں وہ بھی کالی کو دیئے ہوئے وطن کے پالنے کی خاطر سمیٹ چڑھ گئی۔ میں ہندوستان چھوڑ کر لندن چلا گیا۔ مجھے تمہارے دیس سے نفرت ہو گئی۔ تمہاری مٹی نے میری بہت ساری خوشیاں چھین لیں، ایک ایک کر کے مجھ سے میرے جینے کے تمام سہارے چھڑتے چلے گئے۔ میں لنت بھیج کر یہاں سے چلا گیا۔ میں اپنی مرضی سے کبھی واپس نہ آتا، لیکن ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کو میرے خلاف بھڑکا دیا گیا۔ پنڈت نول کشور جو بزدلوں کی طرح ہر دروازے میں کالی کے مندر میں چھپا بیٹھا ہے اُس نے دلوں میں زہر گھولنے کا کام شروع کر دیا۔ سورم چکا تھا لیکن اُس کی اولاد زندہ تھی..... میں چندرا کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”وہ اٹھارہ سال کا حرامی کالہ بھی پر نکال رہا ہے۔ مجھے پریم لال کی آتما نے واپس ہندوستان آنے پر مجبور کیا۔ میں یہاں گل بھڑے اُڑانے کے ارادے سے نہیں آیا، نول کشور کو سمجھانے آیا ہوں کہ اس نے مجھے چھیڑ کر اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں پر کلبازی ماری ہے۔ میں چندرا کو کبھی ایسا سبق سکھانے کا کہہ اُس کی سات پشتیں بھی کبھی جمیل احمد خاں کا نام زبان پر لانے کی غلطی نہیں کریں گی۔“

مرلی حیرت سے میری باتیں سنتا رہا، میرے جنون میں کمی نہیں آئی۔ میں نے سینہ ٹھونک کر کہا۔

”تم قانون کے نگہبان ہو۔ چاہے تم بھی نول کشور اور چندرا کے ساتھ ٹال ہو جاؤ۔ پورے ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کو آکا کو دودھ میں سر سے کفن باندھ کر آیا ہوں، میری کلدیپ کی زوجہ ابھی تک بے چین ہے۔ اُسے کون ملے گا جب میں اپنے باقی دشمنوں کو جہنم رسید کر دوں گا، پنڈت نول کشور اور چندرا کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ تمہارا دُعا آتی جی صرف کالی داس اور اوم پرکاش کی موت سے ہو گا۔ وہ مجھ سے شرطیں باندھ رہا ہے۔ کہتا ہے میں ہندوستان چھوڑ کر واپس لندن چلا جاؤں گا۔ لیکن اب اُس کی زبان کو بھی میں نے تالا لگا دیا ہے۔ پر بھو دیال کو اُس نے اجدو دھیا سے بلایا تھا۔ امان تھا

رہا کی ہفتی حرف آخر نہیں ہے، ایک ایسی قوت بھی ہے جس کے آگے ساری قوتیں بچ ہیں۔ ساری دھرتی کی مہمان ہفتیاں سر جوڑ کر بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس کا ایک بارہ ہی بہت ہے، تمام کائنات رُوتی کے گالوں کی طرح فضا میں اُڑتی نظر آئے گی۔ میں سانس لینے کے ارادے سے رُکا۔ مرلی دم بخود بیٹھا اپنے ایک نامکمل جیلے کی غلطی پر ہنسا رہا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

”روی شکر کی آنکھیں اب کھل چکی ہوں گی۔ وہ دوبارہ کوئی غلطی نہیں کرے گا۔ میری طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھنے کی گستاخی کے تصور سے بھی کانپ کر رہ جائے گا۔ تم بھی ایک ذمہ دار آفیسر ہو مرلی، حالات تم سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ تمہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ میں کس منزل کا مسافر ہوں۔۔۔۔۔ تم نے امرالال کو سورگ باشی اور مہاراج کہہ کر اچھا نہیں کیا۔ آگ لگا دی میرے سینے میں۔“

”مجھ سے بھول ہو گئی مہاراج۔۔۔۔۔“ مرلی میری خون انگھتی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا، ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”اس بار اور شاگردو، پھر ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سید کی لالچی پر انگلیاں رگڑنے میں مصروف رہا۔ ”میرا خیال ہے عدالت میری انکوائری رپورٹ کے بعد تمہارے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔“ میں نے میرا غصہ فرو کرنے کی کوشش کی۔ ”جب کوئی جرم ہی سرزد نہیں ہوا تو پھر اس بات کی۔۔۔۔۔“

میں کوئی تلخ جواب نہ دیتا تھا کہ انکارانی میرے سر پر آ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں چمکیاں سلگ رہی تھیں۔ ”یوں ہتھکڑیاں آ رہی تھیں۔“

”کوئی نئی اطلاع؟“ میں نے اُسے نامعلوم میں مخاطب کیا۔ ”جیل۔۔۔۔۔“ انکا ہونٹ چباتے ہوئے مرلی سے کہو کہ ہفتی جلدی ممکن ہو گھر پہنچنے کی کوشش کرے۔ ہر دوار سے آنے والے ایک جہاز میں اُس کے گھر کو آگ لگا دی ہے۔ اس میں پنڈت نول کشوری شرارت ہے۔ اُسے بھگوان کے کہ مرلی تمہارا ساتھ دے رہا ہے۔“

”سروجنی اور سادھنا کا کیا بنا؟“ میں نے بڑی غلج سے پوچھا۔ ”کیا وہ بھی پریشان مت ہو۔“ انکا نے کہا۔ ”مجھے اس پجاری کے من کا بھید ذرا دیر میں معلوم

کے ہنڈت کی طاقت پر۔۔۔۔۔ نتیجہ کیا نکلا؟ تم بھی اپنی نظروں سے اس کا بھیا تک انجام دیکھ چکے ہو۔ میں نے تمہارے گھر پر گرد پتاپ کے کہنے پر بسیرا کیا تھا۔ دُرگا کی مہمان ہفتی نے اُس کی بھی غلطی نہ کی۔ وہ بڑا عظیم پنڈت تھا، مہمان ہفتیوں کا مالک تھا۔ وہ دُرگا نما نہیں چاہتا تھا۔ مجھے بھی جنگ بھول کا شوق نہیں ہے۔ لیکن وہ بار بار مجھے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیتے ہیں، سکون سے ٹیکس روکتے ہیں۔ میری موت کے خواب دیکھتے ہیں۔ اب ان کی آنکھیں بھی ضرور کھل گئی ہوں گی۔ میں نے دیکھ لیا ہو گا کہ دُرگا کا سراپ بھی میری وحشتوں کے آگے بند نہیں باندھ سکا۔ گویا میرے نے کہا تھا کہ دُرگا کی بلند ہونے والی آواز نے میری ساری قوتیں سلب کر دی ہیں۔ اکیس دن اور کیس راتیں میرے اوپر بھاری ہوں گی۔ گرو نے مشورہ دیا تھا کہ میں اکیس روز تک اپنے گھر میں ایک جگہ خاموش بیٹھ رہوں۔ میں نے سروجنی کی وجہ سے تمہارے گھر کا انتخاب کر لیا۔ میں اکیس روز تک وہیں بازو سمیٹے بیٹھا رہتا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ روی شکر اور اُس کے گھر کے تمہارے گھر میں ڈال رہے ہیں۔ میں اپنی جان بچانے کی خاطر تمہیں اور سروجنی کو مصیبت میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ آکھ کھ گئی۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا، تمہیں مجبور کر کے تمہارے ذریعے اپنی گرفتاری پیش کر دی۔ میں جیل میں بھی خاموش رہا مگر روی شکر کے پالتو کتے اور زیادہ بھونکنے لگے۔ وہ میری خاموشی کو بزدلی سمجھ رہے تھے۔ مجھے مجبوراً جواب دینا پڑا۔۔۔۔۔ انسپکٹر بلیر نے زمین عقوقت خانے میں میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تم واقف نہیں ہو۔ مگر جب پانی سرے اونچا ہو گیا تو مجھے اپنی پلکوں کو جنش دینی پڑی، تین آدمی مارے گئے۔ گولیاں میں نے کئی چلائی تھیں۔۔۔۔۔ اُن کے دماغ پلٹ دیئے تھے۔ بلیر کا انجام بھی خطرناک ہوا۔“ میں اپنی وحشت پر قابو نہ پاسکا۔ مرلی نے امرالال کو سورگ باشی اور مہاراج کہہ کر میرے تن بٹا دیا۔ میں آگ لگا دی تھی۔ میں دل کی بجز اس نکالتا رہا۔ ”روی شکر نے کمپنی کی چالیں بازی شروع کر دیں۔ میں گاڑی کا رخ تبدیل نہ کراتا تو میرے ساتھ ساتھ تمہارے جسم کے چھیڑے بھی بکھر جاتے، دشمن جشن مناتے، میری لاش پر رونے والا کوئی نہ ہوتا۔ ڈی آئی نے پھر حماقت کا ثبوت دیا، پنڈت پر بھودیاں کو قربانی کا بکرا بنا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ زور کے عتاب کی مدت پوری ہونے سے پہلے میں ہاتھ پیر نہیں چلا سکوں گا۔ وہ بھول گیا تھا کہ

ہوا لیکن میں نے سرجنی اور سادھنا کو بچا لیا۔ وہ دونوں پجاری کے ہاتھ نہیں لگیں ورنہ اُس کا ارادہ نہیں تھا کہ انہیں بھی زندہ جلا دے۔ میں نے انہیں حفاظت سے مرلی کے پڑوس میں منتقل کر کے گھر پہنچا دیا ہے۔ فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

”پجاری اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”کیا تم نے اُسے بھڑکتی ہوئی آگ کا ایندھن نہیں بنایا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نے اُسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔ کل عدالت میں وہ بھی موجود ہوگا۔“ انکا کالجیہ معنی خیز تھا۔ ”اُس کا فیصلہ تم بھری عدالت میں کر لینا۔“

”کیا سوچ رہے ہو مہاراج۔۔۔۔۔؟“ مرلی نے میری خاموشی اور چہرے کے بدلنے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ہوں تا تمہارے ہاتھ سرجنی بھی تمہیں دیوتاؤں مان پوجتی ہے۔ اُس نے وقتی طور پر چپ سادھ لی ہے لیکن اندھ بھی اندھ سب رہی ہے۔ ذرا سے کچھ اور بیت جائے، پھر دیکھنا۔ وہی شکر میرے آگے پیچھے ہاتھ پاؤں نہ گھومتا پھرے تو نام بدل دیتا۔۔۔۔۔“

”کب تک ساتھ دے سکوں گے۔۔۔۔۔؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جب تک شریر اور اتما کا سبندہ قائم ہے، میں قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔“ مرلی نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

”سوچ لو۔۔۔۔۔ میرا ساتھ دینا تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ بڑے خسارے میں رہو گے۔“

”تم کوئی حکم دے کر آزما لو، میں ہر امتحان میں پورا اُتروں گا۔“

میں نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مرلی کے نقصان پر غور کرنے لگا۔ میری وجہ سے وہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

”تم دیر کیوں کر رہے ہو تمہیں؟“ انکا نے بے چینی کا مظاہرہ کیا۔

میں نے انکا کو جواب دینے کی بجائے آنکھیں کھول کر مرلی کو دیکھا، مدھم مدھم ٹھوس لہجے میں بولا۔

”شانت رہ کر میری بات سنو مرلی، میرے پاس تمہارے لئے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا، میرے دشمن اور مجھے جھکندوں پر اُتر آئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے

کہ تم میرا ساتھ دو۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔“ مرلی کسمانے لگا۔

”انہوں نے تمہارے اپارٹمنٹ کو آگ لگا دی ہے۔“ میں نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”فائر بریگیڈ والے کھڑکتے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت کچھ جل چکا، جو باقی بچے گا وہ بھی کسی کام کا نہیں رہے گا۔“

”سرجنی کا کیا بنا مہاراج۔۔۔۔۔؟“ مرلی نے ساز و سامان کی بجائے اپنی لکشمی کے بارے میں بے چینی سے دریافت کیا۔

”وہ اور سادھنا دونوں خیریت سے ہیں۔ تمہارے پڑوس ڈاکٹر کے گھر میں محفوظ ہیں۔“

”میرے لئے کیا حکم ہے۔۔۔۔۔؟“ مرلی نے بڑے حوصلے سے سوال کیا۔

”جلد بازی سے کام نہ لینا، ورنہ دشمنوں کو ہٹنے کا موقع مل جائے گا۔“ میں نے اُسے نقلی دی۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا سارا نقصان پورا کرنے کی ذمہ داری بری ہے۔“

”ایک بات اور بتا دو مہاراج۔۔۔۔۔“ مرلی نے بڑی عقیدت سے کہا۔ ”جب تم نے مجھے بند کر کے اتنی دُور سے میرے اپارٹمنٹ کو جلتے دیکھ لیا تو تمہیں یہ بھی ضرور معلوم ہو گا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔۔۔۔۔؟“

”میں نے تمہیں شانت رہنے کو کہا تھا۔ ایک دن اور صبر کر لو، وہ دشت بھی سامنے آ جائے گا جس نے تمہارے دشمن کو آگ لگانے کی بھول کی ہے۔“

مرلی نے اصرار نہیں کیا کہ اس کا مطلب کیا، پھر تیزی سے واپس چلا گیا۔ دروازے کو ہلاتا لگا دیا گیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ کھانے کے کمرے میں کوئی کڑی وردی اُترنے کی کہانی معلوم ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ اُحق بار بار ایک لپٹ کا لاکھولنے اور بند کرنے کی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔

”جیل۔۔۔۔۔“ مرلی کے جانے کے بعد انکا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”تم نے کیا سوچا ہے؟ کل عدالت عدم ثبوت کی روشنی میں تمہیں آزاد کرنے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ یہ صرف عدالت کا فیصلہ ہوگا۔ دُرگا کے مندر میں کچھ اور فیصلہ کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ وہ تمہیں جیل سے کیلکشن کریں گے۔ ہر دوار سے پنڈت پجاریوں کی جوتھوئی آتی ہے وہ بڑے اونچے سپنے

”کچھ ہے۔“

”جی ہاں نننی جیسی کوئی بچارن نہیں سمجھی نول کشور نے؟“ میں نے بے پرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”جی ہاں بھئی اہل جانا تمہاری سن پسند غذا بھی میسر آ جاتی۔“

”تم کہہ رہے ہو بھئی..... تم؟“ انکا نے بڑی خوشگوار حیرت کا اظہار کیا۔ ”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔“

میں نے جواب میں مسکرا کر انکا لال کے چہرے پر پھوٹنے والی شفق دیکھی۔ ”دو اتراتی، بل کھاتی میرے کندھے پر آگئی، بڑی لگوت سے بولی۔

”اسی طرح خوش رہا کرو..... اچھے لگتے ہو۔“

”جو پنڈت پجاری مجھ پر چال ڈالنے آئے ہیں، ان کی تعہد کیا ہے؟“ میں نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟“ انکا اٹھلا کر بولی۔ ”پریتم لال پجاریان نے اپنی کپا سے تمہاری دہائی کو جو شکٹیاں دان کی ہیں وہ کس دن کام آئیں گی؟ تم صرف کپا میں دیکھتے رہنا۔ تمہارے دشمنوں کو کچھ یاد دہ یاد آ جائے گا۔“

”اب ہمیں سے نکلنے کی بات کرو۔“ میں نے سنجیدگی اختیار کی۔ ”یہ میری منزل نہیں ہے، تم بھی جانتی ہو۔“

”ترکین اور سید غوث سے ملے بغیر چلے جاؤ گے۔“

”ہندوستان میں میرے اور بھی بہت سارے واقف کار ہیں۔ مجھے حیدر آباد بھی جانا ہے۔ رکن الدین کی عوی میں بھی کچھ جانے پچانے چہرے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔

گلبرگ پہنچ کر حضرت گیسو داڑ کے حزار پر بھی حاضری دینی ہے۔ سید مزدب سے مل کر اس کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔ کس کس کا ذکر کروں؟“ میرے لہجے میں ادائی اتر آئی۔

”میدور کی پہاڑیاں یاد ہیں تمہیں؟ وہیں پریتم لال کی کنیا میں کلدیپ نے اپنی جوانی کے دن اور امتگوں کی راتیں قربان کر دی تھیں۔ اب تو وہ جھوٹی بڑی بھی ابڑ چکی ہوگی۔ خاک اور زوول اڑ رہی ہوگی ہر سمت۔ میں وہاں بھی جانا چاہتا ہوں۔ شاید کلدیپ کی بے چین

نروں وہاں ابھی تک میرا انتظار کر رہی ہو۔ وہی میری آخری منزل، میرا آخری ٹھکانا ہوگا۔ پریتم لال کی آتما نے لندن کے ہسپتال میں مجھ سے جو کچھ کہا تھا اس کا ایک ایک لفظ میرے

دل و دماغ میں محفوظ ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ میں جل کے اُپر ہی اُپر تیرتا رہا ہوں گا۔ جل کی تہہ میں غوطہ نہیں لگا سکوں گا۔ مجھے کھٹن منزلیں سر کرنی ہوں گی۔ میں پتھر کی اتنی ٹھوس

مورتی یا کوئی ایسی آہنی چٹان نہیں بن سکوں گا جس پر زمانے کے سرد و گرم کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا ممکن ہے ٹھیک ہی کہا ہو۔ مجھے اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی

بھی نہیں ہے۔ لیکن میں اب تنگ آ چکا ہوں، جو کام جتنی جلدی پورا ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اپنی ترکین سے ضرور ملوں گا۔ اُس کے زو پ میں مجھے اپنی زکس بھی نظر آ جاتی

ہے۔ کلدیپ کا پیار بھی چھلکتا نظر آتا ہے۔ مجھے سید غوث کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جس نے ترکین کا بوجھ میرے کاندھوں سے اتار دیا تھا۔ مگر ان تمام کاموں سے پہلے مجھے پنڈت

نول کشور کے تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑنا ہے۔ وہ بیج گیا تو ہندوستان کے سر پھرے پنڈت پجاری اُس کے وجود سے میرے خلاف زہر کشید کرتے رہیں گے۔ امر لال جیسے

زہریلے سانپ کے اُس سپو لے چندرا کو کبھی ٹھکانے لگانا ہے جس نے پیدا ہوتے ہی بغیر سو پے مجھے مجھ سے دشمنی مول لی۔“

”چندرا کو بھڑکانے کی ذمہ داری بھی نول کشور پر عائد ہوتی ہے۔“ انکا نے حقارت سے کہا۔ ”یہی سب کی ذمہ داری ہے انہیں اپنے اشارے پر کچھ چلیوں کی طرح نچا رہا ہے۔“

”ایک ہی جھیلی کے پٹے بنے ہیں انکارانی۔“ میں سرد لہجے میں بولا۔ ”کوئی کم، کوئی زیادہ۔“

”تم فکر مت کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ انکا نے بڑے پیار سے میرے گال پر نرم نرم انگلیاں پھیرتے ہوئے ملی۔ ”تم بس خوش رہا کرو۔ ہنستے بولتے رہا کرو۔ سنجیدہ ہو کر جذباتی باتیں شروع کر دے۔“

”ساودھنا کی بات کروں؟“ میں نے اس کی خوشنودی کی خاطر پوچھ لیا۔ ”ہائے جیل، تم نے کس قیامت کا نام لے لیا۔ جیل بھڑک اٹھی میری۔“ انکا ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ میں سمجھ رہا تھا، وہ میری توجہ ہٹانے کی خاطر موضوع بدلنے کی خواہشمند تھی۔ میں اُس کی اداکاری پر مسکرایا۔ ”وہ اور خوشی ہے۔“

دوسرے دن مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ مرلی حسب وعدہ میرے ساتھ تھی۔ اپنی جگہ احوالات کے پیش نظر کسی دوسرے افسر کو بھی تعینات کر سکتا تھا۔ اُس کے گھر کو ذرا آتش کر

دیا گیا تھا، اُس کا عذر قابل قبول ہوتا۔ لیکن اُس نے بڑے حوصلے اور ہمت کا ثبوت دیا۔
 "جیسے کہ مجھے لگتا ہے۔ میں نے اُس کو بغور دیکھا۔ اُس کے چہرے پر گھر مل جانے
 کا کوئی طالع نہیں تھا۔"

"مرلی..... میں نے دہلی زبان میں پوچھا۔" سروجنی اور سادھنا کو کوئی نقصان تو نہیں
 پہنچا؟"

"وہ دونوں محفوظ ہیں۔ بڑی کمپا کر دی بھگوان نے۔" مرلی نے سنجیدگی سے کہا۔
 "سروجنی بتا رہی تھی کہ اگر ایک لمحے کی کوتاہی تو اس کا آگ کے شعلوں سے بچ لگنا
 مشکل ہو جاتا۔"

"سامان کا کیا بنا.....؟" میں نے آہستہ سے دریافت کیا۔
 "سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔" مرلی بے پرواہی سے بولا۔ "سروجنی کو بھی کوئی پرواہ
 نہیں ہے، مجھے بھی ملال نہیں ہوا۔ سامان کا کیا ہے، بازار سے دوسرا آجائے گا۔ سروجنی کو
 بھگوان نہ کرے کچھ ہو جاتا تو....." مرلی کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔

"وہ میرے کام لو....." میں نے اُسے سمجھایا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
 "ایک بات اور بتاؤں آپ کو....." اُس نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے
 آتشزدگی کی رپورٹ بھی نہیں لکھوائی۔"

"کیوں.....؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ایسٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بارے میں طے کر لیا جائے تو پھر تھانہ پچھری کی
 دوسری مول نہیں لینی چاہئے۔" مرلی کے لہجے میں انتقام کے شعلے جھڑک رہے تھے۔
 "سروجنی نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔"

"من رہے ہو، جیل اس ڈی ایس پی کی باتیں؟" انکا چپ نہ رو سکی۔ "کس دیدہ دلیری
 سے نقصان برداشت کرنے کی باتیں کر رہا ہے۔ جتنی مالیت کا سامان کوئلہ بنا ہے اس سے
 دوگنی رقم تو یہ ہرمینے بطور رشوت ہڑپ کر جاتا ہے۔ تعلقات بڑھانے کی خاطر آئے دن
 دعووتوں پر جو خرچ ہوتا ہے وہ الگ ہے۔ اس کے علاوہ سروجنی خود بھی کسی کسسال سے کم نہیں
 ہے۔ اُس کے چاہنے والے....."

"چپ ہو جاؤ انکارانی۔" میں نے اُسے ٹوک دیا۔ "جہاں لوگ کھلے عام بہہ رہی ہو،

وہاں کوئی بھی ہاتھ دھو سکتا ہے۔"
 "مجھے لگتا ہے زیادہ جتنا کچ جانے کی خوشی ہے۔" انکا نے معنی خیز انداز میں جواب
 دیا۔ "بیمبئی سے روانگی سے قبل تم بھی اپنی تھکن اور بدن کی کٹافٹیں اتار لینا۔ میں بھی تازہ
 دم ہوں گی۔"

"تم نے اتنی خوبصورت باتیں کہیں سے سیکھ لیں؟" میں اُس کے برجستہ جملے کی داد
 دینے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمہاری صحبت کا نتیجہ ہے....." انکا نے جھک کر سلام کیا۔
 "صحبت کا مطلب سمجھتی ہو؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ میرا مقہوم سمجھ کر
 شرابی۔

عدالت کے راستے میں میرے اور مرلی کے درمیان اس کے اپارٹمنٹ میں لگنے والی
 آگ کی بات ہوئی رہی۔ مرلی مجھے تفصیل بتاتا رہا، انکا اُس کے جملوں پر منہ بناتی رہی۔
 گاڑی عدالت کے احاطے میں جا کر رُک کر پولیس کے جوتے وہاں تعینات تھے یکدم
 ہو کر نظر آنے لگے۔ میں نے گاڑی سے باہر آکر اطراف کا جائزہ لیا، دُور دُور تک کوئی
 پلٹ یا پجاری نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے قُوب ہوا۔ انکا نے ہاتھ کا دُور کا گامندر میں ہر دوار
 سے آگے والوں نے میرے سلسلے میں عدالت کے برعکس نپلے کئے تھے۔ میں نے سر پر نظر
 ڈالا۔ انکا میں سمجھ نہیں تھی۔ شاید وہ حالات کی سن گن لینے کی خاطر چلی گئی تھی۔

پولیس کے کمانڈر نے گاڑی سے باہر نکلتے ہی مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ مرلی نے
 اثر نہ کیا، میں عدالت کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ آج مجھے صرف ہتھکڑی لگانی تھی، بیڑیاں
 لالہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھیں۔ ہم میری دشت اور جنوں کا قماشہ دیکھ چکے تھے اس
 سبب ہی برا تر آئے تھے۔

میں نے عدالت میں قدم رکھا تو سرکار کی ایک دہلی کی نظریں میری جانب اُٹھ گئیں۔
 کمانڈر نے طمانیت محسوس کی۔ اپنا سینہ اور کشادہ کر لیا۔ کمانڈر نے بتانا چاہتا تھا کہ اُن کی
 بدلتی نظریں کے مقابلے میں میری تہذیب زیادہ اہم تھی۔ مرلی نے مجھے ایک طرف بٹھا
 دیا۔ کمانڈر نے دُور، چونکداروں کی طرح میری حفاظت پر تعینات ہو گئے۔ جہاں میرا نام
 نہ آتا وہاں میں پکارا گیا۔ میں اُٹھ کر عدالت کے کٹہرے میں جا کھڑا ہوا۔ عدالت کی مشینری

”اس پر پنڈت اوم پرکاش کو قتل کرنے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔“ روی شکر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ اُس کی آواز میں گرجوٹی نام کو بھی نہیں تھی۔

”لیکن استغاثہ جرم ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔“ جج نے روی شکر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں فیصلہ لکھ چکا ہوں۔ لیکن اس کو سنانے سے پیشتر میں مجرم کے سلسلے میں آپ کی ذاتی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ کیا مجرم کے کردار کے بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے جسے آپ عدالت کے ریکارڈ پر لانا پسند کریں گے؟“

”جی نہیں۔“

”مسز روی شکر۔“ جج نے اس بار شخص آواز میں پہلو بدل کر سوال کیا۔ ”کیا آپ نے اجودھیا کے جانے مانے پنڈت پر بھودیاں کا نام کبھی سنا ہے۔“

”جی۔ جی ہاں۔“ روی شکر کسمسانے لگا۔ مرلی کے علاوہ میں بھی چٹکا۔

”مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پنڈت مہاراج دوروز پہلے بمبئی میں موجود تھے۔“ جج نے تحفظ انداز اختیار کیا۔ ”میں انہیں تلاش کرنے اور ایک ہفتے کے اندر اندر عدالت کے روبرو پیش کرنے کی ذمہ داری آپ کو سونپتا ہوں۔ کارن بہہ کہ مجھے ابھی پتہ نہیں چل سکا۔“

”جج صاحب! فون پر ایک ایسی اطلاع ملی ہے جس کے بعد پر بھودیاں کا کونج لگانا ضروری ہو گیا ہے۔“

”میں پوری پوری کوشش کروں گا پور آؤ۔“ روی شکر نے سنبھل کر کہا۔ لیکن میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے چہرے پر باقی تاثرات بڑی سرعت سے طاری ہو رہے تھے۔ کچھ اور وردی والوں نے بھی ٹپٹنا شروع کر دیا۔

”کیا آپ کو کبھی پنڈت مہاراج کے بارے میں پتہ چلے گا؟“

”جی۔ جی نہیں۔“ روی شکر نے تھوڑے تھوڑے جواب دیے۔

روی شکر کو کنبہ سے جانے کی اجازت مل گئی۔ اس نے دوبارہ ہلکی پھونک ماری، اس بار وہ لڑکھڑا کر مرلی سے نکل گیا۔ لوگوں کے لبوں پر دوبارہ تم جگمگ اٹھا۔ مرلی نے سہارا دے کر اُسے ایک خالی کرسی تک پہنچا دیا۔

عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا۔ انکارانی نے غلط پیش گوئی جنمیں کی تھی۔ جرم ثابت اور جیس پچھے گواہوں کی بے ربط گواہیوں میں کوئی وزن نہ ہونے کے سبب مجھے بالکل طور

حرکت میں آگئی۔ استغاثے کے وکیل اور اُس وکیل میں دلچسپ مکالمے بازی شروع ہو گئی۔

”جج صاحب! کلف سے مرلی نے کھڑا کیا تھا۔ میں نے ان کی بحث اور تکرار پر کوئی توجہ نہ دی۔ میں عدالت میں کھینچ بھرے ہوئے افراد کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی، میری نظریں ایک دروازے پر پڑیں۔ کڑک گئیں جو داخلی دروازے کے قریب کھڑا کسمسا رہا تھا۔ اُس نے سیدھا سیدھا میری پہن رکھا تھا لیکن چہرے پر نظر آنے والی گھٹی اور الجھی الجھی واٹھی نے اُس کی پول کوں دی۔ وہ کوئی عام انسان ہوتا تو لباس کی طرح واٹھی کی نفاست کا بھی ضرور خیال رکھتا۔ میں دل کی دلی میں مسکرانے لگا۔ مجھے اپنی قیافہ شناسی پر اعتماد تھا۔ انکارانی نے بھی بڑے یقین سے اس شخص کے بارے میں سادھو نے مرلی کے اپارٹمنٹ کو مارجس کی تیلی دکھائی تھی وہ عدالت میں موجود ہو گا۔ انکارانی نے مجھے بھری عدالت میں اُس کی تقدیر کا فیصلہ سنانے کی اجازت بھی دی تھی۔“

وکیلوں کے درمیان گرما گرم بحث کا سلسلہ ختم ہوا تو فاضل جج نے بلکھوہ صاحب روی شکر کو کنبہ سے میں طلب کیا۔ میں اُسے پہلے نہیں دیکھ سکا تھا، اُس کا نام سن کر ہونکا۔ کوئٹہ شہری قطار سے نمودار ہوا تو مجھے شرارت سمجھ گئی۔ میں نے ایک آزمودہ عمل کا مظاہرہ کیا۔ روی شکر نشستوں کے درمیان سے آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھ ماری تو وہ ایک خوبصورت مرہٹی جوان عورت سے جھگمگھا ہو گیا۔ عورت کے شوہر نے تازلیہ کہ وہ حرکت اتفاقاً نہیں تھی۔ بات عدالت سے باہر کی ہوتی تو وہ یقیناً ڈی آئی جی سے الجھ پڑتا۔ پھر بھی اُس نے بڑی حقارت سے روی شکر کو شانوں سے پکڑ کر آگے کی جانب دھکیل دیا۔ قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے من چلے لوگوں نے جملے کسے۔ لیکن جج نے آؤر آؤر کی آواز بلند کی تو سب محتاط ہو گئے۔ روی شکر جھینپا جھینپا سا نظر آ رہا تھا، بڑی مشکل سے کنبہ سے تک پہنچا۔

”کیا آپ کو جمیل احمد خاں کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔“ جج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”جی نہیں۔“ روی شکر کا جواب بڑا مختصر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ جج نے اُسے انکار کے افسانے پر کنبہ سے میں طلب کیا ہو گا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجرم کو کیوں گرفتار کیا گیا تھا۔“

پرم ہا کر دیا گیا۔ مرلی کے چہرے پر فتح کی علامتیں جاگ اٹھیں۔ اُس نے آگے بڑی کر
میرلی کی محو ل دی۔ انکا میرے سر پر آکر خوشی سے تھرکتے لگی۔

”جس نے تمہارے گھونسلے کو تیلی دکھائی تھی وہ بھی اس وقت عدالت میں موجود ہے۔
میں نے مرلی کے سرکشی کی۔

”کہاں.....؟“ مرلی کی نگاہوں میں چنگاریاں سنگتے لگیں۔

”تم اجازت دو تو میں اس کا راکر کر دوں؟“ میں نے دلی زبان میں پوچھا۔

”آپ مالک ہیں مہاراج، لیکن.....“

میں نے مرلی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ سچ ہے کہ کسی کی فائل اٹھا چکا تھا۔ میں نے
ایک نظر مشتبہ سادھو پر ڈالی، میری رہائی کا فیصلہ اس کی بیٹھائی پر متعدد سلو میں ابھرا آئی
تھیں۔ میں نے نظر گھما کر جگ کو دیکھا، پھر بڑے ادب سے اسے مخاطب کیا۔

”یور آ..... ابھی آپ نے پنڈت پر بھودیال کے بارے میں دیکھا؟“ مرلی نے مجھ سے سرکشی کی۔ ”اُسے پر بھودیال
دیا تھا کہ کون لگا کر اُسے عدالت کے روبرو پیش کیا جائے۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ جج نے مجھے غور سے دیکھا۔ اُس کی نگاہوں میں کی گالی
گلدھ ہوتے نظر آئے۔

”عدالت میں اس وقت ایک ایسا سادھو موجود ہے جو پر بھودیال کے بارے میں بہت
کچھ کہنا چاہتا ہے۔“ میں نے بہت کچھ پر خاص طور سے زور دیا۔

”تمہیں اس کا علم کس طرح ہوا.....؟“

”عدالت میں داخل ہوتے وقت وہ ایک پل کو میرے قریب آیا تھا۔ اُس نے
درخواست کی تھی کہ میں اس کا پیغام آپ تک پہنچا دوں۔“ میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ
بولی۔ انکا میرا اشارہ سمجھ کر سر سے رینگ گئی۔ میں نے مسمی صورت بنا کر اپنی بات جاری
رکھی۔ ”اس کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا یور آ۔“

مرلی حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ روی شکر کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔
میں نے جس شخص پر سادھو ہونے کا شبہ کیا تھا وہ کسی روبرو کی طرح قدم اٹھا تا عدالت
کے سامنے آ گیا۔

”تم کچھ کہنا چاہتے ہو پنڈت پر بھودیال کے سلسلے میں؟“ جج نے اُسے سر سے پاؤں

تک گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہاں سرکار۔“ پجاری ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”اگر آپ مجھے پنڈت مہاراج کے سلسلے میں
بولنے کا موقع دیں تو میں آپ کا انکار کبھی نہیں بھولوں گا۔“

”جو کچھ کہنا ہے کٹہرے میں آ کر کہو.....“ جج نے سپاٹ لپچے میں حکم دیا۔ پجاری جوا انکا
رانی کے تیز پنجوں کی چھین کے بعد اُس کے اشاروں پر عمل کرنے پر مجبور تھا، قدم بڑھاتا
کٹہرے میں داخل ہو گیا۔

”سرکار، میرا نام منوہر ہے۔ کئی ورشوں سے سورگ باشی پر بھودیال مہاراج کی سیوا کر
رہا تھا۔“ سادھو نے بسورتے ہوئے کہا۔

”سورگ باشی (جنت نصیب) کے حوالے پر جج اپنی کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ روی شکر
کے چہرے کا رنگ بھی فٹ ہو گیا۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے مہاراج.....؟“ مرلی نے مجھ سے سرکشی کی۔ ”اُسے پر بھودیال
کے بارے میں.....“

”تمنا دیکھتے رہو۔“ میں نے دلی زبان میں کہا۔ ”تالیاں بجانے کی کوشش مت کرو
وہ سب باوجود لپچے میں آ جاؤ گے۔ روی شکر کو صرف مجھ پر شبہ کرنے دو۔ وہ میرے سامنے قدم
نہیں بڑھا سکتا۔ تم نے غلطی کی تو اس کے گرجے تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”تم جانتے ہو کہ اس وقت عدالت کے روبرو کیا بیان دے رہے ہو؟“ جج نے پجاری
منوہر کو غور سے دیکھا۔

جواب میں منوہر انکارانی کے اشارے پر ریکارڈ کی طرح بچنے لگا۔ اُس نے میرا نام
درمیان سے نکال کر پنڈت پر بھودیال کی کمزوری کی بھیا تک کہانی سنادی۔ روبرو عدالت کو
بتایا کہ روی شکر نے پنڈت کو اوجودھیا سے اس کام میں ملایا تھا۔ وہ پنڈت سے کوئی ناجائز
کام لینا چاہتا تھا۔ پر بھودیال نے انکار کیا تو اسے پھر جج کے سامنے جھوٹ کر کوئلہ بنا دیا گیا۔

اس کے جسم کو خاموشی سے گڑھا کھود کر دیا گیا۔ منوہر نے اس کو لوں کے نام بھی بتائے
جنہوں نے پنڈت کی لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔ جج کی نشاندہی بھی اس کی عدالت میں موجود
افراد کیوں کی طرح جھبسنے لگے۔ سب ہی کی نظریں بار بار روی شکر اور منوہر کی جانب
اٹھ رہی تھیں۔ میں خاموش کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔

ہوں گے۔ موقع پاتے ہی ٹوٹ پڑیں گے۔ تم چاہو تو خاموشی سے اپنی جان بچا کر نکل جاؤ۔ میں اُن سے نمٹ لوں گا۔“

”نہیں مہاراج..... نہیں۔“ مرلی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”میں کار نہیں ہوں جو ڈر کر ہانگ جاؤں۔ تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔“

میں اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے کوئی پنڈت یا پجاری نظر نہیں آیا لیکن انکانے جو کہا تھا وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لازوال قوتوں کی مالک تھی۔ ”میرے دشمن ضرور کہیں قریب چھپے ہوں گے۔“ میں نے سوچا۔ انہوں نے عدالت کے باہر چھپڑ چھاڑ مناسب نہیں سمجھی ہو گی۔ وہ دُور سے چل کر آئے تھے، ہر دوار سے روانگی سے قبل پنڈت نول کشور نے انہیں میرے بارے میں تفصیل سے بتایا ہوگا۔ محتاط رہ کر پھر پور وار کرنے کی تلقین کی ہوگی۔ ممکن ہے عدالت میں بھی اُن کے ایک دو خبر موجود رہے ہوں۔ بیج کا فیصلہ سن لینے اور اپنے ایک ساتھی کا انجام دیکھ لینے کے بعد وہ اور زیادہ محتاط ہو گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت بھی باہمی مشورے میں مصروف ہوں۔ انہوں نے اپنے پروگرام میں فوری طور پر کوئی تبدیلی کر لی ہو..... اور بھی کی امکانات ہو سکتے تھے۔

”کس دپار میں تم ہو مہاراج.....؟“ مرلی نے کہا۔ ”میری ایک گاڑی مع ڈرائیور باہر موجود ہے۔ اس سے پیشتر کہ ہمیں کوئی نئی رکاوٹ درپیش ہو، یہاں سے نکل چلو۔ عدالت کے آس پاس کوئی ناک مناسب نہیں ہوگا۔“

مرلی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں کھلی جگہ میں کھڑا تھا، کسی عمارت کے فلیٹ سے چھپ کر چلائی جانے والی کوئی گولی بڑی آسانی سے میرے وجود کو چاٹ سکتی تھی۔ میں نے فوری طور پر ارتکاز اور مراقبے کی ایک مشق کی کہ مجھے ہر جہاز باغداد، پھر مرلی کے ساتھ قدم بڑھاتا عدالت کے احاطے سے باہر آ گیا جہاں ایک مٹھلائی کار پہلے سے موجود تھی۔ ڈرائیور نے دُور سے مرلی کو دیکھ لیا تھا۔ اُس نے باہر نکل کر ہمارا انتظار کیا۔ میں اور مرلی بچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اسٹیئرنگ سنبھالا۔

”کہاں چلنا ہے سر.....؟“ اُس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے مرلی سے دریافت کیا۔ ”چو پائی.....“ مرلی کا جواب مختصر تھا۔ گاڑی حرکت میں آ گئی۔ میں اُس کے والے حالات کے بارے میں غور کرنے لگا۔ انکا واپس نہیں آئی تھی۔ شاید ابھی تک وہ ہمارے منہ پر

”تمہیں اس قدر تفصیل سے تمام باتوں کا علم کس طرح ہوا.....؟“ مج نے پجاری منہ پر

”نکل رات مہاراج نے سینے میں درشن دیا تھا۔“ منہ پر بڑی عقیدت سے جموتا ہوا بولا۔ ”سب کچھ مہاراج ہی نے بتایا ہے۔ یہ حکم بھی دیا تھا کہ سرکار کے سامنے پیش ہو کر سارا کچھ بیان کر دوں۔ پھر مجھے کار کو منظور ہو.....“

عدالت نے مختلف زاویوں سے منہ پر کوٹھونے اور کیدنے کی کوشش کی، وہ ایک ہی بیان پڑھتا رہا تو عدالت کے حکم پر اُسے اور دو ہی شکر دونوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ مرلی کا ہاتھ تمام کر باہر آ گیا۔

”میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے مہاراج۔“ مرلی نے باہر آ کر کہا۔ ”یہ اچنبھا کیسے ہو گیا؟ اگر منہ پر ہی نے روی شکر کے اشارے پر میرے گھر کو چھوڑا تھا تو پھر اُس کے خلاف کیوں ہو گیا؟ پنڈت پر بھو دیال کی جلی ہوئی لاش کو کہاں دیا گیا..... یہ بات میرے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم۔ مجھے سمجھا تو مہاراج..... یہ کیا کہانی ہے؟“

”یہ چکا ر تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ میں نے سرسراہٹے لہجے میں کہا۔ ”تم نے اس سرودھنی نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی۔ تم گواہ ہو کہ میں نے خاموشی سے نکل جانا چاہا۔ تم نے میرا راستہ روک لیا۔ روی شکر اور اُس کے نادان پیپلے ہم دونوں کے خلاف ہو گئے۔ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے تو تمہارا گھر جلا دیا۔ پر بھو دیال نے بھی مجھے پہچانے میں غلطی کی۔ وہ مجھے اپنی ہمتی کے بل پر ٹھکانے لگانے کی خاطر حملے کرتا رہا، میں خاموش کھڑا اُسے سمجھاتا رہا۔ اُس نے میری بات نہیں مانی۔ میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ وہ جل کر کوئلہ بن گیا.....“ میں زہر خنہ سے بولا۔ ”میری خاطر آج عدالت سنبھالی گئی۔ روی شکر اور پجاری منہ پر دونوں موجود تھے۔ میں نے تم سے کل کہا تھا کہ ایک دن اور انتظار کر لو، جس نے آگ لگائی ہے وہ بھی سامنے آ جائے گا۔ سو وہ آ گیا۔ میں نے ایک تیر سے تمہارے دونوں دشمنوں کا بندوبست کر دیا۔ لیکن کھیل ابھی ختم نہیں ہوا۔“ میں نے انکا کی بات یاد کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”عدالت نے میری رہائی کا فیصلہ سنا دیا ہے لیکن پنڈت پجاریوں کی ایک ٹولی ہر دوار سے بھی بھیجی گئی ہے۔ پنڈت نول کشور نے اُن کے دلوں میں زہر بو کر میرے مقابلے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ کہیں آس پاس ہی مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کی خاطر گھات لگائے بیٹھے

کے سر پر سوار ہوگی۔ ممکن ہے جج نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا ہو۔ ڈی آئی جی کو حراست میں لے کر کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اُس نے یقیناً احتجاج کیا ہوگا۔ وہاں اُس کے گرے بھی موجود تھے، وہ بھی شہر کر سکتے تھے۔ وکیلوں نے بھی احتجاج کیا ہوگا۔ حالات کے پیش نظر یہ بھی ممکن تھا کہ فاضل جج نے حراست کے احکامات کو باؤس اریٹ میں تبدیل کر دیا ہو۔ روی شکر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، اپنے میدان کا مجھا ہوا کھلاڑی ہوگا۔ نہ ہوتا تو بے کلمے فیصلے کرنے کی بجائے حد میں روک دیتی۔ یہ فرائض انجام دے سکتا تھا، مجھے مروانے کا بیڑا کبھی نہ اٹھاتا۔۔۔۔۔۔ معامیرے ذہن میں ایک مثال بڑی سرعت سے ابھرا۔۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے روی شکر کے کسی جاں نثار نے پجاری منوہری کو لٹکا کر مار دیا ہو۔

”یہ تم نے لہبا راستہ کیوں اختیار کیا۔۔۔۔۔؟“ مری نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ میری توجہ بٹ گئی۔

”دوسری روڈ بلاک ہے سر۔“ ڈرائیور نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کچھ دیر پہلے ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ پولیس نے ٹریفک کا رخ متبادل راستوں کی جانب موڑنا شروع کر دیا ہے۔“ میرے ذہن میں ایک کھٹک سا ہوا۔ وہ مری کا ڈرائیور تھا تو قابل اعتماد بھی رہا ہوگا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے اُس نے جان بوجھ کر حادثے کا بہانہ تراشا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے مندا کے بتائے ہوئے ایک محل کو پڑھنا شروع کیا۔ میری نگاہوں کے آگے سے اندھیرے چھٹنے لگے۔ اصل صورت حال میرے اوپر اشاروں کنایوں میں منکشف ہو گئی۔ میں نے نظریں کھول کر ڈرائیور کو دیکھا، وہ بڑے اطمینان سے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔

”تمہارا شہ نام۔۔۔۔۔؟“ میں نے اُسے مخاطب کیا۔

”سیوک کو بچت رام کہتے ہیں۔“

میں کوئی دوسرا سوال کرنا چاہتا تھا کہ انکارانی میرے سر پر آ گئی۔ اُس کی مانوس آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”یہ جس راستے پر چل رہا ہے، اسی پر چلنے دو۔۔۔۔۔“

”لیکن میں نے۔۔۔۔۔“

”تم نے جو کچھ محسوس کیا وہ بھی غلط نہیں ہے۔“ انکا نے مچلا ہونٹ چباتے ہوئے میری

بات کاٹ کر کہا۔ ”لجبت رام کی جیب میں اس وقت وہ لمبی رقم بھی موجود ہے جو اسے بطور پیشگی ادا کی گئی ہے۔ کام ہو جانے کے بعد اتنی ہی رقم اور دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔“

”گویا یہ ہمیں موت کے منہ میں لے جا رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے سر دلچسپ پوچھا۔

”ہمیں نہیں۔۔۔۔۔۔ صرف اپنے آپ کو۔“ انکا زہر خند سے بولی۔ ”یہ منگے ہوئے نوٹوں کی گڈی بھی بڑی عجیب شے ہوتی ہے۔ انسان کو پلک چپکتے میں غداری پر آمادہ کر دیتی ہے۔ سیدھے راستے سے بھٹکا دیتی ہے، اندھا کر دیتی ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مری ابھی تک سا دھونہو ہرے سلسلے میں الجھ رہا تھا۔ کئی بار اُس نے مجھ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ روی شکر اور منوہر کا انجام کیا ہوگا؟ میں اُسے بار بار ناتا رہا۔

”مہاراج۔۔۔۔۔“ کچھ توقف کے بعد اُس کے پیٹ میں پھر مروڑ شروع ہو گئی۔ ”کیا پنڈت پر بنو دیال کی لاش برآمد ہو جائے گی؟“

”تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

”میری بات کا مطلب کچھ اور تھا۔۔۔۔۔“ اُس نے پہلو بدل کر وضاحت کی۔ ”روی شکر کے جسم کی گولیاں نہیں کھیلی ہیں، وہ بڑا گھاگ آدمی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اُس کے ہاتھ کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جرائم پیشہ افراد سے بھی اُس کے گہرے مراسم ہیں۔ اُس کے آدمی کی رفتار سے زیادہ پھر تیلے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عدالت کے کارندوں کی رسائی سے پہلے ہی وہ اسی کوکی ڈور دروازے علاقے میں لے جا کر ٹھکانے لگا دیں۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے جیل۔“ انکا نے مجھے بتایا۔ ”روی شکر نے حراست کے احکامات سننے ہی عدالت میں موجود اپنے ایک حامی آدمی کو کچھ ایسا ہی اشارہ کیا تھا کہ وہ لاش کو کہیں اور منتقل کر دے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس شخص کے ذہن کو بالکل ہی معطل کر دیا ہے۔ وہ اس وقت خود کشی کے ارادے سے کسی زلزلہ زدہ ملک کی طرف جا رہا ہوگا۔“

”لجبت رام اس وقت ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”یہاں سے دو میل کے فاصلے پر کالی کا ایک پراٹا مندر ہے۔ مندر کے ساتھ ہی کھیل کا میدان ہے جو اس وقت عام طور سے سنسان رہتا ہے۔ مندر کے قریب ہی ہرودار سے آنے والی پنڈت پچاریوں کی ٹولی موجود ہے۔ کسی زمانے میں لجبت رام بھی ہرودار میں رہا

کرنا اسی لئے آسانی سے یک گیا۔“

”اُن کی تعداد کیا ہوگی.....؟“

”تم یہ سوال پہلے بھی کر چکے ہو۔“ انکا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اُس بار تم کچھ نہیں بولو گے، صرف تمنا دیکھو گے۔“

”پریتم لال نے کیا کھوں کہا ہے.....؟“ میں نے اُسے معنی خیز نظروں سے گھورا۔

”کچھ دیر اور صبر کرلو، اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔“

گاڑی کچھ دیر بعد انکا کے بتائے ہوئے چلنے والے اوڈنڈ میں داخل ہوئی تو مرلی بھی چونکا۔ اُس کے چونکنے کی وجہ بھی پنڈت پجاریوں کی وہ چٹائی چوڑی تھی جو کالی کے پرانے مندر کے قریب موجود تھی۔ اُن کی تعداد پندرہ میں سے زیادہ نہیں تھی لیکن اُن کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ مارنے یا مرنے کا فیصلہ کر کے آئے تھے۔ گاڑی دیکھتی ہی وہ ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی آنکھوں سے خون اُٹنے لگا۔ لُجبت رام نے گاڑی روک لی۔

”گاڑی کیوں روک دی تم نے.....؟“ مرلی چیخا۔ وہ موقع کی نزائش کر رہی تھی۔

بوکھلا گیا تھا۔

”گاڑی اس نے نہیں، لوٹوں کی اس گڈی۔ زروکی ہے جو اس کی جیب میں پڑی ہے۔ یہ حرام خور بھی یک گیا.....“ میں نے سر دلچھے میں کہا۔ لُجبت رام نے جیب سے ریو اور نکال کر میرے اور مرلی پر تان لیا۔

”یو باسٹرڈ.....“ مرلی تمللانے لگا۔

لُجبت رام گالی سن کر بھنا گیا۔ اُس نے فائر کرنے میں غلبت کا مظاہرہ کیا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ کوئی حماقت کا ثبوت دے گا۔ لیکن انکارانی کی دُور رس نظریں اُس کے دل کا بھید تاڑ چکی تھیں۔ فائر کی یکے بعد دیگرے چار آوازیں سنائی دیں لیکن ریو اور سے لگی ہوئی گولیاں بچھلی نشست تک فاصلہ بھی نہ طے کر سکیں، درمیان میں ہی بے اثر ہو کر ہمارے قدموں پر گر گئیں۔ خود لُجبت رام بھی دم بخود رہ گیا۔ انکا میرے سر پر بیشی مٹا رہی تھی۔

مرلی کی حالت فائر کی آوازیں سن کر غیر ہو گئی تھی۔ لیکن اُس نے لُجبت رام کو پانچویں گولی چلانے کا موقع نہیں دیا، برق رفتاری سے اٹھ کر سیدھے ہاتھ کا پھندا اُس کے گلے میں ڈال کر اتنی تیزی سے دو تین شدید جھٹکے دیے کہ لُجبت رام اگلی سیٹوں پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ شاید

اُس کی گردن کا منکاوٹ گیا تھا۔ انکا میرے سر پر کھڑی کلبوں پر ہاتھ رکھے مسکراتی رہی۔ پجاریوں نے گاڑی گھیر لی۔ مرلی بچ و تاب کھانے لگا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی، خود روزہ کھول کر باہر نکلا۔ میرے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا، میں اردکا زاور مرا تے کا مکمل کر چکا تھا، ایک اشارہ کرتا وہ سب اوندھے منہ زمین پر ڈھیر ہو جاتے۔ لیکن میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ انکارانی کو پریتم لال نے کیا کیا حکمتیاں دان کی تھیں؟ مجھے سامنے دیکھ کر ایک بھاری ذہل ڈول کا پجاری سیدھا تانے آگے بڑھا۔ اُس کی نگاہوں میں شعلے بھڑک رہے تھے، مجھے حقارت سے گھورتا ہوا بولا۔

”تو تم جو جیل احمد خاں؟ پنڈت مہاراج کی زبانی سنا تھا کہ تم نے بڑی دھوم مچا رکھی ہے۔ تمہاری وجہ سے ہمارے کئی دھرماتما پر لوک سدھار گئے۔ پرنتو میری نظریں تو کچھ اور دیکھ رہی ہیں.....“

”تم شاید نول کشور کی بات کر رہے ہو.....؟“ میں نے سپاٹ لیچے میں پوچھا۔ انکا بدستور میرے سر پر کھڑی رہی۔

”زبان کو قابو میں رکھ پانی، تیرے گندے منہ سے مہاراج کا پوتر نام دوبارہ نکلا تو جلا کر کھانک کر دوں گا۔“ اُس کے تیز خطرناک ہو گئے۔ اُس کے باقی ساتھی بھی بل کھانے لگے۔ مجھے اُس کی جوانی پر رحم آنے لگا۔ دو چار جتنز متز سکھ کر وہ بڑا گھمنڈی بن گیا تھا، جیل احمد خاں کے سامنے سیدھا تانے کھڑا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی حماقت کر رہا تھا۔ شاید نول کشور نے اپنے آدمیوں سے میرا مکمل تعارف نہیں کرایا تھا۔ وہ اگر میرے ماضی کی داستان کے ایک حصے سے بھی واقف ہو جاتے تو شاید کبھی میرے سامنے آنے کی غلطی نہ کرتے۔ میرے سامنے میں نول کشور کے خلاف طوفان کروٹیں لینے لگا۔ وہ بد بخت کالی کے مندر میں چھپا بیٹھا تھا میرے مقابلے میں نوجوان اور تاباں سمجھ بکاریوں کو آگے بڑھا رہا تھا۔ شاید مجھے نل و عار تھا کہ میں اُلجھا کر کوئی نئی چال چلنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

”میری بات دھیان سے سنو بالک.....“ میں نے اُس کو جوان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میرا اتہارا کوئی بھگڑا نہیں ہے۔ میں خون خرابے سے بچنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ بار بار مجھے کیوں اُکساتے ہو؟ تم سے جو کہا گیا ہے وہ جھوٹ ہے، جو کہانیاں سنائی گئیں ان میں

کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تم نے سن لیا ہوگا کہ سرکاری عدالت نے مجھے کالی واس اور ام کے قتل کے سلسلے میں بری کر دیا ہے، تم مجھے کس بات کی سزا دینے کی خاطر گھیر رہے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بکاڑا ہے.....؟ پولیس بھی بار بار مجھے شے کے طور پر پکڑ لیتی ہے، پھر دودھ کا دودھ دلی گائی ہو جاتا ہے۔ عدالت کے فیصلے کے علاوہ یہ بات بھی تمہارے علم میں آگئی ہوگی کہ پرنسپل پرمودیال کی بھینک موت میں روی شکر کا ہاتھ شامل ہے۔ بیماری منو میرا نہیں، تمہارے ہاتھ کا آدی ہے۔ اُس نے عدالت کے زور و جویان دیا ہے وہ سچ ہی ہوگا۔ روی شکر کو رات میں لے لیا گیا ہے۔ تفتیش ہوگی تو نتیجہ بھی تمہارے سامنے آجائے گا..... تم لوگ بڑا جھوٹا یہ جان کے پیچھے کیوں پڑے ہو؟“

”تم ہمیں کیا سمجھانا چاہتے ہو بھگتا بھگت؟“ اُس نے مجھے حقارت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”کیا مہاراج نول کشور نے جو کہا ہے وہ سب جھوٹ ہے؟“

”ہو سکتا ہے تجربوں نے اُسے بھی غلط بات بتائی ہو۔“ میں نے اُس کا غصہ منہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم تو جوان ہو، سمجھدار معلوم ہوتے ہو۔ تم نے جو دیکھا، جو سنا وہ سب سچا کر پنڈت نول کشور کو بتا دو۔“

”مضرو بتا دیں گے۔“ اُس نے جیسے انداز میں جواب دیا، پھر سینہ پھلا کر بولا۔ ”ایک شرط ہے..... تمہیں بھی ہمارے ساتھ ہی ہر دو اور چلنا ہوگا۔“

”مجھے وہاں لے جا کر کیا کرو گے.....؟“

”وہاں تمہاری آؤ بھگت وحم وحم سے کریں گے۔ تم سے یہ بھی معلوم کریں گے کہ بدری نرائن مہاراج کو کس دشت نے مارا تھا؟ یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے، مہاراج امر لال کو جس سندری نے مندر کی سیر جیوں پر ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، اس کا اصل کارن کیا تھا؟ اُس سندرنار اور مہاراج کے درمیان کیا سبب بند تھا؟“

”چپ ہو جاؤ.....“ میں کلدیپ کی شان میں اُس کی گستاخی برداشت نہ کر سکا تو چیخ پڑا۔ ”اپنی گندی زبان پر تالے لگا لو۔ میں سمجھ گیا تمہارے ذہنوں، تمہارے دلوں میں جو ہر بویا گیا ہے اس سے سینا پھل کا درخت نہیں اُگ سکتا، بیول کے کانٹے ہی پیدا ہوں گے۔ میری بات مان لو، میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔ مجھے مت چھٹرو، تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ مجھ سے اُنھنے کی حماقت نہ کرو، اسی میں تمہاری کتنی ہے۔“

”اور کوئی بھاشن دینا چاہتے ہو تو وہ بھی دے ڈالو۔ اس کے بعد ہماری باری ہوگی۔“ اس نے بدستور میری حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے طفلانہ انداز میں بات کی۔ ”یہ بھی جان لو کہ جب ہم یوں شروع کریں گے تو تمہیں بھاگے راستہ نہیں ملے گا..... کیا سمجھے؟“

میں غصے کے باوجود مسکرا دیا۔ پنڈت نول کشور نے اُن کے ضمیر میں جو ہر گھول دیا تھا وہ ان کے وجود سے علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مرلی میری ہدایت کے مطابق ابھی تک کار کے اندر ہی بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ ایک دو بار اُس نے بغلی ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، میں نے اشارے سے روک دیا۔ انکا بدستور میرے سر پر کو لمبے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ میرے ہونٹوں پر زہر میں بھی مسکراہٹ ابھرتے دیکھ کر بولی۔

”اب کیا خیال ہے جمیل صاحب؟ کچھ اور سننا چاہتے ہو ان لوگوں سے یا میں اپنا کام شروع کروں.....؟“

”چپ کیوں ہو گئے خاں صاحب؟“ گہرو جوان کی موت اُس کے سر پر منڈلانے لگی۔ وہ بد بخت میرا مذاق اڑانے کی غلطی کر رہا تھا۔ اُس کا لہجہ بڑا تحقیر آمیز تھا۔ ”ابھی تو تمہاری زبان فر فر چل رہی تھی۔ بڑے الال پہلے ہو رہے تھے۔ اب مسکرا کر کیا ثابت کرتا ہے.....؟“

میرے جسم سے چیونٹیاں لپٹ گئیں۔ میں انہیں موت کے جہنم میں نہیں دھکیلنا چاہتا تھا، پندرہ بیس پچاسی اور مردہ پائے جاتے تو بات دھکی چھپی نہ رہ سکتی، پورے ہندوستان میں تہلکہ مچ جاتا۔ میرے دل میں پھر دو اور دو چار کرنے بیٹھ جاتے۔ اُن کے ذہنوں میں یہ خیال ضرور سر ابھارتا کہ میری موت کے فوراً بعد ہی پچاسی کس طرح جہنم رسید ہو گئے؟ وہ پچاسیوں کے قتل سے پھر میرا رشتہ جوڑ دیتے۔ پھر مجھے آہنی زور پہنا دیتے جاتے۔ میری طاقت مجھے مل چکی تھی، ڈرگا کا عتاب سینے سے لپٹ گیا تھا۔ میں چپ نہ رہتا۔ میری دشتوں میں پھر ابال آ جاتا۔ میں جنون کی حالت سے دو چار ہو کر پھر دیوانگی کی کرکٹیں شروع کر دیتا۔ بات بڑھ جاتی۔ انکارانی کی نصیحتیں دھری کی دھری دھرتیں۔ پریم لال کا کہا سچ ہو جاتا کہ میں جل کے اُپر ہی اوپر تیرتا رہوں گا۔ میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا کوئی جواب دینے کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ انکا دل پری۔

”اب تم خاموش ہی رہنا جمیل۔“ اُس کے تیور یکفٹ خطرناک ہو گئے۔ ”یہ لاتوں کے

بھوتوں، باتوں سے نہیں مانیں گے۔ پریم لال مہاراج نے بھی ہلکتیاں دان کرتے وقت یہی کہا تھا کہ جب چاروں سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جائے، کچھ اور نہ بھائی دے تو پھر میں اس کے کھائے ہوئے نسخے استعمال کر سکتی ہوں۔

”سوچ لو انکا (کلی)“ میں نے کہا۔ ”خون خرابے پھر میری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں گے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا..... تم فکر نہ کرو، خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہو۔“

”کیا کالی کے پوتر کندھوں پر نظر کرنے والا کوئی تاگ دیوتا تمہیں سونگھ گیا؟“ نوجوان کے حوصلے میری خاموشی سے بڑھنے لگے۔ اُس کے منہ بھی شیر ہونے لگے۔ وہ نادان اپنے انجام سے بے خبر تھے۔ نوجوان اپنے گھمنڈ میں بولا۔ ”کچھ بولو جیل احمد خاں، چڑیوں کی طرح چپکو۔ بلبل کی طرح چھدکو۔ مینڈک کی طرح چھٹکیاں مارو۔ کوئی آخری ہتھا ہوتو وہ بھی کہہ ڈالو، من میں کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے۔“

انکارانی انگوروں پر لوث رہی تھی۔ نوجوان کی استر انیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ چپکے چپکے کی پلکوں نے تیز تیز چمپکا شروع کر دیا۔ پھر جو کچھ ہوا اس نے مرلی کے علاوہ کسی کو ششدر کر دیا۔ نوجوان کھڑے کھڑے چپکا کر گرا، پھر قلابازیاں کھاتا ہوا کالی کے پرانے مندر تک چلا گیا۔ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کئی پراسرار قوتیں مل کر اُسے شو کریں مار رہی ہوں۔ اُس کی حالت دیکھ کر باقی پجاری بھی آنکھیں پٹ پٹانے لگے۔ مرلی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ انکا کی نظریں بدستور اُسی نوجوان پجاری پر مرکوز تھیں جو مندر کے پاس چاروں شانے چت پڑا تھا۔ وہ اُسے ایک لمبے غضبناک نظروں سے گھورتی رہی، پھر اُس نے اپنے گلابی ہونٹوں کو دائرے کی شکل دے کر زور سے پھونک ماری تو نوجوان پجاری کا جسم اس طرح شدید جھٹکے کھانے لگا جیسے بجلی کے ننگے تاروں میں اُلجھ گیا ہو۔ اذیتوں کی انتہا سے دو چار ہونے کے باوجود اُس کے حلق سے کوئی چیخ نہیں نکل رہی تھی۔ چند لمحوں میں وہ بے جان ہو گیا تو انکا نے دونوں ہاتھ آسمان کی سمت بلند کر دیے، سیاہ آندھی کا گولا بھنورنے کی صورت میں آسمان سے برق رفتاری سے نیچے آیا، پل بھر میں نوجوان کو لپٹ کر غائب ہو گیا۔ نوجوان پجاریوں کی ٹولی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اپنے گرو کا انجام دیکھ کر ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔

”مہاراج.....“ مرلی نے میرا بازو تھام لیا، خوفزدہ آواز میں پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟ کیسے ممکن ہو گیا؟“

”اپنی زبان بند ہی رکھنا۔“ میں نے گھبر لہجے میں کہا۔ ”کسی اور نے سنا تو تمہیں پاگل ہی سمجھے گا۔“

”جو آگیا (حکم) مہاراج.....“

”جیل.....“ انکا نے بھاگتے ہوئے پجاریوں کے بارے میں سوال کیا۔ ”کہو تو ان کو بھی سیاہ آندھی کی چکی میں چیں کر رکھ دوں؟ ان کے گندے وجود بھی ذرات بن کر فضا میں بکھر جائیں گے۔“

”نہیں..... انہیں جانے دو۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”نول کشور شاید ان کی زبان سمجھ لے۔“

”خیال ہے تمہارا.....“ اُس نے ہونٹ کانٹے ہوئے کہا۔ ”وہ کلر کا بیج شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے تمہیں اُلجھانے کی خاطر کر رہا ہے۔ تم دیکھنا، میں اُسے جیسی سزاؤں گی۔ ایک بار منڈل سے باہر آئیے دو۔“

”مہاراج.....“ مرلی نے ڈرائیور کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے اس کے سلسلے میں پوسٹ کو اطلاع دینی ہوگی۔“

میں نے مرلی کو جواب دینے کی بجائے انکا کی طرف دیکھا، وہ میرا اشارہ سمجھ گئی۔ میں نے مرلی کو باتوں میں لگا لیا، انکارانی کی پراسرار قوت نے لہجہ رام کی لاش بھی غائب کر دی۔ میں نے میدان صاف دیکھ کر مرلی کو مخاطب کیا۔

”کیا ڈرائیور کے سلسلے میں پوسٹ میں ڈاکوٹ درج کرانی ضروری ہے؟“

”اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔“ وہ سنہیل کر بولا۔ ”میں دشمنوں کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔“

”لہجہ رام کہاں کا رہنے والا تھا.....؟“

”جو پندرے تعلق ہے اُس کا۔ اُس کے گھروالوں کو بھی اطلاع دینی ہوگی۔“

”پریشان مت ہو۔“ میں نے بے پرواہی سے کہا۔ ”لہجہ رام خود ہی اپنے گھر چلا گیا ہے۔ تم چاہو تو اُس کے اچانک غائب ہوجانے کی اطلاع کر دینا۔ خاندانی ہو جانے کی۔“

مرلی نے میرا جواب سن کر کھڑنگ سیٹ کی سمت دیکھا تو آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔ اس کے کوئی سوال نہیں کیا، سمجھ و ادراک اس لئے جان گیا کہ اس کا ڈرائیور بھی ماورائی قوتوں کا شکار ہو گیا۔

”ذہن پر زور دے دو، مرلی، برو دیکھا ہے اسے بھلا دو۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”جب تک میرا ہاتھ تمہاری پشت پر ہے، کسی بات کی فکر مت کرو۔“

”مہاراج.....“ اُس نے بڑی حقیقت سے میرے سامنے ہاتھ جوڑ لئے، رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مجھے بھول مت جانا۔ ایک لمحہ کی برائت میں ضرور یاد رکھنا۔ تمہاری بڑی کرپا ہوگی۔“

میں جواب میں مسکرا دیا۔ مرلی نے اسٹیئرنگ سٹیل کی گاڑی پھر چل پڑی۔ انکا میرے سر پر بائیں کروٹ لیٹ گئی۔ اُس نے اپنا سر کھپی پر تکیا رکھا۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے، نشیلی آنکھوں سے تختگی باندھے بری طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے انکارانی.....؟“ میں نے اُس کی مخمور نگاہوں کے شور مچا دیا۔

”سر سرائی آواز میں پوچھا۔“ اُسے غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟“

”سوچ رہی ہوں کہ تم کچھ کچھ تجسوس ہوتے جا رہے ہو۔“ اُس کا انداز دلبرانہ تھا۔

”میں سمجھا نہیں.....“ میں نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔

”پریم لال مہاراج نے مجھے جو ہتھکڑیاں دان کی ہیں تم نے اس کی کوئی تعریف نہیں کی۔“ اُس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”تم اس کا موقع کہاں دے رہی ہو.....؟“ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بڑی اچانکیت کا اظہار کیا۔ ”تمہاری کافر ادائیں دیکھوں یا پریم لال کی قوتوں کی تعریف کروں.....؟“

میری بات سن کر وہ بڑے محبوبانہ انداز میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ کانوں میں اگلیاں گھما کر قاتلانہ انداز میں بولی۔

”ایک بار پھر کہنا جیسٹل، میں پوری توجہ سے تمہاری بات نہیں سن سکی۔ کیا کہہ رہے تھے تم.....؟“

”مہاراج، ایک درخواست کروں، انو گے.....؟“ مرلی نے مجھے مخاطب کیا تو انکا نے

جل کر کہا۔

”اس وقت یہ کباب میں بڑی بن کر ہمارے درمیان کہاں سے آگیا..... نرنگ رہا ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“ میں نے انکا کے چہرے پر نظریں جمائے جمائے مرلی سے پوچھا۔

”جب تک ہمیں میں رہنا، مجھے اور سرور جی کو سیوا کرنے کے حق سے محروم نہ کرنا۔“ وہ لاجبت سے بولا۔ ”ہمارے دو ارچھوڑ کر کہیں اور جانے کی بات نہ کرنا.....“

”ہمیں میں اب میرا قیام بڑا مختصر ہوگا۔“ میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”ہو سکتا ہے ایک رات سستا کرکل ہی کسی اور طرف نکل جاؤں۔“

”مجھے اپنے ساتھ نہیں لے چلو گے.....؟“ اُس نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ”تمہارا ہاتھ بٹاتا رہوں گا۔“

”میری وحشتوں میں کہاں اُلجھتے بھرو گے مرلی، مجھے بہت سارے ادھورے کام پورے کرنے ہیں۔ کسی سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہے، کسی کی بے چین روح کو قرار پہنچانے کی خاطر سختیوں مرحلوں سے گزرتا ہے۔ میری کوئی منزل نہیں، کوئی ٹھکانا نہیں۔“ میں نے سر آہ بھر کر جواب دیا۔ ”تم دیکھ چکے ہو میرے دشمن سائے کی طرح میری زندگی کے ساتھ ساتھ لے جاتے ہیں۔ تمہارے دیس کے پنڈت پجاری میری جان کے لاگو ہیں۔ وہ برسوں سے اپنے دامن میں کر رہے ہیں۔ اُن کا بس نہیں چلنا ورنہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح میرے جسم سے لپٹ جاتے۔ مجھے مجبور کرکڑے کرڈالیں۔ دو گز زمین کا ٹکڑا بھی نصیب نہ ہونے دیں۔ میں جتنا دھوکا کھا چاہتا ہوں وہ اتنا ہی میری مانگوں سے لپٹ کر اپنے درمیان کھینچ لاتے ہیں۔ مجھے لپٹ چلاؤ کی خاطر پھر ہاتھ پاؤں چلانا پڑتا ہے۔ میری زندگی کی داستان بڑی طویل، بڑی دردناک ہے۔ کبھی موت سے فرصت ملی تو اطمینان سے نڈاؤں گا۔“

مرلی خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ گاڑی مختلف سمتوں سے گزرتی رہی۔ چوپائی کی دو عایشان عمارت قریب آگئی جس میں مرلی کا پارکسٹ تھا۔ گاڑی پارکنگ لائن میں ہارکڑی، مرلی نے تیزی سے نیچے اتر کر میرے لئے دروازہ کھولا۔

”جیسٹل.....“ انکا نے مجھے مخاطب کیا۔ ”یاد ہے تمہیں.....؟“ تم نے مرلی سے کوئی وعدہ

کیا تھا؟

”یہ تو.....؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے مرلی کے اپارٹمنٹ میں آتشزدگی سے ہونے والے تمام نقصانات کو پورا کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔“

”ابھی مجھے پرانے سسٹم کے کتبے پختہ کر لینے دو، مرلی سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کر دوں گا۔“

”ایک نظر اس جگہ پر پڑا تو میں دلچسپی سے پیچھے ہٹ کر کھنڈر بنا دیا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مرلی مجھے ہاتھ دے کر لگنے لگی کی سست قدم اٹھانے لگا۔ وہ

مجھے بتا رہا تھا کہ اُس نے ڈاکٹر کے اپارٹمنٹ میں محض ایک رات گزار لی تھی سرجنی کے

اصرار پر صبح ہوتے ہی ڈیکوریٹڈ (DECORATED) اپارٹمنٹ کے چاحال کر لیا تھا۔

”اپارٹمنٹ جل جانے سے تو تمہیں لاکھوں کا نقصان ہوا ہوگا۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”اس کی پچتاہٹ کرو مہاراج.....“ مرلی نے میری بات کا مفہوم بھانپ لیا۔ ”تمہاری

کرپا سے بھگوان کا دیا بہت سارا دھن موجود ہے۔“

”میں تمہارے جگہ ہوئے اپارٹمنٹ کو دیکھنا چاہوں گا۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔

”خواہوں کی اس جنت کو غلاموں نے کس طرح چھوٹ ڈالا۔“

”جیل..... میں ابھی آتی ہوں۔“ انکا نے کہا پھر میرے سر سے اتر گئی۔ شاید اُس نے

آس پاس منڈلاتے ہوئے کسی خطرے کو دیکھ لیا تھا۔

”میں نے ٹھیکیدار سے بات کر لی ہے۔“ مرلی نے لا پرواہی سے بتایا۔ ”بس ایک مہینے

کی بات ہے، سب کچھ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔“

میرے اصرار پر مرلی مجھے اس منزل پر لے گیا جہاں اُس کا اپنا اپارٹمنٹ تھا۔ وہ بڑے

اطمینان سے قدم اٹھا رہا تھا۔ لیکن اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر چونک اٹھا۔ مجھے بھی اس

دروازے کو دیکھ کر ڈکھ ہوا جس کا رنگ پر باد ہو چکا تھا۔ آگ کی تپش اور دھوئیں کی کلوں

نے اس کی ساری شان و شوکت آجاذ دی تھی۔ محل میں ٹاٹ کا بیوند لگ رہا تھا۔

”یہ..... یہ آج تک نہیں تھا۔“ مرلی نے مجھے آگاہ کیا۔ ”شاید ٹھیکیدار نے کام شروع

کر دیا ہے۔ پرانا دروازہ اس لئے لگا دیا ہوگا کہ کسی چوکیدار کی ضرورت نہ پڑے۔“

مرلی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولنا چاہا، میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ مجھے وضاحت

طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں انکارانی کا تصور کلبلانے لگا۔ میرا اُس کا

ساتھ چوتھائی صدی سے زیادہ پر محیط تھا۔ میں اُس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ لفت

میں میرے سر سے اتر گئی تھی، اُس نے مجھے مرلی کا نقصان پورا کرنے کا وعدہ یاد دلایا تھا۔

اُسی کا مشورہ تھا کہ میں جگہ ہوئے فلیٹ کو بھی ایک نظر دیکھ لوں، اور مرلی پرانے دروازے

کو لگا دیکھ کر کہہ رہا تھا کہ شاید ٹھیکیدار نے کام شروع کر دیا ہے۔ مجھے دروازے کی دوسری

طرف بھی انکا اور پریتم لال کی پراسرار اور ناقابل یقین قوتوں کا ہاتھ محسوس ہوا۔ میں نے

انکا ز اور مراتب کے مختصر عمل سے گزر کر آنکھیں بند کر لیں۔ راستے کی زکا وٹیں ایک

کر کے سر کھٹک لگیں۔ میں اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے ہونے کے باوجود دروازے سے گزر کر

اندر پہنچ گیا۔ وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ ہر شے اپنی اصلی حالت

میں موجود تھی۔ مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ پریتم لال نامکھن کو ممکن بنا دینے کی قوتوں کا مالک

تھا۔ میری خاطر اُس نے انکا کو کچھ طاقتیں سونپ دی تھیں۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، وہ

غائب نہیں تھا۔ انکارانی نے مجھے بھی تاریکی میں رکھ کر حیرت زدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے سسر آکر آنکھیں کھول دیں۔

”تمہارے کپڑے گئے مہاراج.....؟“ مرلی نے پوچھا۔ ”آنکھیں بند کئے کیا سوچ

رہے تھے؟“

”اب کسی ٹھیکیدار کی ضرورت نہیں رہی۔“ میں نے ٹھوس آواز میں کہا۔ ”صرف باہر کا یہ

دروازہ بدلوا دینا۔ ایک دو مہینے بعد..... جلدی نہ کرنا۔ ورنہ تمہارے جاننے والے تمہیں

بھگوان کا اوتا رسیجھ کر تمہاری پوجا شروع کر دیں گے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ مرلی ہلکی سی ہنسی سے کہا۔ ”میں ہی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔“

”سرجنی اور سادھنا کو بھی سمجھا دینا کہ اپنی زبان بند کر لیں۔“

”کس سلسلے میں؟“ مرلی کی حیرت عروج پر پہنچ گئی۔ ”مجھے بھی جلد مہاراج، تمہاری

نظروں نے کیا دیکھ لیا ہے؟“

انکا میرے سر پر واپس آ گئی۔ بڑی سنجیدہ و سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

”انکارانی.....“ میں نے اُسے عالم تصور میں مخاطب کیا۔ ”آج تم سے کچھ نئے کول

جانتا ہے۔ میری بات سے انکار تو نہیں کرو گی؟“

”تو تعجب دو جیس.....“ اس نے بڑی سعادت مندی کا اظہار کیا۔

”بعد مجھے تمہاری ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“ میں ایک سرود آہ بھر کر جذباتی لہجے میں بولا۔ ”تم جس قدر وقامت کی ہو، جہاں ہو، جیسی بھی ہو، کی بنیادوں پر ایک رات کے لئے میری آنکھوں کی دیکھت بننے کے لئے اپنی آمدگی کا اظہار کرو۔“

”بے شرمی کی باتیں مت کرو۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شونی سے کہا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں کہ تم نیلام سے شہنشاہ کی والی زبان کیوں استعمال کر رہے ہو.....؟ تم نے شاید اندر کی حالت دیکھ لی ہے، تمہاری آنکھیں کھل چکی ہیں۔“

”تم کہاں کھو گئے مہاراج؟“ مرلی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”میری بات کا جواب بھی نہیں دیا۔“

”تمہیں یاد ہوگا، میں نے اپارٹمنٹ میں لگنے والی آگ کی خبر نہایت جلد بتا کر تمہارا انتہا پورا کرنے کی ذمہ داری میری ہو گی۔“

”کیوں شرمندہ کر رہے ہو؟“ مرلی نے میری بات سے خوش ہو کر انکساری لہجے میں اب اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ تیس چالیس لاکھ کا دھچکا نہ برداشت کر سکوں۔ مایا کو آنی جانی شے ہے، تمہاری دعا ہوگی تو کروڑوں کمالوں گا۔“

میں نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے سے چند شرمزدہ جی کو بھی بلوایا۔ سادھنا بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ انکا کی نظریں سادھنا کے گدرائے ہوئے جسم پر پھلتے لگیں۔ مرلی نے میرے کہنے پر دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر دیا۔ مرلی کے علاوہ سادھنا بھی پچھلی پچھلی نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ سرود جی کی کیفیت سب سے مختلف تھی۔ اُسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اپارٹمنٹ کا سارا ساز و سامان، کھل سیٹ اپ بالکل ویسا ہی تھا جیسے ہوا کرتا تھا۔ سرود جی پھر کی طرح ایک ایک کمرے میں چکر لگا کر پھر رہی تھی۔ ہر شے کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہی تھی، بار بار حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

”دیکھ رہے ہو جیس..... دولت کی چمک دمک انسان کی نگاہوں کو کس طرح خیرہ کر دیتی ہے۔“ انکا نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سرود جی پورے اپارٹمنٹ کا جائزہ لے کر آئی تو اُسے احساس ہوا کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ وہ بے اختیار دوڑ کر میرے قدموں میں گر گئی۔ میں نے اُس کو بازو تھام کر اٹھایا۔ وہ ہاتھ ہاتھ کر بولی۔

”مہاراج، میں نے پہلے بھانپ لیا تھا کہ تمہاری عشق اپیم پار ہے۔ ہم تمہارا شکریہ کس زبان میں ادا کریں؟ تم نے جو احسان کیا ہے وہ ہم سارا جیون نہیں بھلا سکیں گے۔“

سرود جی کی دیکھا دیکھی مرلی نے بھی میرے پیروں کو چھو کر اپنا فرض پورا کر دیا۔ سادھنا الگ تھلک کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُس کی تنہائی کا احساس ہوا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا کر اُسے گلے لگا لیا۔ اُس کی کنول جیسی نظروں میں آنسوؤں کے شبنمی قطرے جھلکانے لگے۔ سرود جی کی آنکھیں سلگ اٹھیں۔ اُس کا پس چلتا تو شاید سادھنا کو اسی وقت گولی مار دی۔ میں اُس کی نظروں میں رقابت کے جذبات کو کروٹیس بدلتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے سادھنا کو اپنی ہانہوں کے حلقے سے آزاد کیا تو سرود جی نے سکون کا سانس لیا۔ ”میں آج رات اسی اپارٹمنٹ میں گزاروں گا۔“ میں نے سرود جی سے کہا۔ ”کل صبح کہیں اور چلا جاؤں گا۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گے مہاراج.....“ سرود جی نے قریب آ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”اب اُسے ہوتا کچھ دن ہمیں سیوا کرنے کا موقع دو۔“

”ابھی دن دو بجتا ہے۔ پھر بھی آیا تو کچھ دن ضرور آرام کروں گا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

سرود جی اور سادھنا نے میرے کھانے کا اہتمام کیا۔ میں اسی کمرے میں آ گیا جہاں پہلے مقیم تھا۔ مرلی میرے ساتھ ساتھ کھانا کھانا اور شام کی چائے ہم نے ساتھ ہی پیوئے کرنی۔ سادھنا سامنے نہیں آئی۔ سادھنا سرود جی کے پھر اُس پر پابندی لگا دی تھی۔ میں چائے پی کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ مرلی کی ضروری کام سے چلا گیا تھا۔ سرود جی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی میری آؤ بھگت میں لگی تھی۔ انکا میرے چائے پینے کو گھور رہی تھی۔

”کیا بات ہے انکارانی؟“ میں نے پوچھا۔ ”آج تم سرود جی کو اتنی توجہ دے رہی ہو؟“

”آج اس کے ارادے تمہارے حق میں نیک نظر نہیں آ رہے۔“ اُس نے بڑی سنجیدگی سے جم کہہ دیا۔ ”تم نے اس کا اتنا بڑا نقصان پورا کر دیا۔ یہ اس کی ادائیگی کے طور پر خود کو تمہاری اغوش میں بکھیرنا چاہتی ہے۔ بڑی چالاک عورت ہے۔ سادھنا کو تمہاری بانہوں میں دیکھ کر اس کے سینے پر سانسپ لوٹنے لگے تھے۔ اُس غریب پر دوبارہ تم سے دُور رہنے کی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔“

انکا کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ سچ تو یہی تھا کہ مجھ پر زیادہ ہی مہربان ہو رہی تھی۔ رات گئے مرلی واپس آیا تو اُسے مجبوراً اُٹھ کر جانا پڑا۔ میری سر دھری نے اُسے مایوس کر دیا تھا ورنہ اُسے مرلی کی پرواہ نہیں تھی۔ مرلی اور سروجی کے چلنے کے بعد ہم اپارٹمنٹ میں تنہا رہ گئے۔ مرلی نے کہا تھا کہ دو صبح دوبارہ اپنے اپارٹمنٹ میں ٹھٹھ ہو جائے گا۔

میں خواب گاہ میں تنہا رہ گیا تو میں نے آئندہ کے بارے میں سوچا۔ میرے ذہن میں ہر دور اور کلبا رہا تھا۔ پنڈت نول کشور کی سرکوبی ضروری ہو گئی تھی۔ وہ میرا ہاتھ اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت موقع غنیمت تھا، انکا کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق پھر بھی کالی کے مندر میں نول کشور کے ساتھ تھا۔ میں دونوں سے ایک ساتھ منٹ لیتا تو صبح ہو جاتی۔ میرے ذہن میں ماضی کی المناک داستان سر اُبھارنے لگی۔ وقت کی گردشوں نے مجھے کہیں تک آرام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جین لڈا کے ساتھ لندن کی آزاد فضا میں کچھ دن سکون سے ضرور گزرے تھے، وہ میری منزل نہ بن سکی۔ پریم لال کی آتما نے سامنے آ کر میرے زخموں پر جمتی ہوئی کھریڑ کو دوبارہ کھرچ دیا۔ میرے زخم پھر تازہ ہو گئے۔ مجھے امر لال کے کسی لڑکے کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ پریم لال نے مجھے چندرا کے بارے میں بتایا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ بدری نرائن اور امر لال کا انتقام لینے کی خاطر میرے دشمن پھر سر جوڑ کر مشورہ کر رہے ہیں۔ امر لال کا نام سن کر میرا سکون برباد ہو گیا۔ وہ میری کلدیپ کا قاتل تھا۔ میں لندن چھوڑ کر واپس ہندوستان آ گیا۔ پنڈت پجاریوں نے پھر میرے اطراف گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ درخت کو ایک بار جڑ سے اکھاڑ دیا جائے تو اس کے دوبارہ اُگنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ میں بھی انہی خطوط پر غور کر رہا تھا۔ انکارانی میرے سر پر چٹ لپٹی کسی گہری سوچ میں متغرق تھی۔ میں تادیر اپنی وحشتوں سے سرماتا رہا، پھر وقت کا احساس معدوم ہونے لگا۔ غنودگی میرے جنون کو تھکیا دینے لگی۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب مجھے احساس ہوا کہ میں کمرے میں تنہا نہیں ہوں۔ میں نے پکوں کے درمیان جھری کر کے دیکھا تو مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ سادھنا تھی جس کے کندن جیسے دیکھتے جسم پر باریک ٹائٹ گاؤن قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ خود بھی کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ اُس کے لباس سے دھینکا مشتی کرتے ہوئے جسمانی نشیب و فراز دیکھ کر میرے جسم سے پچھلوٹ گئے۔ جذبات کو ڈنک مارنے لگے۔ وہ میرے بستر پر بیٹھی بڑی نشیلی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے شبہ ہوا، سروجی نے اُسے میرے قریب آنے سے روک دیا تھا۔ انکا نے بتایا تھا کہ سادھنا کی جوانی کو کسی راج منتری کے قدموں میں بھینٹ چڑھانے کی خاطر سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ سروجی کو خطرہ تھا کہ سادھنا کے جسم کی تپش میرے وجود کو پگھلا دے گی۔ اُس نے خود اپنے آپ کو میری خدمت میں پیش کر دیا تھا، سادھنا کو سینٹ کر علیحدہ رکھا تھا۔ پھر سادھنا کا اتنی رات گئے، اتنے ہیجان انگیز لباس میں میرے بستر پر موجود ہونا، بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ وہ شاید میرے پریشان ذہن کی پیداوار تھی۔ سادھنا نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دوسری کروٹ لینے کی کوشش کی تو میرے بازو پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ اس ہاتھ کے لمس نے میرے خون کی گردش تیز کر دی۔ میرے دل و دماغ میں کن کجورے رینگنے لگے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرا وہم نہیں تھی، سادھنا ہی تھی۔ میں اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ میرے وجود میں گرم آندھی کے اُٹھنے چلنے لگے۔ سادھنا کی موجودگی میرے تپتے ہوئے لُت و دق صحرائیں کسی نخلستان سے نہیں تھی۔ میری آنکھیں جلنے لگیں، حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔

”مہاراج.....“ سادھنا کی جھمکاؤں سے میرے کانوں میں رس گھول گئی۔ ”وہی کو شاکر دو۔ میں نے تمہاری نیند میں غفلت ڈال دی۔“

”سروجی کہاں ہے.....؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”تمہیں میرا آنا برا لگا تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔“ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی کلائی تھام لی۔

”تم نے میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔“ میں نے اُسے دوبارہ اپنے بستر پر بٹھالیا۔ ”در اصل میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ.....“

”میں سمجھتی ہوں مہاراج۔“ اُس نے بڑی معصومیت سے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”میڈم

کو میرے یہاں آنے کی بھینک بھی مل گئی تو وہ مجھے شکاری کتوں کے آگے ڈال دے گی۔“
”بھئی..... تم یہاں کیوں آ گئیں.....؟“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر بیکے
لہجے میں حال کیا۔

”تمہاری سزا کرنے۔“ اُس نے بے اختیار اپنا سر میرے کشادہ سینے پر رکھ دیا۔ ”تھوڑا
سایا رکھ پھارن کی جھمیلی میں بھی ڈال دو۔“

میرے جذبات میں طغیانی آ گئی۔ ایک اونچی لہر آئی، ہم دونوں کو بہا کر لے گئی۔
میرے اعصاب کا تناؤ دور ہو گیا۔ سادھنا میری آغوش میں بکھری پڑی تھی، اُس کا نیم
عریاں جسم اور بے ترتیب لباس مجھے کسی اور دنیا کی سر کر رہا تھا جب انکا کی مانوس آواز
میرے کانوں میں گونجی۔

”سادھنا تمہیں کیسی لگی؟“

میں نے چونک کر سر پر نظر ڈالی، انکا کی شوخ نگاہوں سے مستی چھٹک رہی تھی۔ ساری
بات میری سمجھ میں آ گئی۔ سادھنا میرے پاس اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔ انکارانی کی
پراسرار قوتوں نے اُسے بنا سنوار کر میری ہوس کا نشانہ بنا دیا تھا..... اب اُس کی بات
نظریں سادھنا کے جسم پر چل رہی تھیں۔

”تمہارا دل بھر گیا ہو تو میں بھی اپنی غذا حاصل کر لوں۔“ انکا نے جہاں لیتے ہوئے کہا،
پھر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

”اگر سروجنی کو علم ہو گیا تو.....؟“ میں نے ایک ممکنہ خطرے کا اظہار کیا۔

”تم فکر مت کرو جمیل۔“ اُس نے بے پرواہی سے کہا۔ ”میری خاطر سادھنا کو
دوسرے کمرے میں پہنچا دو۔ گلا گھونٹ کر اس کا سر پھاڑ دو، میں اس کے جسم میں اُلٹے
ہوئے خون سے اپنے وجود کو سیراب کرنے کے بعد اسے بھی چھوڑ کر دوں گی۔“ انکا نے
بڑے یقین سے کہا۔ ”سروجنی اور مرلی کے فرشتے بھی اس کا سراغ نہیں لگا سکیں گے۔
سادھنا سے پہلے بھی کچھ لڑکیاں سروجنی کے قبضے سے نکل کر اوپر فرار اختیار کر چکی ہیں۔
دونوں تمہارے اوپر شبہ نہیں کریں گے۔“

میرے اور انکا کے درمیان خون کی فراہمی کے سارے معاہدے ختم ہو چکے تھے۔ میں
اُس کے کسی حکم کا پابند بھی نہیں تھا، پراسرار قوتوں کے حصول کے بعد ہم دونوں کا پلا

ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تو انکا کی درخواست رد بھی کر سکتا تھا۔
”جمیل.....“ وہ مجھے ہچکچاتا دیکھ کر عاجزی کرنے لگی۔ ”تم واقف ہو کہ انسانی خون
میری غذا ہے۔ میں تمہیں حکم نہیں دے رہی، تم سے درخواست کر رہی ہوں۔ میری
درخواست رد نہ کرنا..... آج مجھے بھی جشن منا لینے دو.....“

میں نے سادھنا کے سر پر ایک آخری نظر ڈالی۔ اُس گل بدن پر مجھے ترس آرہا تھا۔
لیکن میں نے انکا کی درخواست رد نہیں کی، سادھنا کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا،
اُس کی صراحی دار گردن پر میرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوئی تو وہ کسمانے لگی۔
”مہاراج..... یہ تم کیا.....“

میں نے اُسے جملہ ملل کرنے کا موقع نہیں دیا، ہاتھوں کے شکنجے کو تنگ کیا تو سادھنا کا
کندن جسم پھڑپھڑانے لگا۔ وہ زیادہ دیر مدافعت نہ کر سکی، اُس کی آنکھیں اُبل کر حلقوں
سے باہر آ گئیں۔ اُس کا جسم ساکت ہو گیا۔ میں نے اٹھ کر اُس کے سر پر بھرپور ٹھوک ماری،
خون کا فوارہ جاری ہوا تو انکا میرے سر سے اُتر گئی۔ میں نظریں پھیر کر واپس اپنی خواب گاہ
میں آ گیا.....!!

صبح میری آنکھ دیکھ سے کھلی۔ انکا میرے سر پر ٹانگیں پھارے گہری نیند سے دو چار تھی۔
اُس کا چہرہ کسی تازہ گلاب کی مانند کھلا کھلا نظر آرہا تھا۔ میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آیا۔
سادھنا کا جسم خائب تھا۔ قالین پر خون کا ایک دھبہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں دوبارہ اپنے
بستر پر آ کر لیٹ گیا.....!

ناشتے کی میز پر سروجنی کی چینی میری نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ ایک سونے کی
چڑیا اُس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اُس کی نگاہ بے جا نہیں تھی۔

”کیا بات ہے سروجنی.....؟“ میں نے اُسے ٹٹولنے کی خاطر پوچھ لیا۔ ”تو مجھے کچھ
پریشان دکھائی دیتی ہے.....“

”کوئی خاص بات نہیں ہے مہاراج۔“ اُس نے ریمو کی سگھلانے کی کوشش کی۔ ”سر
میں ہلکا ہلکا درد سا ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اپنا دھیان دکھا کر۔“ میں نے غصے سے لہجے میں کہا۔ ”مرلی کو ابھی میری ضرورت ہے۔“
ناشتے کے بعد مرلی تیار ہو کر دفتر جانے لگا تو میں بھی سید کی انھی سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم کہاں جا رہے ہو مہاراج.....؟“ سروجنی نے بے چینی سے دریافت کیا۔

”اب یہاں سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کچھ حساب بچنے کرنے ہیں۔ زندگی رتی تو پھر ملاقات ہوگی۔“

سروجنی نے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ مرلی نے بھی اصرار کیا۔ لیکن میں نے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے جان چھوڑ دی۔ سروجنی کے سر پر ہاتھ پھیر کر مرلی کے ساتھ نیچے آ گیا۔

”کہاں جانے کا ارادہ ہے مہاراج؟“ مرلی نے کار میں بیٹھنے کے بعد سوال کیا۔

”ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ دو۔ کسی بھی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔“ میں نے سر د آہ بھر کر

جواب دیا۔ ”ابھی تو بہت سفر کرنا ہے۔ میری کوئی ایک منزل نہیں ہے، جہاں رات آئی

وہیں پڑاؤ ڈال دوں گا۔“

راستے میں مرلی بڑی عقیدت سے گفتگو کرتا رہا۔ میں ہوں ہاں کے جواب دیتا رہا۔

انکا، سادھنا کے خون کے نشے میں ابھی تک بے سدھ پڑی جگے جگے چلنے والے تھے۔

میں آنے والے کل کے بارے میں سوچنے لگا.....!!



KHAN BOOKS

STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 5556532
PROP: ALI KHAN

KHAN BOOKS

STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 5556532
PROP: ALI KHAN

مرلی مجھے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ میرے پاس سید کی لائٹھی کے علاوہ

کوئی دوسرا سامان نہیں تھا۔ مجھے سامان کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جہاں جس چیز کی ضرورت

ہوتی وہ انکا فراہم کر دیتی تھی۔ جن قارئین نے میری داستان الناک کا مطالعہ کیا ہے وہ

غربی واقف ہوں گے کہ میرے لئے دولت کا حصول کس قدر آسان تھا۔ دولت میرے

ہاتھ کے میل سے بھی کم حقیقت تھی۔ اسی دولت کی خاطر میں بھی انکارانی کے عشق میں مبتلا

ہوتا چلا گیا تھا۔ دولت انسان کی بینائی روشن کرنے کے لئے سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس

کی بھلک دیکھ کر انسان کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ دل کی دھڑکنوں کو

کوئی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ حسین خوابوں اور خواہشات کی تکمیل کے لئے بھی انسان کو

دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دولت ہی کے بل بوتے پر ایک کمزور حریف بھی اپنے سے

زائد قدامت کے دشمن پر جھپٹ پڑتا ہے۔ دولت ایک ضرورت ہے، نشہ ہے، طاقت

ہے۔ یہی دولت انسان کو پینا سے ناپینا بھی کر دیتی ہے۔ دولت کی خاطر دو دوسروں کے قتل

پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ چور کی کرتا ہے، ڈاکے مارتا ہے، اسی سے ضمیر کے سودے بھی بر ملا

کئے جاتے ہیں۔ اس کا ایندھن نفس کو دلا جاتا ہے۔ یہی فساد کی جڑ ہے، یہی جسم فروشی کے

کام آتی ہے، اسی کی خاطر انسان اپنی دولت کو بھگ جاتا ہے، منزل سے دُور ہو جاتا ہے،

ارباب کے پیچھے وحشی گھوڑے کی طرح سر پہنچا بھاگنے لگتا ہے۔ اسی کو امیری اور غربی کا

میزان سمجھا جاتا ہے۔ یہی ہاتھ کا کنگن ہے، یہی بیروں کی بیڑی بھی بن جاتی ہے۔ میری

آنکھیں بھی دولت کی ریل پیل دیکھ کر خیرہ ہو گئی تھیں۔ آپ واقف ہیں، میں بڑا قناعت

پسند تھا، والدین سے دُور ایک کمرے کے فلیٹ میں زندگی کے دن بوسے سکون سے گزار رہا

تھا۔ صبح اٹھنا، اپنے ہاتھ سے ناشتہ بنانا، دن بھر خون پسینہ بہا کر روزی کمانا، رات کا کھانا

کسی ادنیٰ درجے کے ہوٹل میں کھا کر ایک چھلگے چنگ پر سکون کی نیند سو جانا، دوسرے دن

پھر کہو کے بیل کی طرح روزمرہ کے معمولات میں بخت جانا۔ زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی جب انکا نے میرے سر کو اپنے آشیانے کے لئے منتخب کیا تھا۔ ہر شخص کی طرح میں بھی شروع شروع میں گھبرایا، انکا مجھے اپنے بچوں کی تیز چھین سے اپنا معمول بنالیتی۔ میں اُس کے اشاروں پر عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ میری زندگی میں طوفان کی شدتیں کبھی نہ پیدا ہوتیں اگر انکا نے میرے سر پر ہاتھ نہ کیا ہوتا۔

میں اختصار سے کام لوں گا۔ قارئین جانتے ہیں کہ میں حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر انکا نے میرے لئے دولت کے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ میں بہکتا چلا گیا..... آج میں کلدیپ کی بے چین رُوح کو سمجھانے کی خاطر زندگی داؤ پر لگانے پر آمادہ تھا۔ وہ میری رُوح تھی، میری زندگی تھی، میرے بچنے کا آخری سہارا تھی جسے امرال کی مداخلت نے مجھ سے چھین لیا..... کلدیپ سے میری ملاقات بھی دولت کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ وہ بذاتِ خود پونا کے ایک معروف دولت مند تاجر کی بیٹی تھی۔ ثور نے اُسے حسن کی دولت سے نوازا کہ اُس کی قدروقیمت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بڑی مہذب و متعلم کے زیور سے پوری طرح آراستہ تھی۔ اُس کی گفتگو میں شائستگی کا رنگ جھلکتا تھا۔ اُس کی نگاہیں جدھر اُٹھتی تھیں، ایک رشتہ قائم کر لیتی تھیں۔ میری اُس کی پہلی ملاقات پونا کے ریس کلب میں ہوئی۔ دولت کے بل بوتے پر وہ من پسند گھوڑوں پر بے دریغ داؤ لگاتی رہی۔ قیمت نے یادوری نہیں کی، وہ ہارتی چلی گئی۔ اُس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ لیکن اُسے اپنی ہار بھی منظور نہیں تھی۔ پھر میں نے انکا کی پراسرار قوتوں کے ذریعے اُسے جیت کی طرف گامزن کر دیا۔ فتح کا احساس اور میرے قرب کی پیش اُسے گھملاتی رہی۔ وہ ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی، حسن کی دیوی تھی، دولت میں کھیلتی تھی۔ بڑے بڑے دولت مند تاجر اُس کی ایک نگاہ غلط اناز کے منتظر رہتے۔ اُسے رجھانے اور اپنانے کے سہرے خواب دیکھتے لیکن قرعہٴ فال میرے نام نکلا۔ انکا کی صورت میں میرے پاس ”جادو کی چھتری“ موجود تھی۔ میرا اُس کا ربط بڑھتا گیا۔ وہ میری پچارن بن گئی۔ میری خاطر اُس نے پچارنوں کا لباس پہن لیا، دنیا کی رنگینوں سے منہ موڑ کر صرف مجھے سر بلند رکھنے اور سر بلند دیکھنے کی خاطر پریم لال کی کنیا میں مرگ چھالا پر بیٹھی شب و روز دیوی اور دیوتاؤں کی خوشنودی کی خاطر چاپ کرتی رہی..... سارا کھیل دولت کی بنیاد پر شروع ہوا تھا۔ اس کا

سلسلہ ختم نہیں ہوا، جاری تھا.....

میں بمبئی کے پُروٹن اسٹیشن پر ٹرین کے فرسٹ کلاس کپارٹمنٹ میں تنہا بیٹھا تھا اپنی تسبیح روز و شب کے دانے شمار کر رہا تھا جب گارڈ کی تیسری سیٹی کی آواز اُبھری، اسی کے ساتھ گاڑی چل پڑی۔ میرے خیالات کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکارانی بیدار ہونے کے لئے توبہ شکن انگڑائیاں لے رہی تھی۔ سادھنا کے گداز جسم کا سارا خون اپنے وجود میں منتقل کر لینے کے بعد اُس کے حسن میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس کے گالوں کی سرخی کندن کی طرح دمک رہی تھی۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے تراشیدہ ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دو چار بار اپنے جسم کو بھرپور انداز میں دائیں بائیں حرکت دینے کے بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں، پھر ہلکا کر اُٹھی، بڑی سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا۔ ”ہم اس وقت کہاں ہیں جمیل.....؟“ اُس نے نظریں گھما کر ماحول کا جائزہ لیا۔

”ریل کے فرسٹ کلاس میں.....“ میں نے شوقی سے کہا۔ ”اس وقت کپارٹمنٹ میں میرے اور تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہے۔“

”تم نے کہاں جانے کا ارادہ کیا ہے؟“ وہ میری بات کا جواب دینے کی بجائے میری نگاہوں میں جھانکنے لگی۔ اُسے پھر میری فکر لاحق ہو گئی۔

”نی اہل دہلی جانے کا ارادہ ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی دعا پر حاضری دینے کے بعد اگلی منزل ہر دوار ہوگی.....“

”پہلے تو تم نے جید آباد جانے کا خیال ظاہر کیا تھا۔“ ہر دوار کا نام سن کر اُس کے چہرے پر اضطرابی کیفیتیں نمودار ہونے لگیں۔ کیا اب رکن الدین کی حویلی جانے کا ارادہ ترک کر دیا؟ گلبرگہ چلتے تو ایک پتھر دوکان ہو جاتا۔ سید ہندوب سے ملاقات بھی ہو جاتی، بزرگ کی چوکھٹ پر حاضری بھی دے لیتے۔

”سفر بہت لمبا ہو جاتا۔ دو مختلف سستوں کا راستہ طے کرنے میں خاصا وقت ضائع ہو جاتا۔“ میں نے سپاٹ لےجے میں جواب دیا۔ ”زندگی رہی تو انہوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

”سید کو کیوں فراموش کر رہے ہو؟ اُس نے تمہیں دُرگہ کے عتاب سے نجات دلا کر وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو میری قوت سے بھی باہر تھا۔“

”اُس کی لاش میرے پاس ہے۔“ میں نے لاشی کو عقیدت سے چوم لیا۔ ”مجھے یقین ہے، سیدھے دھوپ مجھے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ میں جہاں بھی رہوں، اُس کا سایہ میرے ساتھ ساتھ رہے گا۔“

انکا نے جو لب نہیں دیا، کسمسانے لگی۔ میں اُس کی نگاہوں میں اُلجھن کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

”چپ کیوں ہو گئیں؟“ میں نے اُسے چھیڑا۔ ”کیا سادھنا کا خون مارٹینا کے کاک ٹیل خون سے زیادہ لذت آمیز نہیں ثابت ہوا؟“

”تمہیں اس وقت مارٹینا کیوں یاد آئی؟“

”اور کسے یاد کروں.....؟“ مجھے کلدیپ یاد آئی۔ ”میرا کسمسور بن میں کلبلا نے لگا۔ مالارانی کا خیال کرو نہیں لینے لگا۔ میں نے آہ بھر کر کہا۔ ”میری زندگی میں اب یادوں کے سوا اور کیا رہ گیا ہے.....؟“

”میری ایک بات مانو گے.....؟“ اُس نے بڑے لاڈ سے کہا۔

”میں جانتا ہوں تم کیا مشورہ دو گی۔“ میں اُس کا اشارہ سمجھ گیا۔ ”تم مجھے ہر دو اور جاننے سے روکنا چاہتی ہو۔ لیکن کب تک؟“ میرے جنون نے پھر سر اُبھارنا شروع کیا۔ ”پنڈت

نول کشور منڈل سے باہر آنے میں جلد بازی نہیں کرے گا۔ مجھے دُور بٹھا کر دوسرے معاملات میں اُلجھاتا رہے گا۔ تم نے ہی بتایا تھا۔ میں انتظار بھی کر لوں۔ لیکن زندگی کی ضمانت کون دے گا؟ بلاوے کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ کسی وقت بھی جسم اور رُوح کا رشتہ اُس کے حکم سے ختم ہو سکتا ہے۔ میں حسرتیں دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو گیا تو میری رُوح کو کبھی سکون نہیں ملے گا۔ ایک طرف میری لاوارث لاش کو کوئی خیراتی ادارہ قبر میں اتارنے کی تیاری کر رہا ہوگا، دوسری طرف نول کشور بھنگ چڑھا کر کسی کم عمر پیارن کی برہنہ کمر میں

ہاتھ ڈالے دُھوم دھڑکا کرنے میں مگن ہوگا، جیورام..... چھیورام اور جے بھرنگ ملی کے نعرے لگائے گا۔ چندرا کی کسی سندرنار کے شریر کو ہاتھ لگانے کی قسم بھی ٹوٹ جائے گی۔ وہ

بھی کسی معصوم کو زبردستی گاہن کرنے میں بٹھ جائے گا۔ میں نے پریم لال مہاراج سے جو وعدے کئے تھے، وہ ادھورے رہ جائیں گے۔ کلدیپ کی رُوح ہمیشہ شاکی رہے گی۔“

میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”نہیں انکارانی..... نہیں۔ میں ان دونوں چٹکوں منکوں

موہن سوہن کی ناجائز اولادوں کو خوشیاں منانے کا موقع نہیں دُوں گا۔ جب تک جہنم رسید نہ کر لوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا..... پنڈت پجاریوں کو تالیاں بجانے کا موقع مل گیا تو وہ پھر اوقات سے تجاوز کرنے لگیں گے۔“

”میں تمہارے دل کی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ لیکن.....“

”بہت وقت گزر گیا، بڑے درگزر سے کام لیتا رہا۔ اب لیکن ویکن کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔“

”ٹھیک ہے جمیل.....“ انکا نے تھوڑے توقف سے کہا۔ ”اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ مگر ایک وعدہ کرو، تم جذبات میں بے قابو ہو کر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔“

”تم اس قسم کے مشورے پہلے بھی دیتی رہی ہو۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”انسان جان بوجھ کر نادانی نہیں کرتا۔ اپنی خوشی سے کوئی بھڑکتی آگ میں چلا جائے۔ لگانے کی حماقت نہیں کرتا۔ وقت، حالات، گھٹن، محرمیاں اور اندر ہی اندر پکنے والا آن گیر مادہ

بب لاوے کی شکل میں اُبلتا ہے تو ساری مصلحتیں، تمام دُور اندیشیاں اور سود و زریاں کا حساب کتاب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ جنون کی شدت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ وہ آدم خور بن جاتا ہے۔ اپنے حریف کو پھاڑ کھانے کی خواہش کے علاوہ اُسے اور کچھ نہیں

بھائی دیتا..... کمالا کی وہ ٹھوس جسم والی مرہٹی لڑکی یاد ہے تمہیں؟ لالہ موتی رام کی ناجائز اولاد جسے لاڈ پیار سے پروردی کی روش پر ڈال دیا تھا۔ تمہارے ایک اشارے پر وہ بچے ہوئے ام کی طرح میرے قدموں میں آگری تھی۔ تم نے سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا تھا۔ اُس کی رگوں میں دڑتے ہوئے گاڑھے خون نے تمہیں بھی

جنون کی حالت میں مبتلا کر دیا تھا۔ یاد ہے تمہیں؟ تم نے اس قدر وحشیانہ انداز میں حلق سے خوفناک غراہٹ کی آوازیں نکال کر مجھے اُسے مار ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ کتنے جنونی انداز میں

میرے سر پر اپنے باریک پنچے چھوئے تھے۔ برامت ماننا انکارانی، مگر اس وقت میں انکار کر دیتا تو شاید تم مجھے بھی زندہ چبا ڈالنے سے گریز نہ کرتیں..... ہو، کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ کمالا کی بات یاد نہ آ رہی ہو تو سادھنا کو یاد کرو..... کل رات ہی کی بات ہے جب اپنی خواہش کی تکمیل کی خاطر تم نے اُس تر و تازہ کلی کو کس بیدردی سے جوانی کی لہلہاتی شاخ

سے بچ کر مسل ڈالا.....“

”اٹکا کوئی جواب نہ دے سکی، خاموش بیٹھی مجھے ٹھٹکی باندھے گھورتی رہی۔“

”اس انداز میں کیوں گھور رہی ہو جان من؟“ میں اُس کے لا جواب ہو جانے پر ترنگ میں آ گیا۔ ”اشتمال اور بارود میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ جب تک کوئی جلتی ہوئی تیلی نہ دکھائے دونوں میں دھماکے نہیں ہوتے۔“ میں نے اُسے ٹھیکسی نظروں سے دیکھا۔ ”اور کچھ یاد دلاؤں؟ کوئی اور مثال دوں؟ مثلاً جب دہلی کا نام آتا ہے تو مجھے اپنی نرگس یاد آ جاتی ہے۔ وہ میرے پیار کی خاطر، مجھے پریشانوں سے چمکارا دلانے کی خاطر ایک بزرگ کے مزار کی طرف جا رہی تھی جب تم نے.....“

”بس کرو جمیل..... چپ ہو جاؤ۔“ اٹکا، نرگس کا نام نہ لے کر مہمانانہ لہجے میں سلسلے میں کئی بار میں تم سے معذرت کر چکی ہوں۔“

”میں مانتا ہوں۔ لیکن پنڈت نول کشور نے ابھی تک کوئی معذرت نہیں کی۔ مفاہمت کا کوئی پہلو اختیار نہیں کیا۔ بار بار بارود کو دور بیٹھا آگ دکھا رہا ہے۔ ایک بار حمل کر دھمکے ہو لینے دو، اب چھوٹی موٹی دھامیں، دھوئیں سے کام نہیں چلے گا۔“

”تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اٹکا نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”میں کوشش کروں گی کہ تمہارے دشمنوں کو منڈل سے باہر نکلنے پر مجبور کروں۔ پھر تم اپنی حسرتیں بھی پوری کر لینا۔“ ”اب ہوئی نابات.....“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”پہلی بار تم نے میرے دل کی بات پر صادق کیا ہے۔ دل چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔“

”ہمیشہ جھوٹے وعدوں پر بڑھاتے رہتے ہو، کبھی عمل کر کے دکھاؤ تو جانوں۔“ اُس نے سیدھا پاؤں سر پر ملستے ہوئے ایک خاص ادا سے کہا۔ مجھے لکھنؤ کے کوشوں کی طرح دار طوائفیں یاد آ گئیں۔

ہمارے درمیان خوشگوار ماحول میں باتیں شروع ہو گئیں۔ اٹکا مجھے لہجائی رہی۔ میں چھیڑ خانی کی باتیں کرتا رہا۔ کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ ایک اسٹیشن پر ٹکٹ چیکر کپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر یوں چونکا جیسے پہلے سے جانتا ہو۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دینے کی زحمت نہیں کی۔ البتہ یہ فکر ایک لمحے کو ضرور لاحق ہوئی کہ میں بے ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ ”اے مسٹر، تم اس ڈبے میں کیسے آ گئے.....؟“ ٹکٹ چیکر نے میرے قریب آ کر

بے حوصلہ انداز میں سوال کیا۔

”کیوں.....؟“ میں نے بے پرواہی کا مظاہرہ کیا۔ ”کیا یہ فرسٹ کلاس نہیں ہے؟“

”صورت شکل سے تو پڑھ لکھے معلوم ہوتے ہو۔ لیکن یہ لاٹھی.....“

”بھونکنے والے کتوں کو بھگانے کے لئے استعمال کرتا ہوں۔“ میں نے اُس کا جملہ مکمل کیا تو وہ بچ و تاب کھا کر بولا۔

”تمہیں اگلے اسٹیشن پر یہ ڈبہ خالی کرنا ہوگا۔ یہ کسی کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ کیا تمہیں باہر ریزروڈ (RESERVED) کی تختی نظر نہیں آئی.....؟“

”اتنا پڑھا لکھا ہوتا تو فرسٹ کلاس میں کیوں سفر کرتا.....؟“ میں نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا۔

”ٹکٹ ہے تمہارے پاس.....؟“ اُس نے برا سا منہ بنا کر پوچھا۔

”کیا خیال ہے جمیل.....؟“ اٹکا نے ٹکٹ چیکر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”اس کو اٹھا کر باہر نہ بچک دوں؟“

میں نے جواب دینے کی بجائے ٹکٹ چیکر کو غصے سے دیکھتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میرا نفسیاتی حربہ کام آ گیا، اٹکا کی موجودگی میں مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔

”ٹکٹ ہے مسٹر.....“ اُس نے میرے غصے سے مرعوب ہو کر جواب دیا۔ ”ٹکٹ ہوگا آپ کے پاس۔ لیکن یہ ڈبہ آپ کو بہر حال اگلے اسٹیشن پر خالی کرنا ہوگا۔“ وہ اپنا آخری فیصلہ کر سستاے کی خاطر زور جا کر بیٹھ گیا۔

”انکارانی.....“ میں نے بھی فیصلہ کر لیا۔ ”میں یہ ڈبہ خالی نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا.....“

اٹکا اسٹیشن آنے سے پہلے گاڑی کی رفتار میں کمی شروع ہوئی تو اٹکا میرے سر سے رینک کر اتر گئی۔ ٹکٹ چیکر کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہونے لگے۔ گاڑی رُکی تو اُس نے بڑی تہذیب سے کہا۔

”ڈبہ گوالیار سے دہلی تک کے لئے مخصوص ہے۔ آپ ایک اسٹیشن پہلے اتر جائیے گا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دو خاموشی سے نیچے اتر گیا۔ اٹکا کچھ دیر بعد دوبارہ

”تمہیں یاد ہے جیل؟ میں نے سادھنا کے سلسلے میں ہندوستان کے ایک منتری کے سلسلے میں باپ کی ٹھنی۔“ انکا نے مجھے اپنی معلومات سے آگاہ کیا۔ ”اُسی کی اکلوتی لڑکی گوالیار سے ہماری ہم سفر ہوگی۔ اُس کے ساتھ حفاظتی عملہ بھی ہوگا۔ اُن کے لئے برابر کے ڈبے میں نشستیں محفوظ کرائی گئیں۔“

”کچھ بھی ہو، میں اپنی شہرت خالی نہیں کروں گا۔“ میں نے کسی ضدی بچے کی طرح کہا۔ انکا مسکرانے لگی۔

”کیا تم ہمیشہ اسی انداز میں بات نہیں کر سکتے؟“

”حالات لگام کھینچ کر مجھے طیش دلاتے ہیں۔ اس میں نہیں رہتی۔“ میں نے وضاحت پیش کی۔

”تمہیں اب اپنے آپ پر قابو رکھنا ہوگا جیل۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”پنڈت نول کشور جب تک منزل سے باہر نہیں آجاتا میں اس کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتی۔“ میں نے یونہی اتنی لمبی چوڑی بساط نہیں بچھائی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی وہ صرف اپنے پیادے آگے بڑھا رہا ہے، اہم مہرے اُس نے سنبھال کر رکھے ہوں گے۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

”میری بات کا غلط مطلب مت نکالو۔“ اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میرا مقصد یہ تھا کہ ہم جو قدم بھی اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔ دشمنوں کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔ وہ سمجھ کر ادھر ادھر ہو گئے تو کہانی پھر طول پکڑ لے گی۔ تم میری مجبوری سے واقف ہو۔ میں کالی کے مندر یا کسی پجاری کے منزل میں نہیں داخل ہو سکتی۔“

”فکر مت کرو۔ مجھے مندروں میں گھسنے اور حالات سے نمٹنے کا تجربہ ہے۔“ میں حقارت سے بولا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ نول کشور، پنڈت بدری نرائن یا امر لال سے زیادہ قوتوں کا مالک ہوگا۔“

انکا کچھ سوچنے لگی۔

”تم نے چندرا کے بارے میں کوئی کھوج لگایا؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”وہ اتنی کم عمری میں موت کی تمنا کیوں کر رہا ہے؟“

”اُسے بھی کم مت سمجھنا۔“ انکا نے نفرت کا اظہار کیا۔ ”سانپ کا بچہ بھی سپنولا کھلاتا ہے۔ چندرا میں بھی سانپوں جیسی خاصیت ضرور ہوگی۔ وہ امر لال کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اُس کی رگوں میں باپ کا خون موجود ہے، اسی خون کی گرمی نے اُس کے انتقامی جذبات کو ہوا دی ہوگی۔ وہ دھیا چل کی بر فانی پگھاؤں میں منزل کھینچ کر سال دو سال گزارنا عام آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ بڑے بڑے پنڈت جیسے بول دیتے ہیں۔ چندرا وہاں جم کر بیٹھا ہوگا تو اُس نے کچھ نہ کچھ حاصل بھی کیا ہوگا لیکن..... تم یہ بار بار چندرا کے دھیان میں کیوں گم ہو جاتے ہو؟“

”مجھے اُس کی جوانی پر کبھی کبھی ترس آنے لگتا ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”فرض کرو میں طبعی موت کا شکار ہو جاؤں تو کیا وہ حرام کاخم کسی حسینہ کے مخملی جسم کو ہاتھ لگائے بغیر مجرد زندگی گزار دے گا؟ پیار نہیں صرف اُس کا خواب دیکھتی رہیں گی، خود وہ بھی ماہی بے آب کی طرح اپنی خواہشات کی کانٹوں بھری سیج پر نہتا رہے گا۔“

”عجیب شخص ہو تم۔“ انکا مسکرا دی۔ ”کبھی چندرا کا نام نہ کر تمہارے اندر کا وحشی گھوڑا جنہنہانے لگتا ہے، تم طیش میں آ کر بے قابو ہو جاتے ہو، دیوانگی کی تمام سرحدیں عبور کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ اس وقت چندرا کی کسن جوانی تمہارے آڑے آرہی ہے۔“

انکا کا اعتراض بجا تھا۔ میں نے جسے قدموں تلے روندنے کا عزم کر کے چین کی مرمریں بانٹیں اور مہکتی زلفوں سے منہ موڑا تھا، لندن کی پرسکون زندگی کو الوداع کہا تھا، اُس کے بارے میں میرے دل کے کسی گوشے میں بھی ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں ابھرنا چاہئے تھا۔ وہ میرا دشمن تھا۔ میرے خون کا پیاسا تھا، میری کلدیپ کے قاتل کا بیٹا تھا۔ مجھے اُس سے شدید نفرت کا اظہار کرنا چاہئے تھا۔ میں نے موضوع بدل دیا۔ انکا نے بھی سکون کا سانس لیا۔ وہ بھی میری وحشوں، میرے خون سے گھبرا جاتی تھی۔ میری ہمدرد تھی۔ مجھے پرسکون دیکھنا چاہتی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ گوالیار کا اسٹیشن قریب آنے لگا تو انکا نے سیریکٹ تبدیل ہونے لگے۔ اُس کی نگاہوں میں الجھن اور خوشی کے طے جلتا ثبات ابھرنے لگے۔

”کیا بات ہے انکارانی.....؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تمہاری نظریں کہاں پھرتی پھر رہی ہیں؟“

”گوالیار کا اسٹیشن قریب آرہا ہے۔“ انکا نے کسماتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ راج منتری کی بیٹی چارمیا فظلوں کے ساتھ سفر کرے گی۔ لیکن وہ محافظ دور دور تک کی نظر نہیں آرہے۔ لڑکی جو حسن و جمال میں اپنی مثال آپ ہے مجھے کچھ گھبرائی گھبرائی سی نظر آ رہی ہے۔ اُس کے ساتھ جو دو آدمی ہیں وہ بھی مجھے اچھے لوگ نہیں دکھائی دیتے۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ پیدا ہوئی ہے۔ نارنگ سنہا بڑی اونچی شے ہے، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ پروجیکٹ منتری کو بھی گھاس نہیں ڈالتا۔ اُس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، بہت دور اندیش، بڑا معاملہ فہم آدمی ہے۔ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کا عادی ہے۔ میں نے جو معلومات کی ہیں، وہ غلط نہیں ہو سکتیں۔ راج منتری نارنگ اپنی بیٹی کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ محافظوں کا انتخاب کر کے وقت بھی اس نے بہت سوچ سمجھ کر کوئی آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ تمہاری اطلاع کے لئے ایک بات اور بتا دوں، نارنگ سنہا کا شمار اصول پرست اور ایماندار لوگوں میں کیا جاتا ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ اُس نے انڈر ورلڈ (UNDER WORLD) کے کئی گاؤں فادرز (GODFATHERS) کے ساتھ جوڑ کر رکھا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو حکومتی کاموں میں اُس کی جڑیں اتنی مضبوط نہ ہوتیں۔“

میں خاموشی سے انکا کی باتیں سنتا رہا۔ وہ نارنگ کے بارے میں مجھے بڑی تفصیل سے ایک ایک بات بتا رہی تھی۔ اُس کی لڑکی کے حسن و جمال کے سلسلے میں بھی اُس نے اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میرا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

گاڑی کی رفتار مدہم ہوتے ہوئے ٹھہرنے لگی تو انکا میرے سر سے اتر گئی۔ میں داخلی دروازے کی مخالف سمت والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ گاڑی رُکی تو کپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا، ریلوے کے عملے کے کئی بڑے عہدیدار باہر موجود تھے لیکن میں پچھلی پچھلی نظروں سے اُس نازک انداز حسینہ کو دیکھ رہا تھا جو اندر داخل ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ وہ لاکھوں میں بھی ہوتی تو میں اُسے دور سے پہچان لیتا۔ وہ امریتا کے سوا کوئی اور نہیں تھی۔ میرے کانوں میں اُس کی گفتگو کے وہ خوبصورت جملے رس گھولنے لگے جو لندن سے واپسی کے وقت جہاز میں ہمارے درمیان ہوئی تھی۔

امریتا نے ڈبے میں قدم رکھا تو اُس کے جسم کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ دو بے کس مسلح افراد بھی اندر آ گئے۔ انہوں نے گیٹ ہی سے استقبال کرنے والوں

کو خوبصورتی سے ٹال کر دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔ امریتا اور میری نظریں چار ہوئیں تو اُس کی نگاہوں میں خوشی کی کرن بس ایک لمحے کو نظر آئی، پھر اُس نے بے رخی سے نظریں پھیر لیں۔ آگے بڑھ کر تھکے تھکے انداز میں ہاتھ کے آخری سرے پر جا کر بیٹھ گئی۔ دونوں مسلح افراد دروازے پر جے کھڑے رہے، اُن کی نظریں بار بار میری جانب اٹھ رہی تھیں۔ شاید انہیں نارنگ کی بیٹی کے لئے ”مخصوص“ کپارٹمنٹ میں میری موجودگی پر تعجب ہو رہا تھا۔ میں امریتا کو آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ اُس نے مجھے شناخت کرنے میں اجتناب کیوں برتا؟ فضائی سفر کے دوران تو وہ کسی خوش گلو پرندے کی طرح چپک چپک کر باتیں کر رہی تھی، بڑی بے تکلفی سے ڈھکے چھپے لفظوں میں اس بات کا دعویٰ بھی کیا تھا کہ وہ نہ صرف مجھ سے واقف ہے بلکہ آتما بھی چکی ہے۔ میں نے اپنے ذہن کو ایک بار پھر کھنگالنا شروع کیا، کئی امکانات پر غور کیا، کئی پہلوؤں سے ماضی پر نظر ڈالی لیکن امریتا سے مشابہ کوئی چہرہ دور دور تک نظر نہیں آیا۔ میرے کانوں میں اُس کا کہا ہوا ایک جملہ صدائے بازگشت بن کر گونجا۔ ”آتما ہی ہوئی چیزوں کو دوبارہ پرکھنے کی کیا ضرورت ہے۔؟“

میرا ذہن اُلجھنے لگا۔ گاڑی نے آخری سیٹی کے بعد ریٹنا شروع کیا تو انکا میرے سر پر آ گئی۔ اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط تھی۔ کسی خیال میں مستغرق نظر آ رہی تھی۔ میں نے امریتا کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا، فضائی سفر کے دوران گرو نے امریتا اور انکا کے درمیان کوئی پردہ حائل کر دیا تھا جو امریتا کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ گرو نے کسی خاص مصلحت کی بناء پر ہی ایسا کیا ہوگا۔ میں بھی انکارانی کی یہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ میرے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر کوئی شکوہ کرے۔

گاڑی نے رفتار پکڑی تو ایک مسلح شخص امریتا کے ساتھ والی نشست پر جم کر بیٹھ گیا، دوسرا میرے قریب آ کر بڑے خشک لہجے میں بولا۔

”تم کس طرح اندر گھس آئے؟ یہ ڈبہ تو صرف ایک ہی عملی کے لئے نکلا ہوا تھا۔“

انکا میرے جواب دینے سے پیشتر ہی سر سے اتر گئی۔ بٹے کئے شخص کے پیچھے اچانک بدل گئے۔ بڑی نرمی سے بولا۔

”شما کرنا مہاراج، میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ دھرم کرم کے معاملے میں ہم کی خدمت پہنچا رہی ہے اُلجھنے کی غلطی نہیں کرتے۔“

وہ انکا کے دیر اثر تھا۔ میں نے برا سامنا بنا کر اُسے ہاتھ کے اشارے سے دھکا دیا۔ وہ ہاتھ باندھ کر ہجوم میں گھس کر اُسے انداز میں تھوڑا سا جھکا، پھر اپنے ساتھی کے پاس ہاکر سرگوشی کرنے لگا۔ میں نے پھر اپنی ہوتی ہوئی نظر امریتا کے چہرے پر ڈالی، اُس کی اجنبیت کا انداز مجھے ڈس رہا تھا۔ اگر وہ نارنگ کے جیسے قد اور منتری کی چہیتی تھی تو پھر اُسے اپنے محافلوں سے اس قدر خوفزدہ بھی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ کھائی سفر کے دوران وہ بڑی اٹرا ماؤرات، بڑی بے باک نظر آتی تھی۔ اب اجنبیوں کی طرح کھانسی یا شایہ میرے صبر کا امتحان لے رہی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی مصلحت کے پیش نظر اُس نے زہما فظوں کی موجودگی میں مجھ سے بے تکلف ہونا پسند نہ کیا ہو۔

کچھ دیر بعد انکا دوبارہ میرے سر پر آگئی۔

”میں نے غلط نہیں کہا تھا نیل.....“ اُس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”ملا جگہ کی حسین اور چہیتی بیٹی جس کا نام امریتا ہے اس وقت بڑی بے بسی کا شکار ہے۔ قسمت نے تمہیں بے سنہری موقع دیا ہے۔ تم امریتا کی مدد کر کے نارنگ کا دل جیت سکتے ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں مضبوط ہو جائیں گے۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ میں نے وضاحت چاہی۔

”امریتا کے چار محافظ جو اس کی حفاظت پر مامور تھے، اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹے ہیں۔ یہ دو بٹے کئے آدمی جو تمہیں اس وقت نظر آرہے ہیں انہوں نے امریتا کو اغواء کرنے پر غائل بنا لیا ہے۔ ان کا تعلق نارنگ کے مخالف گروہ سے ہے، امریتا کے عوض وہ نارنگ سے بڑی سے بڑی رقم طلب کر سکتے ہیں، اپنی کوئی بات بھی منوانا سکتے ہیں۔“

”یہ کیسے ممکن ہے.....؟“ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”کیا دہلی کے ریلوے اسٹیشن، نارنگ سنا کے حفاظتی دستے کے دوسرے افراد امریتا کے استقبال کو موجود نہیں ہوں گے؟“

”استقبال تو تب ہوگا جب وہ دہلی پہنچ سکے گی۔“ انکا کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔

”امریتا کو دہلی پہنچنے سے پیشتر ہی راستے میں اتار لیا جائے گا۔ نارنگ کو خبر ہونے کی

اُس کو ایسی جگہ پہنچا دیا جائے گا جہاں پرندہ بھی پر نہ مار سکے..... اغواء کرنے والوں کی جڑیں بھی زیر زمین کام کرنے والوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔“

انکا سے تفصیل سن کر مجھے امریتا کے گم صم ہونے کی وجہ سمجھ آگئی۔ میں نے اُسے بغور دیکھا، آزاد فضاؤں میں چپکنے والی ببل اس وقت شکاریوں کے جال میں پھنسی بے بس نظر آ رہی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو جمیل.....؟“ انکا نے کہا۔ ”کیا امریتا کے حسن اور جسم کے گداز نے تمہیں متاثر نہیں کیا؟ ایک نظر بھر کر دیکھو، اس کی نس نس سے جوانی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والا سودا ہے۔ یہ بھی تمہاری آغوش میں مچلنے سے گریز نہیں کرے گی۔ نارنگ بھی تمہارا بے دام غلام بن جائے گا۔ بڑے بڑے پولیس آفیسر اس کا نام سن کر ہی تھر تھرانے لگتے ہیں۔“

”میں راستے میں اُلجھ گیا تو میرا سفر پھر لمبا ہو جائے گا۔“ میں نے دیدہ و دانستہ امریتا سے لائق کا اظہار کیا۔

”سمجھنے کی کوشش کرو یہ موقع بار بار ہاتھ نہیں آتے۔“

میں کچھ توقف کے بعد اپنی سیٹ سے اُٹھا۔ سید مجذوب کی لالچی میری گرفت میں تھی، انکا سبیل کی بیٹھ گئی۔ میں نے ننڈا کی قوتوں والے عمل سے خود کو محفوظ کر لیا۔ امریتا مجھے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر پہلو بد لے گئی۔ شاید وہ مجھے خطرے کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ اُسے یہ اندیشہ بھی لاحق ہوگا کہ بات بڑھ جانے کی صورت میں اغواء کرنے والے اُسے گولی بھی مار سکتے ہیں۔

میرے پاس قوتوں کی کمی نہیں تھی۔ پرستم لال نے کہا تھا کہ میں کسی جائز کام کے لئے اس کا نام لے کر جس خواہش کا خیال دل میں آوے گا وہ ضرور پوری ہوگی انکا کو بھی پرستم لال نے اپنی کچھ حیرت انگیز قوتیں سونپ دی تھیں۔ سید کی متبرک لالچی بھی میرے پاس تھی۔ مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔ میرے قدم جوں جوں آگے بڑھتے گئے، امریتا کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ دونوں بٹے کئے افراد بھی محتاط ہو گئے۔ جس نے مجھ سے بات کی تھی، وہ بیٹھا رہا۔ اُس کا دوسرا ساتھی بغلی ہولسٹر سے پستول نکال کر اُنھ کھڑا ہوا، خطرناک انداز میں غرا کر بولا۔

”جہاں بیٹھے تھے وہیں واپس جا کر سکون سے بیٹھ جاؤ مہاراج، ہم اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ دھرم کرم سے ہمارا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہم صرف اور صرف اولیاء کی زبان میں بات کرنے کے عادی ہیں۔ تم اپنا کام کرو، ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ اسی میں دونوں کی بھلائی ہے۔“

”سندری..... تمہارا نام امریتا ہے نا.....؟“ میں نے پستول والے کو نظر انداز کر کے براہ راست امریتا کو مخاطب کیا۔
”آں..... ہاں.....“ اُس نے ٹپکتے ہوئے جواب دیا۔ اس بار بھی اُس کی نظروں میں اجنبیت تھی۔

”تمہارے ساتھ یہ کون لوگ ہیں.....؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”تم..... تم اپنا کام کرو۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میرے معاف ہیں۔“
”سن لیا تم نے گرد دیو.....“ پستول والے نے مجھے تیز نظروں سے گھورا۔ ”اب چلے پھرتے نظر آؤ۔“

”میں نے تمہیں ڈبے میں بیٹھنے کی اجازت دی تھی، تم نے ہاتھ پاؤں نکالے۔“ میں نے اُس کے لئے دوسرے کے لہجے میں تلخی شامل ہو گئی۔ ”جاؤ بابا جاؤ، ہمارے متھے لگنے کی کوشش مت کرو.....“

”سندری.....“ میں نے پھر امریتا کو مخاطب کیا۔ ”میں تیری دُبدھا کا کارن سمجھ رہا ہوں۔ پرنتو کوئی چھتا نہ کر۔ میں جو تیری سہانٹا کو آگیا ہوں۔ ان اٹھائی کیرول اور بد معاشوں کا خوف دل سے نکال دے۔ شانت ہو جا، جو یہ دشت چاہتے ہیں وہ اب پورا نہیں ہوگا۔ تو میری شرن (پناہ) میں آ گئی ہے۔“

پستول والے کا دوسرا ساتھی بھی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا پستول بھی نکل آیا۔ انکارانی رفتاری سے رنگتی میرے سر سے اُتر گئی۔ امریتا کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ میں بدستور سینہ تانے اپنی جگہ کھڑا رہا۔

”راجو.....“ دوسرے شخص نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ ”اُسے ٹھکانے لگا کر لاش بڑی سے باہر پھینک دے۔“

مجھے راجو کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اُس نے پستول فضا میں بلند کیا۔ میں نے سید کی انھی

درمیان میں کر لی۔ راجو کے پستول سے یکے بعد دیگرے چھ شعلے لپکے..... چھ پھول میرے قدموں میں پڑے نظر آنے لگے۔ دوسرا شخص بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا، سید کی لائچی اُس پر اُچھال دی۔ وہ بلبلا تا ہوا اوندھے منہ گرا۔ پھر امریتا کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ راجو پستول پھینک کر اپنے ساتھی پر پڑھ بیٹھا۔ جیب سے ریشم کی مضبوط ڈور نکال کر اُس نے زمین پر گرے ہوئے بد معاش کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے سختی سے باندھ دیئے، پھر اُس کے پاؤں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا..... وہ راجو کی شان میں مغفلات گالیاں بکتے لگا۔

میں نے انھی زمین سے اٹھا کر اُس کے سر پر مار دی۔ اُس کے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں بلند ہوئیں، پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

”میرے لئے کیا حکم ہے مہاراج؟“ راجو ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔
”مجھے..... پانی..... پہاڑ کے نیچے آیا تو گر گڑا نے لگا۔ پہلے بڑا اُچھل کود رہا تھا۔“ میں نے دل میں پرہیز لال کا نام لے کر اُسے حکم دیا۔ ”اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے.....“

”نا تو نے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“
راجو نے کسی سعادت مند بچے کی طرح اپنی آنکھوں کا ٹکچہ بنا کر گلے میں ڈال لیا۔ اُس کے دونوں آنکھوں پوری قوت سے ٹینٹوے پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں حلقوں سے لپکے لگیں۔ حلق سے گھٹی گھٹی ہوئی خوفناک آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر اُس کی زندگی کا چراغ اُس کے ہاتھوں بجھ گیا۔ وہ بھی ذمیر ہو گیا۔ امریتا دوڑ کر بے اختیار میرے سینے سے لپٹ گئی۔ اُس کے جسم کی تپائی، اُس کے سینے کی دھڑکنیں میرے اندر کے شیطان کو اکسائے لگیں۔ میں اُسے ہاتھوں کے درمیان لئے اپنی نشست کی طرف واپس آ گیا۔ وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی۔ عجیب صورت تھی، موت کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ خوفزدہ ہو کر تھر تھرا رہی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ پہلے وہ گم صم بنی بیٹھی تھی۔

”جسٹیل.....“ انکا کی آواز میری قوت سماعت سے نکرائی۔ ”میں گارڈ کے سر پر جا رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے امریتا کے اغواء کی سازش میں اُس کا بھی ہاتھ شامل ہو۔ لیکن اب یہ کاڑی دہلی پہنچنے سے پیشتر راستے میں کہیں نہیں رکے گی۔ تم پریشان مت ہونا۔ مجھے گارڈ کے علاوہ

انجی ڈرائیور کو بھی قابو کرنا ہوگا۔ تم چاہو تو بے قابو ہو جاؤ۔ امریتا اس وقت تمہاری کسی خواہش سے انکار نہیں کرے گی۔“

انکارانی جی میں امریتا کو نارمل حالت میں لانے کی خاطر تسلیاں دیتا رہا۔ میرا خیال تھا ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد مجھے پہچان لے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دہشت کی کیفیتوں سے نجات پانے کے بعد وہ ہونٹ چباتی مجھ سے دُور ہو گئی، مدغم لہجے میں بولی۔

”تم نے میرے اوپر جبرائیل کیا ہے وہ میں سارا جیون یاد رکھوں گی۔ تم نے اگر بروقت میری مدد نہ کی ہوتی تو نہ جانتے کہ کیا انجام ہوتا۔“ آخری جملہ ادا کرتے وقت اُسے جھرجھری آگئی۔ سب سے لہجے میں کہے گئے۔ ”میں دونوں نے میرے باڈی گارڈس کو بڑی سفاکی سے قتل کیا تھا۔ مجھے دوا اس نہیں تھا کہ میں ان کا قید سے آزاد ہو سکوں گی۔ انہوں نے مجھے بڑے خطرناک نتائج کی امکان دی تھی۔“

”شاید اسی لئے تم نے مجھ سے گریز اختیار کر رکھا تھا؟“ میں نے اُسے سرکدینے کی کوشش کی۔

”کیا مطلب.....؟“ اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟“

”ہاں.....“ میں نے اُسے یاد دلانے کی خاطر کہا۔ ”ہم لندن سے ہندوستان آنے وقت جہاز میں ایک ساتھ تھے۔ زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔“

وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کی نگاہوں میں عجیب سی الجھن پیدا ہوئی۔ ”مجھے یاد نہیں آرہا۔“ اُس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

میرے ذہن میں اُٹھل پھٹل شروع ہو گئی۔ لفظی سفر کے دوران اُس کا خود چل کر میرے پاس آنا، بے تکلفی سے باتیں کرنا، اپنا سیت اور پرانی واقفیت کا اظہار کرنا، معنی خیز گفتگو کا انداز، حسین چہرے پر کھیلنے والی شوخی و شرارت، ایک ساتھ کھانا کھانا، اُس کے ہونٹوں کے گداز پر ابھرنے والی مقناطیسی مسکراہٹ۔ مجھے اُس کا ایک ایک انداز یاد آ رہا تھا۔ لیکن اُس نے سرے سے مجھے پہچانے سے انکار کر دیا تھا۔

”تم فرسٹ کلاس میں سفر کر رہی تھیں۔ کچھ دیر کے لئے اُٹھ کر اکانومی میں میرے پاس آ گئی تھیں۔“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”امرتا..... یہ نام بھی تم ہی نے

مجھے بتایا تھا۔“

”ممکن ہے آپ کی نظروں کو دھوکا ہو رہا ہو، جس لڑکی کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ میری ہم شکل رہی ہو۔ اُس کا نام بھی امریتا ہو سکتا ہے۔“ اُس کے لہجے میں بھولپن تھا، وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی۔ لیکن جو کچھ میں کہہ رہا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا۔

”تم نے مجھ سے مختصر گفتگو کے درمیان گرو پرتاپ کا نام بھی لیا تھا، وہ تمہارے ساتھ تھا۔ کچھ یاد آیا.....؟“

”گرو پرتاپ.....“ اُس کی سبھی سبھی نظروں میں ارتعاش کی کیفیت نمودار ہوئی۔ سنجیدگی سے بولی۔ ”ہاں..... میں گرو پرتاپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ پتاجی اُن کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ میں جب بھی بیرون ملک جاتی ہوں، گرو جی میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ لندن سے واپسی پر بھی وہ میرے ساتھ تھے۔ لیکن آپ.....“ اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر اپنی یادداشت کریدنے لگی۔

”میرا نام جمیل احمد خان ہے.....“ میں نے اُسے اپنا نام بتایا۔

”یہ نام بھی میں آپ کے منہ سے پہلی بار سن رہی ہوں۔“

میرا دل چاہا کہ اُس کی باتوں پر قہقہہ لگانا شروع کر دوں۔ میرے سینے میں اُس کی تصویر ابھرنے لگی تھی۔ ایک ایک نقش میری نگاہوں میں کندہ تھا۔ اُس کی آواز، اُس کے دل لہانے کا انداز، اُس کی شوخ مسکراہٹیں، لگاؤ کی باتیں، سب کچھ ویسا ہی تھا، میں بھی وہی تھا۔ لیکن وہ بدل گئی تھی۔ عام زندگیوں میں بھی فلمی کہانیوں جیسے حیرت انگیز اتفاقات ہو سکتے ہیں۔ ایک شکل کی دہرائی ہو سکتی ہیں، ان کے نام بھی ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ میں اُس کی بات تسلیم کر لیتا لیکن گرو پرتاپ کے حوالے کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی اُس کی اجنبیت کی باتیں میرے لئے کسی معنی سے ممتلئی تھیں۔ شاید وہ مجھ سے مذاق کر رہی تھی۔ ممکن ہے کوئی اور مصلحت رہی ہو۔ ہو سکتا تھا اُسے اپنے ملک میں وہ آزادی حاصل نہ ہو جو بیرون ملک رہی ہو؟ نارنگ سنہا کی طرف سے اُس پر کچھ پابندیاں عائد ہوں؟ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اُس کے حلقے میں بھی سب اُنچے طبقے کے افراد ہوں گے، اُس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، گھومنا پھرنا سب کچھ ایک طے شدہ پروگرام اور نام نہیل کے تحت عمل میں آتا ہوگا..... لیکن میں اُس کا محسن تھا، میں نے اُس کی جان بچائی تھی۔ دہلی کے ریوے اسٹیشن

پر وہ میرے متعلق اپنے باپ سے اور کیا تعارف کرا سکتی تھی؟..... پھر وہ مجھے پہچاننے سے کیوں نہیں کر رہی تھی؟.....؟

”جو لوگ ہمیں اغواء کر رہے تھے وہ کون تھے؟“ میں نے موضوع بدل دیا۔ ”اُن کا مقصد کیا تھا؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں.....“ اُن نے شانے اچکا کر جواب دیا، پھر رستی میں بندھے شخص کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ مر گیا؟“

”نہیں.....“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”اگر یہ بھی مر گیا تو پھر میری زندگی کی ضمانت کون دے گا؟“

”آپ گرد پر تاپ کو کیسے جانتے ہیں؟“ اُس نے پھر پوچھا۔ ”تم اس سے زیادہ جان کر کیا وہ گروتھا، میں چلیا۔“ میں نے اختصار سے کام لیا۔ ”تم اس سے زیادہ جان کر کیا کرو گی؟“

”آپ..... آپ بھی مجھے مہمان شکستوں کے مالک نظر آتے ہیں۔“ اُن کی جملہ باتوں میں پھر خوف کی تپخت نظر آنے لگی۔ ”ایک لنگے نے آپ پر فائر کیا، میں نے اسے مار دیا۔“

”میرا خیال تھا کہ آپ کو مارنے کے بعد وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ میں نے دوسرے کی چیخ کی آواز سن کر آنکھیں کھولیں تو حیرت زدہ رہ گئی۔ آپ کے چہرے پر پھول پڑے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئے۔ پھر آپ نے اپنی لالچی دوسرے پر اچھال دی، وہ پستول رکھنے کے باوجود آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ جو کچھ میری نظروں نے دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ ایک پل کو میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ میں شاید جاگتے میں پتہ نہ دیکھ رہی ہوں۔ ایک نے دوسرے ساتھی کے ہاتھ رستی سے باندھ دیے، اس کے بعد آپ کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا..... آپ کے کہنے پر اُس نے جیو ہتیا کر لی۔“ اُس نے پہلی بار مجھے عقیدت مندی کی نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے وشواس ہے کہ آپ بھی گرد پر تاپ سے کم نشئی کے مالک نہیں ہیں۔ گرو جی بھی ایسے ایسے چنگار دکھاتے ہیں کہ سب انہیں جھبے میں پڑ جاتے ہیں۔ ڈیڈ آپ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوں گے۔ وہ پنڈت پجاریوں کی سوا کرنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں.....“

”تمہیں مجھ سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی؟“ میری آنکھیں پھر سلگنے لگیں۔

”کیوں نہیں.....“ وہ تیزی سے بولی۔ ”آپ دیوتا سامان ہیں۔ میں آپ کے چہرے کی راسی ہوں۔“

”داسی دیوتاؤں سے اتنی دُور..... الگ تھلک نہیں بیٹھتی۔“ میں نے اُسے اُکسانے کی کوشش کی۔ ”اندر کی سجا کی رنگین کہانیاں نہیں سنیں تم نے؟.....؟“

اُس کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور تبسم ابھر آیا۔ میرے دل کی کلی چٹختے لگی۔ وہ شرما کر بولی۔ ”مجھے اندر کے اکھاڑے کی کہانیاں عجیب لگتی ہیں۔“

”کیوں.....؟“ میں نے معزاب کے تاروں کو چھیڑا۔ ”یقین نہیں آتا.....؟“

”ایک بات میرے من میں کھٹک رہی ہے۔“ وہ پھر کسی بام مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسلنے لگی۔ ”مجھے دیکھ کر سنجیدگی سے بولی۔ ”پوچھ لوں..... آپ برا تو نہیں منائیں گے؟“

”پہلے کسی منش نے تمہاری من موہ لینے والی باتوں کا برا منایا ہے؟“ میں نے پہلو بدلا۔ وہ مسکرا دی۔

”آپ کا شہ نام جمیل احمد خان ہے۔ لیکن.....“ اُس نے جان بوجھ کر جملہ پورا نہیں کیا۔ میں اُس کی بات کا مفہوم بھانپ کر بولا۔

”نشئی اور طاقت کسی دھرم، کسی ذات پات کی پوچھی نہیں ہوتی۔ جو من مار لیتا ہے، گیان دھیان میں لگ جاتا ہے، وجے کیول اُسی کی ہوتی ہے۔ اپنے اپنے وشواس، اپنے اپنے جن کی بات ہے۔ باتوں میں کیا دھرا ہے۔“ میں نے بات جاری رکھی۔ ”میں تمہیں شکستہ کے نام سے پکاروں، کیا تم مجھے لاجدشیت سمجھ کر میری باتوں میں سما جاؤ گی؟“

”آپ.....“ وہ شرما کر بولی۔ ”آپ شاید کالی داس کے لکھے نائک کی بات کر رہے ہیں؟“

”یہ جیون بھی کسی نائک سے کم تو نہیں۔“ میں نے اُسے یاد دلایا۔ ”کچھ دیر پہلے جوہور ہا تھا وہ بھی ایک نائک تھا۔ میں تمہارے بھاگیہ سے یہاں نہ ہوتا تو اس نائک کا انت بھیا ناک ہوتا۔ وہ تمہیں ہر بات پر مجبور کر سکتے تھے۔ تم اُن کے قبضے میں تھیں۔ وہ دو تھے، مسلح تھے۔ تم اپنے باڈی گارڈس کا انجام دیکھ چکی تھیں۔ تم انکار کی سچائی نہیں سمجھیں۔ وہ تمہیں کسی نام سے پکارتے تھے تم اُن کے اشاروں پر تاپنے کو آمادہ ہو جاتیں۔ جیون سے اندر اور کوئی شے نہیں ہوتی، اسے بچانے کے کارن منش اپنا سب کچھ بلیدان کر دیتا ہے۔ پاپ

اور ان کی باتیں تو من کا بہلا واپس۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟

وہ اپنی جگہ کسمسے لگی۔ میری باتوں نے اُس کے وجود میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں تجربے کا رتھ اوڑھ بیٹھی۔ میں نے اُسے اشارے سے قریب آنے کو کہا۔ اُس نے خود کو داسی کہا تھا، دیوتا کی بات ماننا اُس کا حرم تھا۔ وہ شرماتی لپاتی میرے قریب آ کر قدموں میں بیٹھنے لگی۔ میں نے بارگاہِ حرم سے پہلو میں بٹھا لیا۔ اُس کا قرب قیامت تھا۔ میں چاہتا تو جنوں کا مظاہرہ کر کے اسے اپنا بھروسہ کی گرمی سے پکھلا دیتا۔ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ میں نے اُس کی لپٹ میں جھپٹ لی تھی۔ وہ قرض چکانے میں زیادہ پس و پیش نہ کرتی۔ لیکن میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اُس کی زلفوں سے کھیل رہا، اُسے لبھانے کی باتیں کرتا رہا۔ ہمارے درمیان سے محبت کی دواں دیاں بکے لگیں۔ اُس کا اعتماد بحال ہوا تو وہ بھی پرت پرت کھلنے لگی۔ مجھے اپنے اور نارنگ سنہار کے نام سے میں تفصیلات سے آگاہ کرتی رہی۔ میں نے فضائی سفر کے دوران ملاقات کا ذکر دوبارہ چھیڑا۔ اُنسی نے پھر بڑے یقین سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں اُلجھنے لگا۔ لیکن اُس کی باتوں نے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہونے دیا۔

انکارانی نے غلط نہیں کہا تھا۔ ٹرین کی اسٹیشن پر نہیں رکی۔ دہلی کا اسٹیشن قریب آنے لگا تو وہ میرے سر پر واپس آ گئی۔ بڑی چاق و چوبند دکھائی دے رہی تھی۔

”سفر کیسا گزرا جمیل.....؟“ اُس نے امریتا کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ابھی منزل دُور ہے.....“ میں نے سنبھل کر کہا۔

”اچھا کیا جو تم نے جلد بازی سے کام نہیں لیا۔“ وہ یلختنہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”باہر کے

حالات بڑے نازک ہو گئے ہیں۔ ہر طرف ہنگامہ ہو رہا ہے، گاڑی کا درمیانی اسٹیشنوں پر نہ رُکنا کوئی مذاق نہیں ہے۔ مسافروں میں بھی افزائری پھیل گئی ہے، ریلوے کے کام الگ سرکھیا رہے ہیں۔ اُن کے لئے اوپر والوں کے سوالات کا کوئی جواب دینا مشکل ہو گیا ہے۔ خیالی گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ انجن کا بریک فیل ہو گیا ہے جس کا انجام تباہی ہوگا، کچھ سرکاری افسر اسے گاڑی کے انواء کا نام دے رہے ہیں۔ ہر شخص پریشان ہے۔ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی، چاروں طرف تہلکہ مچا ہوا ہے۔ ٹیلیفون کھڑکھڑائے جا رہے ہیں، اخبار نویسوں کے ہاتھ ایک دلچسپ سرفی آ گئی ہے۔ سب

سے زیادہ نارنگ سنہار پریشان ہے۔ وہ اس وقت دہلی کے اسٹیشن پر کسی زخمی شیر کی طرح ٹھٹھکتا پھر رہا ہے۔ فوج کا ایک دستہ بھی بلا لیا گیا ہے، گاڑی کو روکنے کی خاطر مختلف انتظامات کئے گئے ہیں..... گاڑی رُکے گی تو سب کی توجہ تمہارے اپارٹمنٹ کی طرف ہوگی۔ نارنگ کی وجہ سے کسی کو مسافروں کی نہیں، صرف امریتا کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ تم ہیرو بن جاؤ گے۔ جس گروہ نے امریتا کو انواء کرانے کا کام سرانجام دیا تھا اُن کے درمیان بھی کھلبلی مچی ہے۔ نارنگ کو امریتا کے محافظوں کے قتل کی اطلاع مل چکی ہے۔ اُس نے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ دل ہی دل میں منصوبے بنا رہا ہے۔ بڑا گھاگ آدمی ہے۔ تمہیں ایک بات اور بتا دوں، نارنگ کے بنگلے میں اس وقت کئی جفاکاری پنڈت جمع ہیں، وہ بھی اپنے جنت منتر آزار ہے ہیں۔ ان پنڈتوں میں نول کشور کا ایک نائب بھی ہے۔ نارنگ اُس پر بڑا اعتماد کرتا ہے۔ اُسے فوری طور پر ہر دوار سے ایک مخصوص طیارہ بھیج کر دہلی بلا لیا گیا ہے۔ تم ذرا دُور اندیشی سے کام لینا۔ نارنگ کا اعتماد جیتنے کے ساتھ ساتھ تم پنڈت نول کشور کے نائب کو جہنم رسید کر کے اُسے بھی اپنی طاقت کا احساس دلا سکتے ہو.....“

میں انکارانی کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ امریتا میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ جس شخص کے ہاتھ پیر پڑے ہوئے تھے، وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ اُس نے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالی، حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ پنڈت نول کشور کا نام سن کر میرے اندر دہلی چنگاریاں پھیلنے لگیں۔ میں نے طے کر لیا کہ اُس کے نائب کو بڑی اذیتاں موت سے دوچار کروں گا۔ ہر دوار پہنچنے سے پہلے یہ میرے لئے ایک نیک شگون ہوتا۔ دشمن کی صفوں میں بے چینی کی لہر دوڑ جائے.....!

کچھ دیر بعد گاڑی دہلی کے پلیٹ فارم پر رکی۔ میرے کپارٹمنٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ یکے بعد دیگرے چار کمانڈوزر داخل ہوئے۔ انہیں پھرتی سے دندا تے ہوئے اندر گھس آئے۔ انہوں نے مجھ پر رائل تان کر ہاتھ لگائے۔ حکم دیا۔ میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ امریتا اٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تہی ہوئی رائفلوں کا رخ زمین کی طرف ہو گیا۔ کمانڈوز نے امریتا کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کچھ نہ کچھ حیرت محسوس کی۔ کمانڈوز نے کچھ دروازے سے باہر پلیٹ فارم پر دُور دُور تک صرف وردیوں میں ملبوس شخص افراد نظر آ رہے تھے۔ ایک کمانڈو نے لپک کر اُن دونوں بد معاشوں کے سر پر پوزیشن سنبھال لی جس

میں سے ایک پر لوک سدھار چکا تھا۔ دوسرے نے صورت حال کی نزاکت محسوس کر کے اپنے ملازمین کو تلوے پہنچ لئے تھے۔ دو کمانڈوز کی نظریں مجھ پر اور امریتا پر مرکوز تھیں۔ چوتھے کمانڈو نے دروازے پر پہنچ کر سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا فضا میں بلند کر کے جویشن کنٹرول میں ہونے کا مخصوص اشارہ دیا تو سب سے پہلے نارنگ سنبھا اندر داخل ہوا۔ اُس نے دعوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا، آنکھوں پر سیاہی فریم کی عینک موجود تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ مجھے قد اور شخصیت کا مالک محسوس ہوا۔ امریتا کو ڈر کر باپ کے سینے سے لگ گئی۔ نارنگ کے چہرے کا تناؤ بتدریج کم ہونے لگا۔ وہ رکا نہیں، امریتا کا ہاتھ تمام کر باہر نکل گیا۔ دونوں کمانڈوز نے پھر راکفل تان لی۔ انکا تیزی سے میرے سر سے اتر گئی۔

جو کچھ ہوا، آنا فانا ہوا۔ نارنگ کے جانے کے بعد امریتا کی پادری افسران ڈبے میں آ گئے۔ وہ صورت حال سمجھنے کی کوششوں میں مصروف تھے جب ایک فوجی منسٹر تیزی سے بھاگتا ہوا ڈبے میں آیا، مجھ سے کہنے لگا۔ ”مہاراج، آپ کو منسٹر جی سے ملنا ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھے آپ کی راہ تک رہے ہیں۔“

میں خاموشی سے سید کی لائٹی تھا مے اٹھا۔ سب کی نگاہیں میری اصلیت جاننے کی خاطر بے چین ہو گئیں۔ میں اُن کے درمیان سے گزرتا ہوا باہر آیا۔ فوجی افسر میری رہنمائی کرتا ہوا پلیٹ فارم کے باہر کھڑی فلیگ کار (FLAG CAR) تک لے گیا۔ باوردی ڈرائیور نے اگلی نشست کا دروازہ کھولا، میں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پچھلی نشست پر امریتا اپنے باپ کے سینے سے لگی بیٹھی کچھ سرگوشیاں کر رہی تھی۔ نارنگ کا چہرہ گرگٹ کی طرح رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اندر آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی چل پڑی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا.....!

نارنگ کی سرکاری کوئی پر اُس کے اہکاروں نے میرا خاطر خواہ استقبال کیا، مجھے کوئی خاص مہمان خانے میں جگہ ملی جبکہ پنڈت پجاریوں کو انیکسی میں ٹھہرایا گیا تھا۔ شام کی چائے مجھے میرے کمرے میں پہنچائی گئی، لیکن رات کے کھانے پر میرا بلاوا آ گیا۔ میں نے سید کی لائٹی کو اس وقت بھی ساتھ رکھا۔ ڈزنیبل پر نارنگ اور امریتا کے علاوہ ایک اڈیٹر کی بد وقار عورت بھی موجود تھی۔ امریتا اور اُس کے چہرے کے نقوش میں بڑی مماثلت تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سبز نارنگ ہوگی۔

ملازموں نے کھانا پیش کیا۔ نارنگ خلاف توقع بہت خاموش تھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ اُسے امریتا کے صحیح سلامت گھر آ جانے کی خوشی ضرور تھی، لیکن وہ اپنے دشمنوں کے بارے میں اس وقت بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اُسے تفصیل سے دیکھا۔ وہ قابل رشک صحت کا مالک تھا۔ اُس کی نظروں میں سمندر جیسی گہرائی تھی جس کے اندر ہزاروں طوفان چل رہے تھے..... وہ زیادہ باتونی بھی نہیں تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ جبکہ اُس کی بیوی اوشا کماری ہر شخص سے بہت جلدی کھل مل جانے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی وہ مجھ سے کرید کرید کر امریتا کے اغواء کی تفصیل معلوم کر رہی تھی۔

امریتا بتا رہی تھی کہ وہ دونوں بد معاش مسلح تھے، ہٹے کئے تھے لیکن تم نے انہیں اس طرح قابو کر لیا جیسے کوئی سپیرا اپنے سے زیادہ طاقتور اور زہریلے سانپوں کو قابو کر لیتا ہے..... مجھے بتاؤ، یہ سب کچھ کس طرح ممکن ہوا.....؟“

”سپیروں کی طرح میرے پاس بھی یہ بین موجود ہے۔“ میں نے سید کی لائٹی کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کے علاوہ بلوانوں کی سنگت میں بھی بیٹھا اٹھا ہوں۔ اُن سے بھی کچھ سیکھ سیکھ ہیں.....“ میں نے آخری جملے کی ادائیگی میں انکساری سے کام لیا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مہاراج گرو پر تاپ سے بھی واقف ہیں۔“ امریتا نے بیچ میں لقمہ دیا۔ ”مگر یہ سب ہوتے تو شاید وہ دونوں.....“

”بے بی.....“ نارنگ نے امریتا کو ٹوکا۔ اُس کا لب و لہجہ بڑا خشک اور کھردرا تھا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ جو ہو چکا ہے چل جاؤ.....“

”جو بد معاش زندہ ہاتھ آیا ہے، اُس کے کچھ اگایا ابھی تک زبان پر تالے ڈال رکھے ہیں؟“ اوشا کماری نے شوہر سے پوچھا۔

”ایجنسیاں اپنا کام کر رہی ہیں۔“ نارنگ نے الجھن جواب دیا۔ ”تم اپنی مصروفیات گھر کے کام کاج تک ہی محدود رکھا کرو۔“

انکا میرے سر پر تھی۔ وہ بار بار آتی جاتی رہی تھی۔ اُس کی زبان مجھے بہت ساری معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ جو غنڈہ زندہ ہاتھ آیا تھا مجھے اُس کے انجام کا بھی علم ہو گیا۔ اُس نے کچھ ہی دیر پہلے وہ مختصر سا زہریلا کپسول کھا کر خودکشی کر لی تھی جو اُس کی مصنوعی

ڈاڑھ کے اندر پوشیدہ تھا۔ اور بھی بے ثبات تھیں میرے علم میں آچکی تھیں۔

”میرے کسی غلطے کا ذکر کر رہی ہو وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“ میں نے اوشا کو ماری کو مخاطب کیا۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ نارنگ کو اس حادثے کی اطلاع مل چکی تھی یا وہ ابھی تک لاعلم ہی تھا۔

”کیا کہا آپ نے.....؟“ نارنگ نے ہاتھ میں دبے ہوئے نوالے کو واپس پلیٹ میں ڈال کر میری طرف چونک کر دیکھا۔ ”نالی مر گیا.....؟“

”وی.....“ میں نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”ایجنسیاں جس کی اکھاڑ پھچاڑ میں اپنا سے برباد کر رہی تھیں۔“

”آپ..... آپ میرے ساتھ آئیں مہاراج.....“ نارنگ کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ گیا۔ مجھے بھی اُس کی پیروی کرنی پڑی۔ وہ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ کچھ دیر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا، پھر خشک آواز میں بے حد تنگی سے بولا۔ ”میری اطلاع کے مطابق آپ نے ایک پل کے لئے بھی اپنے کمرے سے باہر قدم نہیں نکالا، پھر وہ باہر سے آپ کو کس طرح معلوم ہو گئی جو ابھی تک مجھے بھی.....“

نارنگ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ کمرے میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ پھر دوسری جانب سے اُسے جو اطلاع ملی اسے سن کر وہ دیوانہ ہو گیا۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھوں سے درنگی جھانکنے لگی۔

”تفتیشی افسران کو جو تے مار کر ملازمت سے برطرف کر دو، سب تھکتے ہیں۔ حرام کی روٹیاں توڑتے ہیں۔“ وہ بڑی گرجدار آواز میں اپنا حکم سنارہا تھا۔ سب کو ایک ہی جگہ ہاؤس اریسٹ کر دو، وہاں کسی پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں ملنی چاہئے۔ جب تک بے بی کے سلسلے میں فاسل رپورٹ میرے سامنے نہ آجائے تمام خبریں ٹاپ سیکرٹ ہوں گی۔ کسی کو ہوا بھی نہ ملے۔“

فون پر گفتگو کرنے کے بعد ایک لمحے وہ اپنی جگہ کھڑا بیچ و تاب کھاتا رہا، پھر میرے قریب آ کر بولا۔

”مہاراج..... تم امریتا کے اغواء کے سلسلے میں اور کیا کچھ بتا سکتے ہو.....؟“

”اب تک جو پنڈت پجاری یہاں سر جوڑے بیٹھے جم کنڈلی بنا رہے ہیں، بڑے

اُونچے سروں میں بول رہے تھے، اُن کا کیا کہنا ہے؟“ میں نے چہیتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو نارنگ بل کھانے لگا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ”اپنی اپنی پٹاریوں میں ہاتھ ڈال کر کچھ نہ کچھ تو کھوجا ہوگا۔ اور وہ جسے خاص طور سے ہر دوڑ سے اُڑن کھٹولا بھیج کر بلایا گیا ہے، وہ کیا چٹکار دکھا رہا ہے؟ کیول تن پر چندن تھوپ لینے، ماتھے پر آڑی ترچھی ریکھائیں کھینچ لینے سے بات نہیں بنتی بالک.....“ میں نے نارنگ کو اپنی برتری کا احساس دلانے کی خاطر ٹھوس آواز میں کہا۔ ”جو گرجتے ہیں وہ برسنے کی شقی نہیں رکھتے۔ مداری کی طرح کھیل تماشا دکھانے والے دھرتی کے بھیتر نہیں جھانک سکتے ہیں۔ جو دم نہ سادہ سکے وہ ساگر کی تہوں میں جا کر وہ سیپ نہیں پاسکتا جس کے اندر انمول موتی ہوتا ہے۔“

نارنگ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ انکا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے سامنے اُونچی آواز میں بولنے والوں کو برداشت نہیں کرتا۔ اُس کی تیز نظریں میرے اوپر کسی بھوکے گدھ کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ وہ میری وحشتوں، میرے جنون کی کیفیتوں سے ناواقف تھا۔ میں نے لوہے کو تپا کر ایک کاری ضرب اور لگائی۔

”مجھے لال پیلی نظروں سے مت گھور بالک، تمہاری جھولی میں کیول ایک ہی کھرا سونا تھا، اُسے دُرگا کا عتاب نکل گیا۔ میں گرو پرتاپ کی بات کر رہا ہوں..... وہ زندہ ہوتا تو آنکھ موند کر امریتا کو اغواء کرنے والوں کی ساری کھٹا سنا دیتا۔“ میں دینگ آواز میں بولتا رہا۔ ”تم نہیں جانتے، میں بتاتا ہوں۔ گرو پرتاپ نے مجھے بچانے کی خاطر اپنا جیون بھیٹ چڑھا دیا، یہی کی جاتی ہے۔ میں نے کالی داس اور پنڈت اوم پرکاش کے قتل کا الزام لگا دیا تھا مجھ پر۔ میری چوڑی پر کوڑے برسائے گئے۔ میں نے سانس روک لی۔ تھک ہار کر اُنہوں نے میرا معاملہ عدالت پر چھوڑ دیا۔ میں نے حقارت کا اظہار کیا۔“ تم نے یہی کے ڈی آئی جی روی شکر کا نام ضرور سنا ہوگا۔ اُس نے ایک میانی دھیانی پنڈت پر بھودیا ل سے مجھے ٹھکانے لگانے کا سودا کیا، جانتے ہو پھر کیا ہوا؟ پر بھودیا ل جلی کر کوئلہ ہو گیا۔ بات دبا دی گئی۔ لیکن اب روی شکر کے ستارے بھی بھونچال کی لپیٹ میں آ گئے ہیں، تم نے اخباروں میں ضرور پڑھا ہوگا۔“

نارنگ کی آنکھیں شعلے اُگل رہی تھیں۔ مجھ سے پیشتر شاید کسی نے اُس کے سامنے سینہ تان کر اتنی اُونچی آواز میں بات نہیں کی ہوگی۔ شاید امریتا نے اُسے میرے بارے میں جو

کچھ بتایا تھا اسی کی وجہ سے وہ مجھے برداشت کر رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے لازم و ملزوم اڑھائی کر کے اب تک کوٹھی سے باہر پھینک چکے ہوتے۔

”مجھے افسوس ہے بالک.....“ میں نے اسے خاموش دیکھ کر بے پرواہی سے کہا۔
”مجھے اپنے پکڑاؤں میں مت الجھاؤ، مجھے جانے دو۔ ہر دور سے آنے والے پنڈت شیوا کو روک لو۔ باقی سب کی چھٹی کر دو۔“ میں نے شیوا کے سلسلے میں سرسری انداز میں کہا۔ ”وہی دس پندرہ دن اٹھک بیٹھک لگاے تو شاید تمہاری کوئی سہانا کر سکے۔ سمجھ رہے ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”زندہ باد جمیل..... زندہ باد۔“ انکارانی نے بڑے ستاشی انداز میں میری تعریف کی۔
”اسی طرح ڈٹے رہو۔ میں اوشا کمار کی سرپرستی کرتا ہوں۔ تم دیکھنا ابھی یہ نارنگ تمہارے آگے ہاتھ باندھے کھڑا ہوگا۔“

انکارا میرے سر سے اتر گئی۔ میں اوشا کمار کی حوالے پر اس کی بات کا غم سمجھ گیا۔
میری نظریں نارنگ کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ بھی کسی چٹان کی طرح اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا۔
”اتنے دھیان سے کیا دیکھ رہے ہو؟ میں یہاں خود سے نہیں آیا۔“ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”یہ اتفاق ہی تھا جو میں بھول سے غلط اپارٹمنٹ میں بیٹھ گیا۔“
میری بھول امریتا کے کام آگئی۔ وہ سندر، بھولی بھالی معصوم لڑکی ہے۔ کسی نازک بھول جیسی۔ اب اس کی رکشا پر زیادہ دھیان دینا۔ سانپ کی ذمہ دیر تلے آ جائے تو وہ پلٹ کر ڈسنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ سمجھ رہے ہو میرا مطلب؟ دشمنی کا کھاتا ایک بار کھل جائے تو آسانی سے بند نہیں ہوتا۔ تمہارے دشمن بھی چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“

”تم کیا جانتے ہو ان کے بارے میں جنہوں نے امریتا پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی کی تھی؟“
نارنگ نے زبان کھولی۔ اس کے لہجے میں گھمنڈ اور غرور کی آمیزش تھی۔

”دھیرج سے کام لے بالک.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”جو زیادہ چتر چالاک بننے کی بھول کرتے ہیں وہ زیادہ کھائے میں رہتے ہیں۔ بے کا انکار کر۔ سب کچھ تیرے سامنے آ جائے گا۔“

”مہاراج.....“ نارنگ پھر بل کھانے لگا۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ کھل کر کہو، کیا جانتے ہو میرے دشمنوں کے بارے میں؟“

”میری زبان پر بھروسہ کرے گا یا اپنی استری (بیوی) کی زبان سے سننا پسند کرے گا؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ کسمانے لگا۔

”اوشا کو میں گھر کے سوا کسی اور معاملے میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا۔“ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”میں تیری نہیں..... اپنی بات کر رہا ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“ نارنگ چونکا۔

مجھے جواب دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اوشا کمار کی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وہ انکا کی پراسرار قوتوں کے زیر اثر تھی۔ نارنگ نے اسے دیکھ کر برا سامنہ بنایا۔ وہ اوشا کو واپس جانے کے لئے یقیناً سخت زبان استعمال کرنے کے بارے میں غور کر رہا تھا لیکن اسے موقع نہیں ملا۔

”میری بات سنو نارنگ، میں تمہیں بتاتی ہوں کہ امریتا کس سازش کا شکار ہوتے ہوئے بچ گئی۔ وہ دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتی تو تم بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے۔ ان کا کہنا نہ مانتے تو وہ امریتا کے پھول جیسے شریکر ورنڈ ڈالتے..... تم جو سپنے دیکھ رہے تھے وہ بھی ادھر رہ رہ جاتے۔ بہت کچھ ٹھٹ ہو جاتا.....“

اوشا کمار کی کسی ریکارڈ کی طرح بھتی رسی۔ اس نے امریتا کے اغواء کی وہ تمام تفصیل بتا دی جو انکارانی کی دریافت تھی۔ میں سینہ تانے کھڑا سید کی لالچی کو آہستہ آہستہ زمین پر مارتا رہا۔ نارنگ سنبھلنے لگا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑا ٹکٹکی باندھے اوشا کو دیکھتا رہا جو کسی معمول کی طرح سپاٹ لہجے میں بول رہی تھی۔ کہانی پوری ہوئی تو وہ اس انداز میں اندر آئی تھی اسی طرح اُلے قدموں واپس چلی گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کمرے میں صرف میں اور نارنگ باقی رہ گئے۔ میں معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”مہاراج، میں تم سے ایک غلطی کروں گا۔“ نارنگ، انکارانی کے کہنے کے مطابق میرے سامنے ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”جو ڈھکی چھپی باتیں تم نے اوشا کی زبان سے کہی ہیں، اس کی بھنگ کسی اور کو نہیں ہونی چاہئے.....“

”حکم دے رہا ہے.....؟“ میں نے نظریں ترچھی کیں۔

”نہیں مہاراج..... نہیں۔“ وہ گڑبڑانے لگا۔ ”میں تمہیں حکم نہیں دے رہا۔ تمہاری شکتی اپنی طرف سے تم اوپر سے کچھ نظر آنے ہو لیکن تمہارے اندر کارو پ دیوتاؤں سان ہے۔ آج سے مجھے اپنا سیوک ہی سمجھو۔ مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو تو شفا کر دینا۔ میں تمہیں پہچان نہیں سکتا تھا۔“

”میرے سنے میں اپنی زبان بھی بند ہی رکھنا۔“ میں نے سرد آواز میں کہا۔ ”میں جیون کے بکھیزوں میں الجھنا پسند نہیں کرتا۔ جن دھرماتماؤں کو بلایا ہے اُن سے بھی کچھ نہ کہنا.....“

”میں اُن سب کی چھٹی کے دینا ہوں۔ تم کوئی چننا مت کرو۔“

”پنڈت شیوا کو روک لے۔“ میرے سامنے انداز میں کہا۔ ”مجھے اُس سے کچھ پرانا حساب کرنا ہے۔“

”جو آگیا (حکم) مہاراج.....“

نارنگ کا سارا کلف اُتر گیا۔ وہ میرا بے دام غلام بن گیا۔ میں خلائی سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ نارنگ نے مجھ سے کانا کھانے کا اصرار کیا۔ میں نے اُس کی درخواست رد کر دی۔ دن میں کئی بار اوشا کماری اور امرتا میری خیریت دریافت کرنے آتی رہیں۔ میں نے آخری بار امرتا کو پھر ہوائی سز کے بارے میں ٹھٹھا۔ اُس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ سفر کے دوران مجھ سے نہیں ملی تھی۔ اب جبکہ میرے اور اُس کے درمیان حجاب اُٹھ چکا تھا اُس کا دروغ گوئی سے کام لینا میری کج سے باہر تھا۔ میں نے بھی طے کر لیا کہ اس موضوع پر دوبارہ کوئی گفتگو نہیں کروں گا۔ امرتا کے مقابلے میں اوشا کماری مجھ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کی باتوں کا انداز، بار بار کھل کر قہقہے لگانا، آنکھوں میں مستی چھلکا کر ذوقی باتیں کرنا۔ انکارانی نے مجھے بتایا کہ نارنگ کے مخصوص ڈرائیور کے علاوہ اور بھی کئی جوان ملازم اوشا کماری کے جال میں پھنس کر بڑبڑا چکے ہیں۔ انکار کی جرأت کس میں تھی؟ جو زبان کھولتا اُسے مروا دیا جاتا تھا۔ قصور اوشا کماری کا بھی نہیں تھا۔ نارنگ مصروف آدمی تھا۔ شادی کے بعد امرتا کی پیدائش تک اُس کی دلچسپی قائم رہی، پھر بتدریج کم ہوتی گئی۔ اُس کی دل بنگلی کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ اوشا کماری نے کچھ عرصہ نارنگ کی واپسی کا انتظار کیا، پھر اُس نے بھی وقت گزارنے کی خاطر راستے تلاش کر لئے۔ نارنگ نے اُسے محض گھر تک محدود رکھا۔ اس لئے وہ ملازموں پر ہاتھ صاف کرتی رہی۔

کچھ پنڈت پجاری بھی اُس کے آشرم میں گھڑی دو گھڑی سستا کر اپنی پیاس بجھا لیتے تھے۔ نارنگ سخت گیر طبیعت کا مالک تھا، اُسے اوشا کماری کی رنگ رلیوں کی خبر نہیں تھی ورنہ اپنے حریفوں کی طرح اُسے بھی کب کا ٹھکانے لگوا چکا ہوتا۔

انکان گن لیتی رہی۔ کوئی خبر ہوتی تو میرے کانوں تک پہنچا دیتی۔ شام کو میں سو کر اٹھا تو اُس نے مجھے بتایا کہ نارنگ نے پنڈت شیوا کے علاوہ دیگر تمام پنڈت پجاریوں کی چھٹی کر دی ہے۔ انیسویں میں اب شیوا کے سوا کوئی اور نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر حاضری ضروری سمجھی۔ انکا مزار کے باہر رک گئی۔ میں نے درگاہ میں قدم رکھا تو میری حالت غیر ہونے لگی۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بدن تھر تھرانے لگا، کچکی طاری ہو گئی۔ وہ ایک جلیل القدر بزرگ کی درگاہ تھی، میرا بال بال گنا ہوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں شاید اب اس قابل بھی نہیں رہ گیا تھا کہ کسی بزرگ کے آستانے پر دو گھڑی سستا سکوں۔ میرے لئے قدم جما کر کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ صرف میں تنہا نہیں تھا، اور بھی بے شمار پروانے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے تھے، خدا کی بارگاہ میں گڑبڑا کر دُعائیں مانگ رہے تھے۔ مزار مبارک کے قریب ہاتھ باندھے، سر جھکائے، کھڑے ہوئے۔ لوگوں کی کثیر تعداد ایک طرف قطار اندر قطار بیٹھی تلاوت کلام پاک میں مشغول تھی۔ مجھ کو کچھ دیر ٹھہرنے کی اجازت مل گئی، یہی بہت تھا۔ میں مزار کی طرف منہ کئے اُٹے قدموں پھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا۔ میں نے معذرت طلب کرنے کی خاطر پلٹ کر دیکھا تو میری چشم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ سید مجذوب تھا..... خدا کا محبوب بندہ۔ وہ آنکھیں موندے، دھڑکے دھڑکے وہوں ہاتھ بلند کئے فقیروں جیسے انداز میں جھکا کھڑا تھا۔ اُس کی پلکوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک ڈھلک کر گر رہے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا، کسی اور دنیا کی سیر کر رہا تھا۔ میں نے اُس کے قریب ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی لاشی اس وقت میرے پاس تھی۔ میں نے پلکیں جھپکنا بند کر دیں، سید پر نظریں جمائے رہا۔ اندیشہ تھا کہ میں پلکیں جھپکاؤں تو وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ وقت گزرتا رہا، وہ لو لگائے کھڑا دل کی مرادیں پڑا رہا تھا۔ میں

اپنی باری کا منتظر تھا۔ کچھ دیر بعد سید نے آنکھیں کھولیں تو میں اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا، پھر مسکرا کر دبی زبان میں بولا۔

”یہاں بھی سودے بازی کرنے آگیا..... جواری..... نوںر باز.....“

”میری منہ کی قریب آ چکی ہے پیر و مرشد.....“ میں نے استدعا کی۔ ”میرے حق میں دُعا کرو۔“

”سزاؤں کی صفائی شروع کر دو۔“

”وقت کم رہ گیا ہے.....“ میں نے عاجزی کی۔ ”تم میری انگلی تھام لو.....“

”آدھا تیز..... آدھا بئیر.....“ سید کے ہوشوں پر قسم کھینے لگا۔ ”موصول کرتا ہے.....“

”میری حالت پر رحم کرو سید..... تم نے کبھی غلامی کی بات نہیں سنی۔“ میں نے شکوہ کیا۔

”کسی کو شے پر چڑھ جا..... بلندی مل جائے گی۔“ سید جیسے لہجے میں بولا۔

”میں تنہا ہوں، وہ بے شمار ہیں۔ میں مر گیا تو میرا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔“

”پھر سہ کھینے لگا؟ زبان کو تالا لگا لے۔“

”اندھیرا بڑھنے لگا ہے۔ کسی وقت دم بھی گھٹ جائے گا۔ تم راستہ دکھا دو۔“ میں نے

منت کی۔

”کسی درخت سے اُلٹا لٹک جا..... بین بچانی چھوڑ دے۔“

”میری داستان ختم ہونے کا وقت قریب ہے سید، میں ہاتھ جوڑتا ہوں، جو کہنا ہے کل

کر کہہ دو۔ تمہارے اشارے میری سمجھ میں نہیں آتے.....“ میں نے اُسے رحم طلب نظروں

سے دیکھا۔

”آج ہی آ رہی ہے.....“ اُس نے پلکیں جھپکائی شروع کر دیں۔ ”اکڑوں پنچر

گلڑوں کوں کی آوازیں نکالا کر۔“

”تم مجھے مرغا بنا دو، مجھے یہ بھی منظور ہے۔“

”اوپر دیکھ..... اوپر.....“

میری نظریں ایک لمحہ کو اوپر اٹھیں، سید پھر مجھے بل دے کر نکل گیا۔ میں درگاہ سے

نیل و مرام باہر آ گیا۔ انکا دوبارہ سر پر آگئی۔ وہ کچھ دھشت زدہ سی لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا انکارانی؟“ میں نے بچھے ہوئے دل سے پوچھا۔ ”کیا میرے لئے پھر کوئی بری خبر ہے؟.....“

”جلدی نارنگ کی کوٹھی پہنچنے کی کوشش کرو۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ ”شیوا کو تمہارے

بارے میں اطلاع مل گئی ہے، وہ جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ اُسے بچ کر نہیں جانا چاہئے۔“

”کس نے بھانڈا پھوڑ دیا.....؟“ میرے جسم میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ میں

نے لپک کر ایک سواری پکڑی۔ انکا میرے سر پر کھلبانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے

اُسے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی.....؟“

”میں زبان نہیں کھول سکتی جیل.....“ انکا ہونٹ چبانے لگی۔ ”کچھ مجبوریاں آڑے آگئی

ہیں۔“

”کیا پریتم لال نے اپنی دی ہوئی شہتی واپس لے لی؟“ میں نے دھشت بھرے انداز

میں پوچھا۔ ”شیوا کی واپسی کی خبر سن کر میرے اندر پھر انکا زے دھکنے لگے تھے۔

انکا نے کوئی جواب نہیں دیا..... نارنگ کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے سواری چھوڑ دی۔

خفاقی دسٹے کے مسلح افراد مجھے دیکھ چکے تھے، کسی نے میرے راستے کی دیوار بننے کی غلطی

نہیں کی۔ میں نے احاطے میں قدم رکھنے کے بعد ایک لمحے کو حالات کا جائزہ لیا، پھر ساری

میں ہالے تاق رکھ کر انکی سی کی جانب تیز قدم اٹھانے لگا۔ انکا نے مجھے یہ نہیں بتایا

تھا کہ شیوا تو میرے بارے میں بھنک کیسے ملی؟ نارنگ کے پاس ان فالتو باتوں کے لئے

اب وقت نہیں رہ گیا تھا۔ وہ پہر کو اوشا کماری کی زبان سے اُس نے امریتا کے اغواء کی جو

تفصیل سنی تھی، اسے سن کر وہ بھی پاگل ہو گیا۔ وہ اپنے دشمنوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

شاید اس وقت بھی دفتر میں بیٹھا ہوں کہ ان کا ارہا ہو، اپنے آدمیوں کو ہدایتیں جاری کر رہا

ہو۔ جس زیر زمین گروہ سے اُس کا تعلق تھا، ان کے ساتھ مشورے کر رہا ہو۔ بیٹی کے اغواء

کے انتقام کے منصوبے بنا رہا ہو..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرا ذہن صرف اور

صرف شیوا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے خیال میں اس کو ہر دوار سے میرے بارے

میں آگاہ کیا گیا ہو گا۔ پنڈت نول کشور کو اطلاع پہنچی ہو گی کہ میں اُس کے سر پر پہنچ گیا ہوں

تو وہ بھی ضرور مضطرب ہوا ہو گا۔ چندرا کے نوجوان خون نے بھی جوش مٹا دیا ہو گا۔ کالی کے

مندر میں پھر سر جوڑ کر مشورے شروع ہو چکے ہوں گے۔ ایک میری ذات کو ختم کرنے کے

پھر سرد لہجے میں بولا۔

”کون ہو تم؟ کیا سیوکوں نے تمہیں میرے کمرے میں آنے سے منع نہیں کیا؟“ اُس کی نظروں کی گہرائی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ مضبوط ارادوں کا مالک ہے۔ اُس کا ہار چھوٹے موٹے پنڈتوں میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”جیل.....“ انکا نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”جس ملازمہ کو تم نے دیکھا تھا اسے میں نے ہی شیوا کے قدموں کی زنجیر بتایا تھا۔ اُس نے اپنے حسن کا چال نہ ڈالا ہوتا تو یہ اب تک چلا گیا ہوتا..... تم کہو تو میں اس کا کیا کرم کروں؟“

”نہیں..... صرف تماشہ دیکھتی رہو۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر شیوا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”میں نے جان بوجھ کر تمہارے رنگ میں بھنگ ڈالا ہے۔ گھر میں کسی کی ارتھی پڑی ہو تو کول شریر سے چھیڑ چھاڑ شو بھانجی دیتی۔“

”تم نے اپنا پرچے نہیں کر لیا.....؟“

”سیوک کو جیل احمد خاں کہتے ہیں۔“ میں زہر خند سے بولا۔ ”وی، جس کا نام سن کر تم نے بڑا بستر باندھ لیا تھا۔“

میرا نام اس کی آنکھوں کا رنگ لیکھت بدل گیا۔ نظروں میں سائے لہرانے لگے۔ اُس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں نظر آئی۔ کچھ دیر مجھے نگاہوں نگاہوں میں پرکھتا رہا، پھر خصوصاً آواز میں بولا۔

”بڑا نام سنا تھا تمہارا۔ آج درشن بھی ہو گئے۔“

”درشن کرنے کی آرزو ہوئی تو تمہیں اس کی طرح چھپ کر بھاگنے کی کوشش کبھی نہ کرتے۔“ میں نے طنز کیا۔

”تم جو سمجھ رہے ہو وہ تمہاری بھول ہے۔“ اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”گرو کا بلاوا آگیا تھا اس لئے جارہا تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔“

”اب کیا سوچا ہے.....؟“ میں نے پوچھا۔ میرا لہجہ تھیک آ گیا تھا۔

”میں نے تمہیں گھمنڈی بنا دیا ہے۔“ اُس نے بل کھا کر سرد آواز میں جواب دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہارے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ ایک سندھ نار کے کارن پر تمہاری آنکھیں کھلتی ہیں، تمہیں بھی

لئے چنڈالوں کی پوری ٹولی جمع ہوگی۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے ہوں گے۔ ہر دو ایک خبر پہنچنے والا خود ملی میں موجود ہوگا۔ اُسی نے شیوا کو باخبر کیا ہوگا۔ کالی کے مندر میں چپے بیٹھے شیوا کے کانوں میں بھی اُسی نے زہر پھونکا ہوگا۔ نول کشور کے لئے اب تمام مہرے قیمتی تھے۔ اُس نے فوری طور پر شیوا کو واپسی کا حکم نامہ جاری کیا ہوگا۔ نارنگ نے مخصوص طریقہ پر شیوا کو طلب کیا تھا۔ شیوا کوئی پیادہ نہیں رہا ہوگا۔ میرے خلاف جو بساط بچھائی جا رہی تھی، اس پر شیوا کی حیثیت کسی فیل، رُخ یا گھوڑے جیسی ضرور ہوگی۔ چند راکی موجودگی میں اُسے بہر حال وزن نہیں سمجھا سکتا تھا۔

شیوا مارا جاتا تو نول کشور کی بازی کچھ ضرور کمزور ہو جاتی۔ میں بہت سارے امکانات پر غور کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں انکارانی کا زبان در گوئی کی مجبوری والا جملہ بھی کھٹک رہا تھا۔ میں نے اس کی وضاحت نہیں طلب کی، میں اُس کی مجبوریوں سے واقف تھا۔ وہ کی بار بتا چکی تھی کہ پراسرار قوتوں کے درمیان بھی کچھ سمجھوتے ہوتے ہیں، کچھ حد بندیاں قائم ہوتی ہیں جس کی خلاف ورزی کچھ دیوی دیوتاؤں کی نظروں میں پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا۔ شاید انکا نے کسی ایسی ہی مجبوری کے تحت وہ جملہ ادا کیا ہو۔ میرے لئے یہی کافی تھا۔ نے بروقت شیوا کی واپسی کی اطلاع مجھ تک پہنچا دی۔ وہ ہاتھ سے نکل جاتا تو مجھے ضرور ملا ل ہوتا۔ میرے پاس بھی بہت ساری قوتیں موجود تھیں۔ سب سے اہم سید مجذوب کی لائٹ تھی جسے دیکھ کر پرتیم لال جیسے مہمان پنڈت کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر ننڈا کے ایک عمل کا ورد کر کے خود کو جنت منتر سے محفوظ کر لیا۔

میں سینڈنٹانے انکسی میں داخل ہوا۔ شیوا کی خدمت کے لئے کئی ملازم موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ جھک جھک کر ڈنڈوت کرنے لگے۔ مجھے انکسی کی بجائے کوٹھی کے مہمان خانے میں جگہ ملی تھی، ملازموں نے اسی سے میرے رتبے کا اندازہ قائم کر لیا ہوگا۔ بڑے گھروں کے ملازم ان پڑھ ہونے کے باوجود مالکوں کی نظریں پڑھ کر حسب مراتب کا خیال رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایک ملازم نے میرے دریافت کرنے پر شیوا کے کمرے کی نشاندہی کر دی۔ میں دندنا ہوا اندر داخل ہوا۔ شیوا ایک کسن ملازمہ کو گود میں بٹھائے پیار و محبت کی بانس کر رہا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر چونکا۔ ملازمہ بے ترتیب لباس درست کرتی تھی سے باہر نکل گئی۔ شیوا ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کچھ پڑھ کر اپنے آپ پر پھونکا۔

اپنے بھوش کی چتا کرنی چاہئے۔ سارے دن ایک سماں نہیں ہوتے۔“

”خاں! امر لال کا پتھر چندرا، دندھیا چل کی پہاڑیوں سے واپس آ گیا ہے؟“ میں نے سر راتے لیے میں دریافت کیا۔

”ہاں۔ وہ بھی نول کشور مہاراج کی شرمن میں ہے۔“ شیوا کا انداز کھردرا تھا۔

”دونوں بلوان کب تک منگل میں چھپے بیٹھے رہیں گے؟ کب تک کالی کے چلوں میں ڈنڈوت کریں گے؟“ میں نے غور سے پوچھا۔ ”تم بھی تو ایک ہی تھیلی کے چنے بے ہو۔ تمہیں تو اوش جان کاری ہوگی۔“

شیوا کے تیور بدلنے لگے۔ اُس کا چہرہ غصے سے سختی نہ لگا۔ خون کی گردش اُس کی نرس سے نمایاں تھی۔ وہ بے حد طیش میں آچکا تھا۔ لیکن اسی اُس نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی۔ مٹھیاں بھیجنے کھڑا مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے اُس کی کسی حکم کا انتظار ہو، کوئی طاقت اُس کے آڑے آرہی تھی۔ شاید وہ ذہنی طور پر پنڈت نول کشور سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اُسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھتا رہا۔ اُس کے سر پر کسماتے ہوئے بولی۔

”تم کس بات کے منتظر ہو جیل؟ دیر مت کرو، شیوا کو مار ڈالو۔ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دینا دانشمندی نہیں ہے۔“

”تم چپ چاپ تماشہ دیکھتی رہو انکارانی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ پوری طرح میرے قبضے میں ہے۔ میں اسے بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا، تڑپاڑپا کر ماروں گا۔ اس کی لاش کا تحفہ نول کشور اور چندرا کے لئے جمیل احمد خاں کی طرف سے ایک تحفہ خاص ہوگا۔“ پھر میں نے شیوا کو مخاطب کیا۔ ”منہ میں گھنٹکیاں ڈالے کیا سوچ رہے ہو؟ تمہیں تو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگا۔ تمہارے گرد اور چندرا کے آنجنابی پتا امر لال نے تم سب کو بڑی تفصیل سے میرے بارے میں ایک ایک بات سے باخبر کیا ہوگا۔ پھر وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ اپنی ختی کا کوئی چٹکار دکھاؤ، جو جنت منتز سیکر رکھے ہیں وہ کس دن کام آئیں گے؟ پر لوک سدھار گئے تو ساری آٹائیں من ہی من میں رو جائیں گی۔“

میرا اندازہ غلط نکلا، شیوا کو کسی ہدایت کا انتظار نہیں تھا۔ وہ اپنی قوتوں کو سمیٹ رہا تھا۔ دل ہی دل میں کوئی چاپ شروع کر چکا تھا۔ پھر اُس کا سیدھا ہاتھ یلکھت فضا میں بلند ہوا۔

اُس کی آنکھوں سے ایک شعلہ لپکا۔۔۔۔۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سارے تن بدن میں آگ لگا دی ہو۔۔۔۔۔ میں نے ارتکاز اور مراقبے کا عمل شروع کیا، شیوا نے دوسرا وار کیا، اٹکا پاؤں اٹھا کر زمین پر مارا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ سید کی لائچی ہاتھ میں نہ ہوتی تو اوندھے منہ زمین پر گر رہا ہوتا۔ شیوا نے مجھے چکراتا دیکھ کر اپنے گلے سے ایک مالا اُتار کر زمین پر دے ماری۔ دانے بکھر گئے۔ اُن کی جگہ لا تعداد ناگنیں نمودار ہو کر میری طرف بڑھنے لگیں۔۔۔۔۔ میں نے سید کی لائچی گھمانی شروع کر دی۔ ناگنیں اپنی اپنی جگہ تھم گئیں۔ اُن کا قد حیرت انگیز طور پر بڑھنے لگا۔ میں نے ارتکاز کا عمل مکمل کر کے ناگنوں کو تیز نظروں سے گھورا، اُن کے جسموں کو آگ لگ گئی۔ وہ خاک بن کر غائب ہو گئیں۔ میں نے اپنے گرد حصار کھینچا اور جم کر کھڑا ہو گیا۔ شیوا کی آنکھیں حیرت سے پٹ پٹانے لگیں۔ اُس کی نظروں نے غالباً میری قوتوں کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اُس نے جھلا کر پے در پے وار کرتا شروع کر دیے۔ میں کسی آہنی ستون کی طرح جما کھڑا رہا۔ اُس کے ترش کے سارے تیر ختم ہو گئے تو وہ ہانپنے لگا۔۔۔۔۔! میں بغل سے کام نہیں لوں گا۔ شیوا نے مجھ سے مرد بن کر مقابلہ کیا تھا۔ نامردوں کی طرح پشت دکھا کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے جو وار کئے تھے وہ بھی بھرپور تھے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بوکھلا گیا ہوتا۔ میرے پاس سید کی لائچی بھی تھی، خندانہ قوت بھی تھی، کلدھپ اور پریم لال کی آتماں بھی نادیدہ طور پر ضرور ہم رکاب ہوں گی۔

”تک کیوں گئے شیوا۔؟“ میں نے ہانپتا دیکھ کر اُس کا مذاق اڑایا۔ ”اتنی جلدی چیں بول دی؟ کچھ اور کھیل تماشہ دکھانا چاہتے ہو تو وہ ارمان بھی پورا کر لو۔ اس کے بعد میری باری ہوگی، تمہیں اپنا دفاع کرنا ہوگا۔“

”تم نے جو پوتر لائچی تمام رکھی ہے، اسے ایک طرف پھینک دو۔ میں آخری سانس تک تم سے ہار نہیں مانوں گا۔“ شیوا نے لائچی دیکھ کر پٹپٹا ہونے لگا۔ ”ایک شرط میری بھی ہوگی۔۔۔۔۔“

”وہ کیا؟“ اُس کی آنکھوں میں اُمید کی کرنیں چمکنے لگیں۔

”تم اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ کر میرے قدموں میں رکھ دو، میں لائچی ایک طرف بٹالوں گا۔“ میں نے زہر خند سے اُس کی احتقانہ شرط کا مذاق اڑایا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، میری بات کا مقصد سمجھ کر خاموش رہا۔ اُس کے تیور بدستور نظر آرہے تھے۔

”زخموں کی باتیں کیوں کرتے ہو شیوا؟“ میں حقارت سے بولا۔ ”جہاں دو منٹس بیٹھ لڑتے ہوں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، وہاں بچوں جیسی شرطیں نہیں باندھی جاتیں۔ محبت اور جنگ میں تو جہازیں استعمال ہوتا ہے، تم ایک لاشی سے خوفزدہ ہو گئے۔ کیا تمہارے گرو نے یہی سکھایا تھا.....؟“

”وہ جے تمہاری ہوئی۔ میں ہار گیا۔ شیوا کے آواز میں کہا۔ ”فضول باتیں مت کرو، میں اب بھی سینہ تانے مردوں کی طرف قدم بٹانے لگا ہوں۔ مجھے مار دو۔ میں تم سے جیون کی ہکھٹا نہیں مانگوں گا۔“

”تمہاری مردانگی مجھے پسند آئی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تم مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرو، میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا۔“

”جیل.....“ انکا نے احتجاج کیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ دشمن کو معاف کر دینا؟“

”میں نے زندگی میں اور بھی بہت ساری باتیں کی ہیں۔“ میں نے انکا سے کہا۔ ”ایک غلطی اور کر لینے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟“

”کیا وچن لینا چاہتے ہو؟“ شیوا نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”پنڈت نول کشور اور چندرا تک براہیہ پیغام پہنچا دو کہ اب یہ اچھل کوو بند کر دیں۔“

میں نے بے حد خطرناک لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”دوسرے بے قصور پنڈت پجاریوں کو ایندھن بنانے سے میرے اندر کی جواالا اور بھڑکتی رہے گی۔ اُن سے کہو مرد ہیں تو مندر اور منڈل سے باہر آ کر کھلے میدان میں ایک بار مقابلہ کر لیں۔ سمجھ رہے ہو میری بات.....؟“

”اگر گرو نے تمہاری بات سویکار کرنے سے منہ موڑ لیا تو.....؟“

”تو بھی میں ماسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”بدری زائن نے بھی کالی کے مندر میں پناہ لے کر زندگی بچانی چاہی تھی، آج وہ اس دھرتی پر نہیں ہے۔ امرال بھی سینہ ٹھونک کر ہمارے بچ کو پڑا تھا، اُسے بھی کالی کا مہان سیوک ہونے کا بڑا کھمنڈ تھا۔“

نتیجہ کیا نکلا؟ میری کل دیپ نے اُس کے شریر کے بھی نکلے کر کے زک میں جھونک دیا۔

”میں تمہارا سندیس گرو تک پہنچاؤں گا۔ ماننا نہ ماننا اُن کے اختیار کی بات ہے۔“

شیوا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے..... اب میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ..... میں تمہیں تمہارا جیون دان کرتا ہوں۔“ میں نے فیصلہ سنا دیا۔

شیوا خاموشی سے جانے لگا تو انکا جھلا کر بولی۔

”مجھے اجازت دو جیل، میں اسے زندہ نہیں جانے دوں گی۔ تم غلطی کر رہے ہو.....“

”تم کوئی غلطی نہ کرنا.....“ میں نے انکا کو نیزھی نظروں سے دیکھا۔ وہ تمللا کر رہ گئی۔

میں قدم اٹھاتا نیکی سے باہر آ گیا.....!!



KHAN BOOKS

STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHADRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 5556532
PROP: ALI KHAN

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F/8914 NISHTA ROAD PHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH-5056002
PROF. A. I. KHAN

انکا مجھ سے رُوٹھ گئی تھی۔ وہ مجھ سے لڑا کی تھی۔ میں نے شیوا کو واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ میرا دشمن تھا۔ دشمن کے ساتھ محبت اور رحم کا برتاؤ کرنا عقلمندی کے منافی تھا۔ وہ مجھے یہی باور کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شیوا کے خاموشی سے واپس جانے کی اطلاع بھی مجھے انکا ہی نے دی تھی۔ وہ نول کشور کا کوئی خاص آدمی تھا۔ نارنگ نے امریتا کو اغواء کرنے والوں کا کونج لگانے کی خاطر اُسے ہر دور سے طلب کیا تھا۔ قسمت مجھے درمیان میں لے آئی۔ میں راستے میں نہ آتا تو شیوا، نارنگ کی کوٹھی میں سب سے زیادہ اہم آدمی سمجھا جاتا۔ اُس کی پذیرائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جاتا۔ چھوٹے بڑے سب اُس کی آؤ بھگت میں لگے ہوتے۔ میرے آجانے سے اُس کی اہمیت ختم ہوگئی۔ انکا نے اوشا دیوی کو اپنا معمول بنالیا۔ اُس کی زبانی امریتا کے اغواء کی کہانی سنوا دی۔ نارنگ ششدر رہ گیا۔ وہ اسے میرا کمال سمجھ رہا تھا۔ میں اور انکا الگ الگ نہیں تھے۔ بہر حال نارنگ میرا گرویدہ ہو گیا۔ میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ پنڈت شیوا کی اہمیت دو کوڑی کی رہ گئی۔ میں چاہتا تو دوسرے پنڈت پجاریوں کی طرح اُسے بھی نارنگ کی سرکاری کوٹھی سے باہر نکلوا دیتا لیکن میں نے اُسے روک لیا۔ میں نے طے کیا تھا کہ شیوا کی لاش کے ٹکڑے نول کشور کو روانہ کروں گا، اُس سے بھیا تک انتقام لوں گا۔ میری وحشت میرے جنون میں کچھ کی واقع ہو جاتی۔ نول کشور سوچ میں پڑ جاتا۔ اُس کے لئے صرف دو راستے باقی رہ جاتے، میرے راستے سے ہٹ جانا۔ گمنامی کی زندگی بسر کرنے کی خاطر کہیں پہاڑوں یا جنگلات میں روپوش ہو جانا یا پھر کالی کے مندر سے باہر نکل آنا۔ میرے لئے دونوں ہی صورتیں ہر اعتبار سے فائدہ مند ہوتیں۔

میں نے انکا کے اطلاع دیتے ہی نارنگ کی کوٹھی تک پلٹ کر آنے میں کسی غفلت کا ثبوت نہیں دیا۔ میرے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں ابھرا۔ میں راستے بھر اُسے بھیا تک

موت سے دوچار کرنے کی بابت غور کرتا رہا۔ انکا اُسے نارنگ کی کوٹھی میں ایک کسن ملازمہ کی زلفوں میں الجھا کر آئی تھی۔ شیوا کے جنتز منتر کے بیر بھی دھوکہ کھا گئے۔ وہ بھی اُسے یہ نہ بتا سکے کہ موت ہر لمحہ اس سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ میں اُڑتا ہوا شیوا کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے پہل نہیں کی، مجھے اپنی قوت پر ناز تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شیوا میرے مقابلے پر زیادہ دیر نہیں ٹک سکے گا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ وہ اپنے سارے جنتز منتر آزمانے کے بعد بھی اپنی جگہ ڈٹا کھڑا رہا۔ اُس نے اپنی ہکست تسلیم کرنے میں بہانہ سازی سے کام نہیں لیا۔ اُس کا خیال تھا کہ میرے اور اس کے درمیان سید کی لائھی ایک واضح فرق تھی۔ وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔ اُس کی نظریں ننذا کے راز کو نہیں پاسکتی تھیں۔ میری قوت کے بارے میں اس کی آنکھیں گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ پہنچ جاتیں تو شاید وہ مقابلے کی حماقت بھی نہ کرتا، پہلے ہی اپنی ہار تسلیم کر لیتا۔ ہکست کا اعتراف بھی بہادری کی دلیل ہے۔ وہ میرے رحم و کرم پر تھا، اُس نے کہا بھی تھا کہ میں اس کی زندگی کی کہانی ختم کر دوں، میں نے بھی یہی ٹھان رکھی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے دل نے مشورہ دیا کہ میں اُسے معاف کر دوں۔ اس دشمن کو بخش دوں جس کے دل میں میرے خلاف نفرتوں کا طوفان موجزن تھا۔ جو پنڈت نول کشور کے جتنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جسے نارنگ نے بھی دوسرے پنڈت پجاریوں کو قوت دی تھی۔ وہ یقیناً میرے دشمنوں کی جماعت میں کسی بڑے رُتبے پر فائز رہا ہوگا۔

بہت کچھ ممکن تھا۔ بہت سی باتیں قرین قیاس تھیں۔ ایک بات واضح تھی، وہ میرا دشمن تھا۔ دشمنوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس حرا مزادے نے مجھے تاریکی میں رکھ کر مجھ پر اچانک تازی توڑ حملے شروع کر دیے تھے۔ اس کی خصلت میں کہیں نہ کہیں کسی گندے خون کا دخل ضرور رہا ہوگا۔ مرد ہوتا تو میری طرح لٹاکر حملے کا آغاز کرتا۔ میں ذرا کمزور پڑ جاتا تو وہ میری لاش پر کھڑا فاتحانہ انداز میں قہقہہ بلند کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا، میری ساری خود اعتمادی، سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ جنگ میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ جو موقع سے فائدہ اٹھالے، جیت اُسی کی ہوتی ہے۔ سید لائھی نے سہارا نہ دیا ہوتا تو میں ممکن تھا کہ میرے قدم لڑکھڑا جاتے، مجھے سنبھلنے میں دیر لگتی، شیوا اس دودھان شیر بنا رہتا۔ بعد میں میرے جوابی حملوں سے اپنی ہکست کا اعتراف کرتا۔

بڑا دور اندیش اور گھاگ آدمی تھا، میں سمجھ رہا تھا کہ سب کی موجودگی میں وہ زبان نہیں کھولے گا۔ وہ اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کے اصول کا پابند تھا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی ثابت ہوا، کھانے سے فارغ ہو کر وہ مجھے اپنی ساؤنڈ پروف لائبریری میں لے گیا جہاں پوری دنیا سے رابطہ قائم کرنے کے لئے مختلف الاسکی نظام موجود تھے۔ انکا مجھے بتا چکی تھی کہ لائبریری نارنگ کے لئے کوٹھی کی سب سے محفوظ ترین جگہ تھی، وہاں کسی پرندے کو بھی مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی لائبریری کے فرش سے ایک چور راستہ کوٹھی کے عقب میں بھی نکلتا تھا، اس کا علم بھی نارنگ کے سوا کسی اور کو نہیں تھا۔ اس لئے کہ چور راستے میں نارنگ کا ذہن اور غیر ملکی ماہرین فن کا ہاتھ شامل تھا۔ مقامی لوگوں کو اس کی بھنگ بھی نہیں تھی۔

لائبریری میں قدم رکھتے ہی میں نے خود کو نندا کی قوتوں سے لیس کر لیا۔ مجھے نارنگ کے دل میں جھانکنے کا موقع مل گیا۔ میں یہ کام انکارانی سے بھی لے سکتا تھا۔ وہ نارنگ کے سر پر چلی جاتی پھر اُس کی خوشی کا پورا احوال منٹوں میں مجھ تک پہنچا دیتی، نارنگ ہکا بکا رہ جاتا۔ لیکن وہ اس وقت رُوٹھی ہوئی تھی، میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

میں نارنگ کے ساتھ لائبریری میں داخل ہوا تو خود کار دروازہ بند ہو گیا۔ نارنگ نے مجھے بڑی انکساری سے ایک آرام کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا تو وہ میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”راج.....“ اُس نے کہا۔ ”آج میں بہت خوش ہوں۔ میری خوشیوں کا اصل کارن تم ہو۔ تم نہ ہو تو مجھے کنارے تک پہنچنے کے لئے بڑے ہاتھ پیر مارنے پڑتے۔ تم نے ایک پل میں میری ساری چننا دودھ کر دی۔ تم پہلے مل جاتے تو میں آج کہیں اور ہی ہوتا۔ یہ راج منتری کا امتحان تو کانوں کی آواز ہے۔“ اُس نے مجھے بڑی عقیدت مند نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میری نگاہوں نے تمہاری پہچان لیا ہے۔ پورے بھارت میں تم سے بڑا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ ایک گرو پر تپ تھا لیکن وہ مجھ اس بلندی تک نہیں پہنچ سکا جہاں تم نظر آ رہے ہو۔“

”کیا پالیا نارنگ.....؟“ میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ”خوش نظر آ رہا ہے؟“

”جن سور کے بچوں نے امریتا کو اغواء کر کے مجھے اپنے اشاروں کے پتے کے پتے دیکھے تھے، اب وہ نارنگ کی منگی میں ہیں۔ وہ اپنی باری پوری کر چکے، اب میں انہیں اپنا

میں نے زندگی میں سارے قدم سوچ سمجھ کر نہیں اٹھائے۔ کئی بار کلدیپ کو بھی شکایت ہوئی کہ مجھے جذبات کی رو میں بہک جانا ہوں۔ انکارانی بھی یہی شکوہ کرتی تھی کہ جنوں میں بہک کر میں انہیں سوچے سمجھے قدم آگے بڑھا دیتا ہوں، مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتا ہوں، جوش میں آ کر ہوش کھو بیٹھتا ہوں۔ پرستم لال بھی پیش گوئی کر چکا تھا کہ میں جل کے اندر غوطہ نہیں لگا سکوں گا، خود کش گواہ ہوں کہ میری جلد بازی نے کئی حسین مواقع ضائع کر دیئے۔ میں انسان ہوں، فرشتے نہیں ہوں۔ میں نے غلطیاں نہ کی ہوتیں، کوتاہیوں کی حماقت نہ کی ہوئی تو میری زندگی کی المیہ کا انداز بیان کچھ اور ہی ہوتا۔ شاید کلدیپ بھی کالی داس کو دیئے ہوئے وچن کی بھیڑ سے بچنے سے بچ جاتی۔ مجھے در بدر کی خاک نہ چھاننی پڑتی۔ لیکن مقدمہ کے لکھے کو مٹانا ہر شخص کی بات نہیں ہوتی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری زندگی بڑی گناہ آلود رہی ہے، سید مجھ پر ہر زبان تھا، وہ اشاروں کتابوں میں مجھے راست قدم اٹھانے کی نصیحتیں کرتا تھا۔ میں کم فہم تھا، اسی کی گہرائی تک پہنچنا میرے اختیارات کی بات نہیں تھی۔

شیوا جیسے دشمن کو معاف کرنا بھی شاید میری حماقت ہی تھی۔ وہ میرے اختیار میں تھا۔ اُس کا ترکش خالی ہو چکا تھا، اُس نے اپنی فکرت بھی تسلیم کر لی تھی۔ لیکن میں نے اُسے اپنا ایک پیغام پنڈت نول کشور اور چند رات تک پہنچانے کا وعدہ لے کر معاف کر دیا۔ انکا نے غرا کر شیوا کی طرف جھپٹنے کی کوشش کی، میں نے اُسے بھی تختی سے روک دیا۔ وہ ناراض ہو گئی۔ منہ پھلائے میرے سر پر ٹپکی رہی۔ میں اُسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

رات کے کھانے پر نارنگ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اُس کی خوشی کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ امریتا اغواء ہونے سے بچ گئی تھی، نارنگ نے اوشا کادی کی زبانی پوری کہانی سن لی تھی، شیوا بھی چلا گیا تھا۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ ایک رات اور اس چھپت کے نیچے گزار کر نارنگ سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کر لوں گا۔

کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ امریتا مجھ سے بے تکلفی سے گفتگو کرتی رہی۔ اوشا کی شکاری نظریں میرے اوپر جال ڈالنے میں مصروف تھیں، میں کتر کترا کر اپنا بچاؤ کرتا رہا۔ انکارانی میرے سر پر چت لیٹی آسمان کی طرف گھورتی رہی۔ وہ بدستور مجھ سے اُکھڑی اُکھڑی نظر آ رہی تھی۔ نارنگ کے چہرے پر سر میں دھس کر رہی تھیں۔ وہ

کھل دکھاؤں گا۔ وہ جیت جاتے تو میں تباہ ہو جاتا، ساری جتنا کے سامنے میرے شریر کے لیے ہے اتر جاتے۔ اب میں انہیں تنگ کروں گا۔ ایک کے بدلے دس مارے جائیں گے۔ ساری دنیا تباہ دیکھے گی۔“

”ایک بات لہجہ بالک..... میں نے پہنچے ہوئے پنڈت جیسا انداز اختیار کیا۔“ دھیان سے سنے گا؟“

”تم آگیا دو مہاراج، سیوک تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کرے گا۔“

”کچھ دنوں کے لئے سرکار سے چھٹی کے لئے باہر چلا جا۔ جب اندھیرے چھٹ جائیں تو واپس لوٹ آنا۔ اسی میں تیری بھلائی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں مہاراج.....؟“ اُس نے مجھے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”سرنگ میں اترنا بڑے جان جو حکم کی بات ہے۔“ میں سمجھتی سے بولا۔ ”کہیں چھٹ کرنے سے راستہ بند ہو جائے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔“

”تم..... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو.....؟“ نارنگ کی نگاہوں میں کئی رنگ بھٹلائے گئے۔

”میں زیر زمین (UNDER WORLD) دنیا کی بات کر رہا ہوں نارنگ سنہا۔“ میں نے کھل کر کہا۔ ”جو لوگ تمہارے جال میں پھنس چکے ہیں، ان کی جڑیں بھی بڑی دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ تمہارے تجربہ کار لوگوں نے ہوشیاری سے کام لیا ہے، بڑی مچھلیوں کو ابھی تک یہ ہوا نہیں لگی کہ ان کے آدمیوں پر کس نے جال ڈالا ہے۔ وہ تہہ سے نکل کر کھلے ساگر میں کھوج لگانے کا کام شروع کر چکے ہیں۔ ایک ایک لہر کو کھٹکلا جا رہا ہے۔ سن رہا ہے بالک میں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں؟“

نارنگ دم بخود رہ گیا۔ بت کی طرح ساکت و جامد کھڑا کچھ دیر مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے گھورتا رہا، پھر کسمسا کر بولا۔ ”تم اور کیا جانتے ہو مہاراج.....؟“

”وہ سب کچھ جو تو نہیں جانتا۔“ میں نے گہیر لہجے میں جواب دیا۔ ”ابھی ساگر چڑھا ہوا نہیں ہے۔ سے تیرے ہاتھ میں ہے۔ تیرا دوسرے کنارے اتر جا۔ سمندری طوفان آ گیا تو بڑی تباہی ہوگی۔ کھارے پانی کی گوشت خور مچھلیوں کو بیٹھے پانی میں رکھنے کا دھیان دل سے نکال دے، انہیں ختم کر دے، خود باہر چلا جا۔ بانس رہا تو بانسری بھی ضرور بجے گی۔ میرا کہا مان لے۔“

نارنگ نے فوراً ہی میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ دُور اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک ذہنیت کا مالک بھی تھا، اپنے پیچھے کوئی ثبوت چھوڑنا اُس کی سرشت کے خلاف تھا۔ اُس کے ذہن میں کسی کے خلاف ابھرنے والا معمولی خدشہ بھی مشکوک آدمی کی ہلاکت کا بہانہ بن جاتا تھا۔ اُس کی خاصیت ناگن جیسی تھی جو اپنے بچوں کو کھانا جانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ میں اُس کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

”کس وچار میں گم ہے بالک.....؟“ میں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہارا کہا مان لوں گا۔“ اُس نے ڈھل یقین حالت میں شرط رکھی۔

”شرط باندھ رہا ہے.....؟“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔

”نہیں..... میں بنتی کر رہا ہوں.....“ اُس نے کینچی بدلنے کی کوشش کی۔

”جو چنتا تجھے بیا کل کر رہی ہے اسے من سے نکال دے، اگلے چند رما سے پہلے باہر چلا جا، موج میلا کر کے تین مہینے نکال دے، پھر واپس آ جانا۔“ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں کسی اور راستے کا مسافر ہوں، تیرے ساتھ نہیں جا سکتا۔ دھرم کرم اور دنیا داری میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تیری سندھ پٹری کا معاملہ نہ ہوتا تو میں ناگ نہ بننا پاتا۔ سارے منٹ ایک جیسے نہیں ہوتے مورکھ، میں زبان بند رکھتا تو تیرے من میں بھی اتھل پھٹل نہ ہوتی۔ تیرے ساتھ اور بھی کچھ لوگ بھونچال کی لپیٹ میں آ جاتے۔ نیکی کا بدلا بدی سے نہیں دیا کرتے..... سنا تو نے؟“

نارنگ میری دو ٹوک بات کی کرسٹھانے لگا۔ انکا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی خونخوار نظریں نارنگ کے چہرے پر جمی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں چنگاریاں چمکنے لگیں۔

”میں کل صبح چلا جاؤں گا۔“ میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ”میں نے تیری بڑھی میں جو بات بنھانے کی کوشش کی ہے اس میں تیرا ہی بھلا ہے، ماننا نہ ماننا تیرے اختیار میں ہے.....“

”مہاراج.....“ اُس نے سنبھل کر کہا۔ ”آج تک میں نے نارنگ کی بات ماننے کی غلطی نہیں کی۔ میں تم سے بنتی کر رہا ہوں، تم میرے ساتھ رہو گے تو میں امن شانت رہے گا.....“

”چھل کپٹ کی باتیں کر رہا ہے؟“ مجھے غصہ آ گیا۔ انکا کچھ کہے بغیر میرے سر سے اتر

گئی۔ دوسرے ہی لمحہ لائبریری کا خود کار دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تو نارنگ حیرت سے اچھل پڑا۔ میں سمجھ گیا کہ انکارانی کی طرف سے نارنگ کے لئے وہ پہلی وارنگ تھی۔

”نارنگ! کتنا پسند کرے گا؟“ میں تیزی سے بولا۔ ”ہٹ جا میرے راستے سے، ورنہ بچھڑائے گا۔“ یہ اٹھ اٹھ گیا تو مجھے بھاگے راستہ نہیں ملے گا۔ وہ چور راستہ بھی تیرے لئے قبر بن سکتا ہے۔ اس کے اوپر تو پختہ تانے کھڑا ہے۔ بول..... کیا فیصلہ ہے تیرا؟“

پھر نارنگ کا چہرہ خوف سے زبرد ہو گیا۔ وہ زمین سے ایک فٹ بلند ہو چکا تھا۔ تھر تھر کانپتے ہوئے اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”مجھے شاکر دو مہاراج..... تمہارا جب من چاہے چلے جانا، میں تمہیں روکوں گا نہیں۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے انکا کوسنانے کی خاطر نارنگ سے سرد آواز میں کہا۔ ”دھرتی پر واپس آ جا، قدم جمالے، پھر کوئی کمی تنگی مت دکھانا۔ ورنہ سارا کھانا باہر آ جائے گا.....“

میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا لائبریری سے باہر آ گیا۔ خود کار دروازہ جسے انکا کی پراسرار قوت نے کھولا تھا، دوبارہ بند ہو گیا۔ میں سیدھا اپنی خوابگاہ میں آ گیا۔ چند لمحوں بعد انکا بھی واپس آ گئی۔ وہ پھر جیت لیٹ کر چھت کو تختگی باندھے گھورنے لگی، میں اس کی مصیبت سے واقف تھا۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

پریم لال نے اُسے جو تو میں بخشی تھیں انہوں نے انکارانی کو بڑا تدارک بنا دیا تھا۔ میرا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ رہ رہ کر شیوا کا خیال کبلانے لگتا۔ میں نے یونہی ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ میری نظریں رسالے پر جمی تھیں لیکن میرا ذہن بدستور شیوا کے سلسلے میں اُلجھتا رہا۔ میں پنڈت نول کشور اور چندرا کے بارے میں غور کرنے لگا..... شیوا کی زبانی

میرا پیغام سن کر اُن کا رد عمل کیا ہوگا.....؟ کیا نول کشور اپنی حرامزدگی سے باز آ جائے گا.....؟ چندرا کے ذہن میں امر لال کے انتقام کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ سرد پڑ جائے گی.....؟ شیوا پر کیا گزرے گی.....؟ وہ اپنے اور میرے مقابلے کی داستان بیان کرے گا تو کیا اس کی بات تسلیم کر لی جائے گی.....؟ ”نہیں.....“ میرے ذہن نے جواب دیا۔

”پنڈت نول کشور نے میری موت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ ایک عرصے سے پنڈت پجاریوں کو اپنے جھنڈے تلے اکٹھا کر رہا تھا، اُن کے دل و دماغ میں میرے خلاف زہر بھر رہا تھا۔ اُسے کالی کا آشیرادو حاصل تھا..... کالی جسے طاقت کی سب سے بڑی دیوی سمجھا جاتا تھا،

جس کو دیئے ہوئے وچن کی خاطر میری کلدیپ نے اپنی ہستی مسکراتی زندگی کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ اُس کی حمایت نے نول کشور کے غبارے میں بھی ہوا بھری ہوگی۔ ایک شیوا کے بیان پر وہ نقطہ نا تحقیق اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے گا۔ چندرا بھی اپنی جوانی کے زعم میں اونچے اونچے خواب دیکھ رہا ہوگا۔ وہ مارنے یا مر جانے کا فیصلہ کر چکے ہوں گے۔ پریم لال کی آتما نے جو کہا تھا وہ غلط نہیں ہوگا.....“

میں تا دیر اپنے آپ سے اُلجھتا رہا، پھر انکا کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”میں کچھ دیر کے لئے جارہی ہوں۔“ اُس نے روتھے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پریم لال مہاراج کی آتما نے مجھے یاد کیا ہے۔ اپنا دھیان رکھنا.....! میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔“

”تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ جب چاہو، جہاں چاہو جا سکتی ہو.....“ میں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

”غلطی تمہاری تھی۔ اور تم ہی جلی کاٹی باتیں بھی کر رہے ہو۔“ اُس نے شکوہ کیا۔

”اپنے جملوں کو بھی تولنے کی کوشش کرو انکارانی.....“ میں نے اُسے یاد دلایا۔ ”میں نے بھی تم سے شیوا کو نہ روکنے کی وجہ دریافت کی تھی۔ تم نے اپنی کسی مجبوری کی آڑ لے کر بات بال دی، اصل وجہ نہیں بتائی۔ میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اپنی اپنی فکریں ہوتی ہیں۔“

انکا نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن کوئی مجبوری لاحق ہوگی جو اُس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے دیکھتے ہوئے حاشیہ سے چلی گئی۔ میں پھر اپنے جنون میں مبتلا ہو گیا، اپنی وحشتوں سے اُلجھ رہا تھا جب کہ قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نظر گھما کر دیکھا، امریتا شب خوابی کا لباس پہنے میرے کمرے میں داخل ہو کر کمرے کا دروازہ بند کر رہی تھی..... میرے ذہن سے سارے پریشانی من خیالات چھٹ گئے۔ میری نظریں امریتا کے جسم پر پھلنے لگیں۔

ذہن پریشان ہو، اعصاب پر کسملندی طاری ہو، دماغ اچھوٹی کا شکار ہو اور خیالات میں بیزار کی کروٹیں بدل رہی ہو تو کسی حسینہ کا وجود ان تمام علامتوں کو دہکاتا ہے۔ امریتا کو دیکھ کر میری بھی یہی حالت ہوئی۔ وہ دروازہ بند کر کے میری سمت بڑی تیزی سے آئی۔

”کن و چاروں میں گم ہو.....؟“ اُس نے تھوڑے وقفے سے سوال کیا۔ اس بار مہاراج کا لقب استعمال نہیں کیا گیا۔

”ایک مشکل درپیش آگئی ہے۔“ میں نے اُسے آزمانے کی کوشش کی۔ ”تمہارے پتا کا کہنا ہے کہ میں کہیں نہ جاؤں، سارا جیون اسی کے ساتھ رہوں۔“

”تو پھر ان کا کہنا مان لو..... کیا ضرورت ہے کہیں جانے کی؟“ وہ بڑی اپنائیت، بڑی لگاؤ سے بولی۔ ”میں تمہاری سیوا کروں گی، تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“

”کیا بھروسہ تمہارا.....؟“ میں نے پھر اُسے کریدا۔ ”فضائی سفر کی طرح کہیں تم پھر مجھے بھول گئیں تو.....؟“

”پیارے سے بھول ہو گئی تھی..... شام کرو۔“ امریتا کا لب و لہجہ تبدیل ہونے لگا۔ اُس کے انداز میں وارفتگی تھی۔

”پہلے تم نے انکار کیوں کیا تھا.....؟“ میں نے شکوہ کیا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا، نگاہوں کے ذریعے میرے دل میں سامنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اُسے برسوں سے جانتا ہوں، جنم جنم سے میرا اُس کا ساتھ رہا ہو۔ میرے عزم کا مضبوط قلعہ مسمار ہونے لگا۔

”تمہیں وہ جملہ یاد ہے؟“ میں نے مدہم آواز میں کہا۔ ”جو آزمائے جا چکے ہوں انہیں بار بار نہیں آزمانا چاہیے۔“

”ہاں.....“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا.....“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔ امریتا کے لہجے کا یقین میری یادداشت میں پلچل جانے لگا۔ اُس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ پہلے اُس نے بڑی سادگی سے مجھے پچھاننے سے انکار کر دیا تھا، بار بار بڑے وقفے سے میری بات کی نفی کرتی رہی۔ اور اب بڑے اعتماد سے اقرار کر رہی تھی۔

”امرتا.....“ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں تمہیں کیا سمجھوں.....؟“

”کھینا..... کجرا پیارن..... امریتا، جو چاہے سمجھ لو جیل.....“ اُس کی آواز یکھت بدل گئی۔ ”ناموں میں کیا رکھا ہے؟ سچا سمبندھ تو من کا من سے ہوتا ہے.....“ میری آنکھوں نے برسا شروع کر دیا۔ ماضی کے حسین لمحات مجھے ڈسنے لگے، ڈنک

پندرہ سرائی کی خاطر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ گلبدن اپنی تمام تر حسرتا مانیوں کے ساتھ درمیانی فاصلہ گزر کر رہی تھی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ فضا کی سفر کے دوران بھی وہ مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے جب اُسے اغواء کنندگان سے نجات دلائی تھی اس وقت بھی اظہارِ تشکر کے طور پر بے اختیار میرے بننے کی گہرائیوں میں سا گئی تھی۔ لیکن وہ ایک سلجھے ہوئے دماغ کی لڑی تھی، جنہی مخالف کے لئے اپنے اندر بے پناہ مقناطیسی کشش بھی رکھتی تھی۔ میرے خیال کے مطابق وہ اب بھی نہیں تھی۔ پھر اتنی رات گئے وہ باریک گاؤں سے اپنے جسم کے پیچان انگیز خطوط کی تلاش کرتی میری خواب گاہ میں کیوں آئی؟ مقصد صرف ملاقات ہوتا تو دروازے کو اندر سے بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ معا میرے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا۔ ”کہیں بولنگ نے اسے میری کمزوری تو نہیں سمجھ لیا تھا؟ امریتا کے حسن و جمال کا جادو میرے قدموں میں بیڑیسا ڈالنے کی خاطر استعمال کیا جا رہا ہو؟“ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ میں نے طے کر لیا کہ رنگ کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

امرتا باؤ بہار کے معطر جھونکوں کی طرح میرے قریب آ کر ڈک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں شیل کنول تیر رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں مجھے اپنے سحر میں الجھا رہی تھیں۔ اُس کے گداز بدن کی پیش مجھے جھلسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے پیش قدمی نہیں کی، اپنی خواہشات کو بے لگام نہیں ہونے دیا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی۔ دانشوروں اور ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ مردوں کی نگاہوں کا مفہوم عورت پہلی نظر میں بھانپ لیتی ہے۔ شاید امریتا نے بھی میرے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر میرے ”قلعہ بند“ ہونے کے ارادوں کو تاڑ لیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم پھیل کر گہرا ہوتا چلا گیا۔ میرے اور قریب آ کر بڑی اپنائیت سے بولی۔

”بیٹھے کو نہیں کہو گے مہاراج.....؟“

میں نے پلکوں کی جنبش سے کام لیا۔ وہ اجازت حاصل کر کے میرے برابر بیٹھ گئی۔ اُس کے جسم کی خوشبو میرے دل و دماغ میں بسنے لگی۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ نارنگ نے اس خوبصورت ناگن کو مجھے ڈسنے کی خاطر بھیجا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میرے پاس قاتل سے قاتل زہر کا زیاق موجود تھا۔

بارنے لگے۔ میرے وجود کی عمارت لرزنے لگی۔ میرے اندر طوفان کی شدتیں پھر سر اُبھارنے لگیں۔ میں دیوانہ ہو گیا۔ پٹی پھٹی بے چین نظروں سے امریتا کو دیکھنے لگا۔ میری نگاہیں ایک بار پھر دھوکا کھا گئیں، میں اُسے پہچان نہ سکا۔ فضائی سفر کے دوران اُس نے بڑا واضح اشارہ کیا تھا۔ وہ جملہ میرے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہا، میں اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ تھکات کا احساس میرے کرب میں اضافہ کرنے لگا۔ میں نے پلکیں جھپکائی بند کر دیں۔ امریتا کو دیکھا۔ اب شے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی، کلپنا اور پجارن کجرا کا حوالہ بہت تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے صرف امریتا کا جسم تھا، اُس کے جسم کے اندر میری کلدیپ کی روح موجود تھی۔

”تم پھر جیت گئیں۔ میں ایک بار پھر ہار گیا۔“ میں نے بڑے خلوص سے اعتراف کیا۔ ”تمہارے سر پر وہ نظر نہیں آ رہی۔“ اُس نے انکا کے بارے میں دریافت کیا۔ میں سمجھ گیا، وہ میری توجہ مبذول کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے میرے درد کا اندازہ لگا لیا۔ میں اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

”جیل.....“ کلدیپ کی آواز دوبارہ میرے کانوں میں گونجی۔ ”تم نے اپنی انکارانی کے سلسلے میں میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”اُس نے جاتے وقت کہا تھا کہ پرستم ال مہاراج نے اُسے یاد کیا ہے۔“ میں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ”وہ بھی مجھ سے بار بار رُوٹھنے لگی ہے۔“

”تم اُس کی بات جو نہیں مانتے۔“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”اُس کا دھیان رکھا کرو۔ میں جانتی ہوں وہ کتنا بدل چکی ہے۔ اُس کے ننھے سے من میں تمہارے لئے پیار ہی بڑا بھرا ہے۔“

”انکارانی کو شکوہ ہے کہ میں نے شیوا کو زندہ کیوں چھوڑ دیا۔“

”اب وہ شکایت نہیں کرے گی۔“ کلدیپ نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”مہاراج نے اُسے اسی کارن یاد کیا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“

”میری آتما پر بہت سی پابندیاں ہیں جیل۔“ اُس نے سرد آہ بھری۔ ”میں بھوش کے بارے میں تم سے کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیل اتنا بتا سکتی ہوں کہ کبھی کبھی منش کی غلطیوں

بھی اس کے کام آ جاتی ہیں.....“

”کلدیپ.....“ میں نے اُس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”اب زندگی سے جی اُچاٹ ہو گیا، مجھے اپنے پاس بلا لو۔ تمہارے بنا سب کچھ بڑا ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔“

”میں بھی یہی کہنے آئی ہوں۔“ اُس نے میرے اور قریب آتے ہوئے کہا۔ ”سارے کٹ راگ، سارے جھیلے، سارے بکھیزے، تمام جھگڑوں سے منہ موڑ کر کسی ایک جگہ اپنا ٹوکنا بنا لو.....“

”یہ..... یہ تم کہہ رہی ہو.....؟“ میں نے اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر میرے اندر بھرے بارود میں آگ لگ گئی۔ ”ان دشمنوں کو بھول جاؤں جنہوں نے بری زندگی میں ہر سو کانٹے ہی کانٹے بکھیر دیے ہیں۔ کہیں ایک جگہ تک کر نہیں بیٹھنے دیتے۔ تم گواہ ہو، تمہیں کھونے کے بعد مجھے جینے کی آرزو نہیں تھی۔ میں نے انکارانی سے بھی منہ موڑ لیا تھا، موت کا منتظر تھا جب جین نے سامنے آ کر جھولی پھیلا دی۔ میں ہندوستان کو خیر باد کہنے کے راوے سے اُس کے ساتھ انگینڈ چلا گیا۔ تمہاری یاد نے وہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں نے پھر خودکشی کا ارادہ کیا، پرستم لال درمیان میں آ گیا۔

اس نے کہا کہ جو کام تم نے ادھورے چھوڑے ہیں وہ مجھے پورے کرنے ہوں گے۔ میں نے مہاراج کا کہا مان لیا۔ مجھے پرستم لال ہی کی زبانی علم ہوا کہ تمہیں میری زندگی سے ملحدہ کرنے والے اُس ملازمہ خطا امر لال کی ایک اولاد چندرا کے رُوپ میں بھی زندہ ہے۔ وہ سنپولا وندھیا چل کی بیٹیوں میں بیٹھا طاقت حاصل کرنے کے لئے چاپ کر رہا تھا۔ نول کشور پنڈت پجاریوں کو میرے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ میں مہاراج کا اشارہ سمجھ گیا۔

جو تمہارے دشمن تھے میں نے اُن پر سکون دیا۔ ایک ایک اندھک کرنے کی ٹھان لی۔ ہندوستان آ گیا۔ تاج ہوٹل میں تم ہی نے کجرا پجارن کے روپ میں پنڈت کالی داس کی موجودگی سے مجھے باخبر کیا تھا۔ تم باخبر نہ کرتیں تو میں تاریکی میں مارا جا..... اچھا ہوتا..... کہانی ختم ہو جاتی۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”شاید مرنے کے لمحہ میں تمہیں پالیتا، تمہارے قریب آ جاتا۔ لیکن تم نے بروقت مجھے بچا لیا۔ اس کے بعد میں نے نوں شرم کے دست راست اوم پرکاش کا بھی کریا کریم کر دیا۔ میں بمبئی میں ہوتے ہوئے بھی اپنی تزیین سے



”جیل.....“ کلدیپ نے منت کی۔ ”میرا کہا مان لو۔ میری آتما کو کسی امتحان میں مت ڈالو۔ میں دُرگا دیوی یا سیدہ جذوب کے بارے میں زبان نہیں کھول سکتی، صرف اتنا سمجھ لو کہ اب میری آتما بھی کبھی دوبارہ تمہارے پاس کسی بھی رُوپ میں نہیں آسکے گی۔ کل کیا ہونے والا ہے؟ میں بھی جانتی ہوں۔ لیکن میں تمہیں کٹھنائیوں سے بچانا چاہتی ہوں..... کیا تم میری آخری بنی سوچا نہیں کرو گے؟ نراش کر دو گے اپنی کلدیپ کو.....؟“

میں ہونٹ چبانے لگا۔ میرا جنون اپنے شباب پر تھا۔ کلدیپ کہہ رہی تھی کہ یہ میری اور اُس کی آخری ملاقات ہے۔ وہ چلی گئی تو پھر میری نظریں اُسے کسی رُوپ میں نہیں دیکھ سکیں گی۔ میں غصے میں گرفتار تھا جب ایک خیال میرے ذہن میں ابھرا۔

”کلدیپ..... کیا تم جانتی ہو کہ پریتیم لال نے انکارانی کو کیوں یاد کیا ہے.....؟“ میں نے کلدیپ کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”مہاراج نے بلایا ہے تو اس کا بھی کوئی کارن ہوگا.....“ اُس کے جواب میں صداقت نہیں تھی۔ وہ زبان کھولنے سے گریز کر رہی تھی۔

”تم مجھے ٹال رہی ہو..... اپنے جیل کو.....؟“ میں نے شکوہ کیا۔

”تم نے بھی تو اپنی کلدیپ کی آخری اچھا (خواہش) قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی تڑپ کر اٹھا۔

”کلدیپ.....“ میں نے اُس کا ہاتھ پوری قوت سے تھام لیا۔ ”مجھ سے رُودھ کر مت جاؤ۔ میں سکون سے نہیں رہ سکتا۔“

”میں نے تم سے ملنے کی خاطر جو آخری مہلت مانگی تھی اس کا سے پورا ہو رہا ہے جیل، ہو سکے تو میری بات پر دھیان کر لیتا.....“

وہ جانے کے ارادے سے بڑی تومیں نے اُسے ہاتھوں کے حصار میں دیوچ لیا۔

”یہ پاپ ہے جیل.....“ اُس نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”تم جس شریر کو چھو رہے ہو وہ میرا نہیں، امریتا کا ہے۔“

میں نے اُسے ہاتھوں کے گھلبے سے آزاد کر دیا۔ اُس نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، پھر تیز قدم اٹھاتی دروازہ کھول کر واپس چلی گئی۔ میرے خواب پھر چٹنا چور ہو گئے۔ میرے وجود میں مایوسیوں کی کرچیاں چبھنے لگیں۔ میں سر تھام کر بستر پر بیٹھ گیا۔

نہیں ملا..... تزئین یاد ہے تا تمہیں؟ تم بھی اُس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ تمہارے پیار کی خاطر میں نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ میں پہلے تمہارے ان دشمنوں کا صفایا کر لوں جو بدری نرائن اور اُس کے اوروں کے سینوں میں رنگ بھرنے کی خاطر سر جوڑ رہے تھے۔ سب کو جہنم رسید کر لوں، پھر اٹھنا ان سے تزئین سے ملوں گا..... اور..... اب تم کہہ رہی ہو کہ میں سارے جھیلے چھوڑ کر دشمنوں کی زندگی اختیار کر لوں، اپنے بدترین دشمنوں کو پیچڑوں کی طرح ٹھکے لگانے اور تالیاں بجانے کا موقع فراہم کر دوں۔“ میں دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ مجھے کلدیپ کی موت کا خیال آیا تو میرے دل کے آتش فشاں نے بھی منہ کھول دیا..... ”مجھے تم سے بھی شکایت ہے کلدیپ، تم نے بھی مجھے دھوکے میں رکھا۔ میری خاطر کالی کو بھیٹ دینے کا وعدہ کر بیٹھیں۔ میں بے خبر رہا۔ تم امر لال کو لڑک میں جھونک کر سرخرو ہو گئیں۔ میں در بدر ہو گیا۔ مجھے خبر ہوتی تو میں تمہارے اور امر لال کے درمیان آ جاتا..... میں کام آ جاتا تو شاید تمہیں اس کرب، اس اذیت کا احساس ہوتا جس سے میں دوچار ہوں..... اب تم مشورہ دے رہی ہو کہ میں خاموش ہو جاؤں، چھپ کر کسی کوٹے کھدے میں زندگی گزار دوں.....“ میں تلملا اٹھا۔ ”نہیں کلدیپ..... نہیں۔ اب میں دشمنوں کے ساتھ پہنچ چکا ہوں۔ میری واپسی اب ممکن نہیں ہو سکتی۔ میں نے شیوا کے ذریعے دشمنوں کو پیغام بھیج دیا ہے۔ میں اُنہیں اندھیرے میں رکھ کر شب خون نہیں مارنا چاہتا تھا۔ میں نے اُنہیں لٹا کر مقابلے پر آنے کی دعوت بھیجی ہے۔ شیوا کو زندہ چھوڑ دینے میں میری اور کوئی مصلحت نہیں تھی۔ انکارانی ناراض ہوتی ہے تو وہ بھی مجھ سے کنارہ کر لے۔ زندگی کی تمنا کس کو ہے؟ میں تو سرے کفن باندھے گھوم رہا ہوں۔ موت کل آئے یا آج..... کیا فرق پڑ جائے گا.....؟“

”تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو جیل۔“ کلدیپ نے پیار سے میری گردن میں ہاتھیں ڈال دیں۔ ”میں تمہیں کل کر نہیں بتا سکتی۔ لیکن کسی کے درمیان میں آ جانے سے حالات بدل گئے ہیں.....“

”تم شاید دُرگا دیوی کی بات کر رہی ہو.....؟“ میں زہر خند سے بولا۔ ”میں اکیس روز کے عتاب میں جٹا کیا گیا تھا۔ گرو پر تاپ نے یہی بتایا تھا۔ لیکن سیدہ جذوب کے جسم کی میل نے دُرگا کی زنجیروں کی تمام کڑیاں تاکارہ کر دیں، سب ٹاپتے رہ گئے۔“

کلدھپ کی باتیں میرے جسم کے سنائے میں گونجتی رہیں۔ میرے دل و دماغ میں کشش جاری تھی۔ میں کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کی کوششوں میں مبتلا تھا جب کسی کے کھٹکھارنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے آواز کی سمت نظریں اٹھائیں..... میری پلکوں نے جھپکا کر دیا۔

میں مجذوب میرے سامنے دیوار سے ٹیک لگائے پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اُس کی وارمھی کے معمول جھپکاڑ کی مانند بڑھی ہوئی تھی۔ لباس تار تار نظر آ رہا تھا۔ لیکن چہرے پر وہی جلال موجزن تھا جسے میں نے پہلی بار رکن الدین کی حویلی میں دیکھا تھا۔ وہ قلندرانہ انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ ہونٹوں سے ٹپکنے والی رال اُس کے لباس میں جذب ہو رہی تھی۔ وہ کامل بزرگ تھا، کدوب تھا، اُسے کسی ظاہری رکھ رکھاؤ، نمود و نمائش کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا نے اُسے بے فیض و رسم سے نواز رکھا تھا..... کچھ دیر تک وہ سنجیدگی سے مجھے گھورتا رہا، پھر مسکرا کر بولا۔

”قلا بازیاں کھا رہا ہے..... کھانسی کے سحرے.....“

”میری مشکل حل کر دو پیر و شہ.....“ میں نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ ”مجھ کچھ بھائی نہیں دے رہا۔“

”میرے کی سلائی پھیر لے..... چودہ بجی روشن ہو جائیں گے۔“

”میں جس موڑ پر کھڑا ہوں وہاں مجھے تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔“

”جہاں سیر..... وہاں سوا سیر.....“ وہ دیدار سے بھا کر بولا۔ ”کان کا کھوٹ نکالنے کی

عادت ڈال لے.....“

”تم نے اب بھی میری مدد نہ کی تو میں ڈوب جاؤں گا سید۔“ میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”میرا انجام بڑا بھیا تک ہو گا۔“

”ڈر گیا..... لنگوٹی چھوڑ کر بھاگنے کی سوچ رہا ہے.....؟“

”اور کیا کروں.....؟“ میں نے عاجزی کا اظہار کیا۔

”آنکھوں پر پٹی باندھ لے..... کنوئیں میں چھلانگ مار دے۔“

”تم نے پھر اشاروں میں بات شروع کر دی؟“ میں جھلا گیا۔ ”مجھے دیکھو میں ایک کر

دکھا دو..... تمہیں اپنی بزرگی کا واسطہ۔“

وہ اُنکے کمر اُپر گیا، دیوانوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی حرکتیں بلا سبب نہیں تھیں۔ میں نے پھر اُسے آواز دی۔

”سید..... اچانک دیوانوں کی تھوڑی سی دھول میرے سر پر ڈال دو۔“

”جل جائے گا“ اُس نے مجھے غضبناک نظروں سے گھورا۔

”تمہارے ہاتھوں جانتی ہو میری عاقبت سنور جائے گی...“ میں نے انکساری کا اظہار کیا۔

”ہو میں اُڑنے لگا..... (خس باز..... مداری۔“

”مجھے تمہاری بددعائیں بھی معلوم ہیں..... آج کوئی فیصلہ کر دو.....“

”چھٹائیں جاری رکھ۔“ وہ ہاتھ پٹیا کر مدھم آواز میں بولا۔ ”ٹک ٹک..... ٹک ٹک

پرکان جمدے۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا، وہ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے خود کو بستر پر ڈھیر کر دیا۔

سید کے اشارے میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ میں اللہ کی تہ تک پہنچنے کی خاطر ذہنی جمناسٹک

میں مصروف تھا جب انکا میرے سر پر آگئی۔ بڑی دھڑلے سے اُداس نظر آرہی تھی۔

”کیا ہو گیا انکارانی.....؟“ میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ پریتم لال نے بھی تم پر کچھ

پابندیاں عائد کر دیں جو اجڑی اجڑی لگ رہی ہو.....؟“

”پابندی.....“ انکا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”تم کن پابندیوں کی بات کر رہے ہو.....؟“

میں محتاط ہو گیا۔ میں نے کلدیپ کی آتما کے آنے کی بات ظاہر کرنی مناسب نہیں

سمجھی۔ انکا پر اسرار قوتوں کی مالک تھی، اُس کی نظریں دلوں کا بھید سمجھ جان لیتی تھیں۔

پابندیوں کا ذکر میری زبان سے سن کر اُس کا چونکنا خالی از غلت نہیں ہو سکتا تھا۔

”کس لئے یاد کیا تھا پریتم لال نے.....؟“ میں نے کلدیپ کا خیال دل و دماغ سے

نکال کر سوال کیا۔

”مہاراج نے کہا ہے کہ میں تم سے اپنی غلطی کی معافی مانگ لوں۔“ وہ میرے سامنے

کسمسے لگی۔

”کس بات کی معافی.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”مجھے شاکر دو جمیل۔“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مہاراج نے کہا ہے کہ تم نے

شیوا کو زندہ چھوڑ کر کوئی غلطی نہیں کی، وہ تمہارے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا.....“

”اور کچھ؟“ میں نے بے نیازی سے دریافت کیا۔

”ہاں.....“ وہ ہنسنے لگا۔ ”مہاراج نے ایک بات اور کہی تھی۔ اُس کی آتما کو دھرتی سے آکاش پر بلایا گیا ہے۔ اب وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب کوئی میرے جنونی فیصلوں میں اڑنا نہ لگائے۔ جو کچھ ہوتا ہے ایک بار ہو جائے۔“ میں نے دہرایا۔ ”انکارانی، تم چاہو تو تم بھی میرا ساتھ چھوڑ دو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔“

”ایسی بات مت کرو جیل.....“ اُس نے تڑپ کر جواب دیا۔ ”میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔“

”پھر ایک بات کا وعدہ کرو۔ آج کے بعد تم مجھ سے روکنے کا کوئی انداز نہیں اختیار کرو گی..... سناتم نے؟ ہمارے درمیان صرف اچھے دوستوں کا رشتہ برقرار رہے گا۔ ہم کسی کو کسی بات کے لئے پابند نہیں کریں گے۔ ہمیں فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا۔“

انکارانی نے کوئی جواب نہیں دیا، اثبات میں سر کو جھٹکا، دے کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر میرے بالوں میں ڈبک گئی۔ اُس کے خاموش احتجاج کا وہ انداز بھی دیدنی تھا۔ میں نے اٹھ کر روشنی بجھائی، پھر بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ کلدیپ اور سید مجذوب کی باتیں میرے دماغ میں گونجنے لگیں.....!

کلدیپ، امریتا کے روپ میں سامنے آ کر مجھے پھر حیران کر گئی تھی۔ اُس نے جاتے جاتے مجھے باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ آخری بار دیوتاؤں سے اجازت لے کر مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ ہو سکے تو میں اُس کے مشورے پر غور کروں۔ اُس کا مشورہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ جنوں اور دہشتوں کے سفر میں وہ ہمیشہ میرے شانہ بشانہ، میرے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ بدری نرائن جیسے موذی اور سخت جان دشمن سے طویل جنگ لڑنے کے دوران اُس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ وہ دیوسور کی پہاڑیوں میں کلدیپ کے روپ میں بیٹھی جاپ بھی کرتی رہی، کلپنا کے روپ میں میری مدد بھی کرتی رہی۔ پنڈت کالی داس کو تاج محل ہول میں میری وجہ سے بٹھایا گیا تھا۔ پجارن کجرا کو اُس کا من بہلانے کی خاطر بھیجا گیا تھا۔ کلدیپ اگر کجرا کے جسم پر قبضہ کر کے مجھے کالی داس کی موجودگی سے باخبر نہ کرتی تو میں اندھیرے میں کام آ جاتا۔ اُسی کے احوالے کام پورے

کرنے کی وجہ سے پریم لال نے مجھے خودکشی کرنے سے باز رکھا تھا۔ اور اب جب میں اپنی منزل کے آخری سنگ میل کے قریب پہنچ گیا تو وہ یہ کہنے آئی تھی کہ میں تمام جھگڑوں سے منہ پھیر کر کہیں گوشہ نشینی اختیار کر لوں، دشمنوں کو پیٹھ دکھا کر واپس لوٹ جاؤں.....!!

”کیوں؟..... آخر کیوں؟“ میں نے سوچا۔ ”وہ کون تھا جس کے درمیان میں آجانے سے بساط کا رخ پلٹ گیا تھا؟ کلدیپ نے کل اُس کا نام لینے سے کیوں گریز کیا تھا؟ وہ ایسی کون سی قوت تھی جس سے کلدیپ کی آتما بھی خائف تھی؟“..... دُرگا.....! وہ یقیناً دُرگا ہی ہوگی جس نے اوم پرکاش کی موت پر سرزنش کرنے کی خاطر مجھے اکیس روز کے عتاب سے دوچار کیا تھا۔ گرد پرتاپ نے کہا تھا کہ میں اکیس روز تک اپنے پنکھ سیٹھے کہیں خاموش بیٹھا ہوں۔ سید کو میری کسمپرسی پر رحم آ گیا۔ دُرگا کو سید کی مداخلت ناگوار گزری، اُسی نے دھرم کرم کے درمیان دیوار کھڑی کی ہوگی۔ کلدیپ زندہ ہوتی تو اور بات تھی۔ مجھے یقین ہے، وہ کئی زندگیاں مجھ پر قربان کر سکتی تھی۔ لیکن اُس کی آتما دیوی دیوتاؤں کے قبضے میں تھی، وہ مجبور ہو گئی ہوگی.....!

انکارانی نے بھی واپسی کے بعد کوئی اچھی خبر نہیں سنائی تھی۔ لندن کے ہسپتال میں پریم لال کی آتما نے مجھے خودکشی کے ارادے سے روک دیا تھا، کلدیپ کے احوالے مشن کی تکمیل کی ضمانت کی تھی۔ میری ہی خاطر اُس نے انکارانی کو اضافی قوتوں سے مالا مال کیا تھا۔ اُس نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اس کا سایہ میرے ساتھ ساتھ رہے گا..... اب وہ بھی پیچھے ہٹ گیا۔ انکارانی نے میرے استفسار پر یہی بتایا تھا کہ مہاراج کی آتما کو بھی آسمانوں پر طلب کر لیا گیا ہے۔ وہ بھی میری مدد کو نہیں آئے گا.....

”دُرگا..... دُرگا..... دُرگا.....“ میرے ذہن میں ایک ہی نام کی بازگشت ہو رہی تھی۔

میرا دل چاہا اٹھ کر پوری اچھی کی تمام بتیاں روشن کر دوں، ایک ایک کو سوتے سے جگاؤں، بے اختیار قہقہے لگانا شروع کر دوں۔ اب میری دیوانگی کا سبب پوچھیں تو میں کہوں۔ ”تمہاری دُرگا نے میرے اوپر پہرے بھانے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ وہ ایک ایک کر کے میرے ساتھیوں، میرے جانثاروں کو مجھ سے دور کر رہی ہے۔ مجھے تنہا کر کے میری بے بسی کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔ سید سے نہیں جیت سکی تو اُن کا انتقام مجھ سے لے رہی ہے..... کچھ سناتم نے، میں کیا کہہ رہا ہوں؟ دُرگا پانی کے برتنہ باندھنے کی کوشش کر

میں بستر پر لیٹا کروٹیں لیتا رہا۔ کلدیپ اور پریم لال کی باتیں میرے دل و دماغ میں پھیل چکی تھیں۔ مجھے پریم لال سے زیادہ کلدیپ کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ میری زندگی تھی، میری روح تھی۔ جب تک زندہ رہی اُس کی ہر سانس مجھ سے وابستہ رہی۔ اُس کی موت بھی میری خاطر ہوئی۔ زندگی کی آخری سانسیں اُس نے میری انوش میں گزاری تھیں۔ ان دنوں اُسے مجھ سے ایک لمحہ کی جدائی بھی منظور نہیں تھی، میری بانہوں میں سمٹی پڑی حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہتی۔ پریم لال کی کنیا اُس کے لئے سب سے پورا استھان تھا۔ میں پہلے کبھی اُس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تو وہ اپنا جسم سمیٹ لیتی، دُور دُور رہنے کے بہانے تراشے شروع کر دیتی۔ مگر آخری دنوں میں وہ خود پروانے کی طرح مجھ پر ٹار ہونے لگی، بار بار میرے ہونٹوں کو چومنے لگتی، لگوٹ کی باتیں شروع کر دیتی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میسوری پہاڑیوں سے نیچے آنے کے بعد اسے اپنی زندگی کا ہم سفر بنا لوں گا۔ میری زندگی کا خلاء پُر ہو جائے گا۔ میں اس سے آنے والے لکل کی باتیں شروع کر دیتا، اُس سے سہاگ رات کی باتیں کرتا تو اُس کی آنکھوں میں مسرتوں کے پینکٹروں دے ٹھنڈے لگتے۔ اُس کی خوبصورت آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔ میں انہیں خوش سمجھتا تھا، میں اُس کے انجام سے بے خبر تھا۔ اُسے علم تھا کہ کالی کو دیے ہوئے وچن کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر جب اُس نے حقیقت کا انکشاف کیا تو میں پاگل ہو گیا۔ وہ مجھے آخری سانس تک سمجھاتی رہی، دلا سے دیتی رہی۔ مجھے یاد ہے کلدیپ نے آخری سانس اکھڑنے سے پیشتر بڑی مشکل سے اٹھ کر میری پیشانی کا بوسہ لیا تھا، پھر کسی خزاں رسید وپے کی طرح میری آغوش میں گر گئی۔ وہ ہمیشہ کے لئے زندگی سے منہ موڑ گئی۔ میں اُسے روکنا نہ سکا۔ انکارانی نے مجھے بے ہوشی سے دوچار نہ کیا ہوتا تو میں کلدیپ کے حسین جسم کو ہاتھوں میں لے کر، بلند چٹان سے چھلاگ لگا دیتا، کہانی دہیں ختم ہو جاتی۔ لیکن موت پر بھی انسان کا بس نہیں چلتا۔ میں کلدیپ کے بغیر بھی زندہ رہا، اُس کا جسم میری نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔ اُس کی روح کبھی کبھی دیوی دیوتاؤں سے کچھ مہلت طلب کر کے مجھے بہلانے کے لئے آجاتی۔ اب اُس کی روح پر بھی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ وہ دُرگا جیسی مہان دیوی ہے۔ اُس کے زبان نہیں کھول سکتی تھی، بے بس ہو گئی ہوگی!!

رہی ہے۔ پھر ہونے سمندر کی سرکش موجوں کے آگے سرکنڈوں کی بازو لگانے کی خواہش مند ہے۔ شاید اُسے نہیں معلوم کہ میں کئی بار کالی کے مندر بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر داخل ہو چکا ہوں۔ کالی نے کئی بیواؤں کو میرا راستہ کھونا کرنے کی حماقت میں جان گنوا بیٹھے۔ کئی بیواؤں نے میری وحشت کے درمیان آکر روندی گئیں۔ کیا دُرگا کو اس کا علم نہیں ہوگا.....؟ اگر وہ واقف ہے تو پھر تم سب مل کر پتھر کی اس مورتی کو سمجھاؤ..... تم نے ہی اسے تشکیل دیا ہے، اس پر رنگ روشن چڑھا کر اس کے لفظ جاری کر کے ہیں۔ تم اسے مندر میں بلند مقام پر سجا کر اس کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہو۔ اس کی پوجا کرتے ہو۔ میں تمہارے رسم و رواج، تمہارے دھرم کرم کے معاملات میں ناٹک نہیں چھڑاتا۔ لوگ درختوں کی پوجا کرتے ہیں، بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے سجدے کرتے ہیں، دیوتاؤں کو دیوتا مانتے ہیں۔ اپنے اپنے اعتقاد، اپنے اپنے یقین کی بات ہے۔ کون اچھا ہے؟ کون بڑا؟ اس کا فیصلہ بھی میرے اختیار کی بات نہیں۔ میں تم سے صرف اتنی درخواست کر رہا ہوں کہ تم اپنی زبان میں دُرگا کو سمجھاؤ کہ جیل احمد خاں کی انسان کا نہیں، ایک وحشی، ایک دیوانے کا نام ہے۔ وہ ہوش مندی کی باتیں نہیں کرتا، جوش میں آکر ہوش کھو بیٹھتا ہے، مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے، من مانی کرتا ہے۔ اپنی اسی دیوانگی کے سبب وہ کئی بار مرا، کئی بار زندہ ہوا۔ اس کی وحشتوں کی لپیٹ میں آکر اس کے اپنے بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ سہارے ایک ایک کر کے ختم ہو گئے۔ اب وہ تنہا ہے، ایک تنہا آدمی کو دُرگا اور کیا تنہا کرے گی؟ جنگلی درندوں کو طوطا بیٹا پالنے والے تیلیوں کے پنجرے میں نہیں بند کیا جاتا..... جو خود موت کا خواہاں ہو اُسے کوئی موت سے کیا ڈرائے گا.....؟ اُسے سمجھاؤ، اس سے کہو کہ ایک گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں آنے کی حماقت نہ کرے، دیوار گری تو وہ بھی پاش پاش ہو جائے گی۔ آدمیوں کی زد پر چراغ روشن کرنا شاعروں کی نازک خیالی ہے..... میں شاعر نہیں ہوں، بت پرستی بھی میرا شیوہ نہیں۔ میں پہلے ہی وحشتوں کا مارا ہوں، وہ مجھے چھیڑے گی تو میرے جنون میں کمی نہیں ہوگی، میری درندگی اور بڑھ جائے گی..... ابھی میں ہوش میں ہوں، تم میری بات غور سے سنو۔ دُرگا کو کبھی جا کر سمجھانے کی کوشش کر، کل میں ہوش کھو بیٹھا تو کچھ یاد نہیں رہے گا۔ ایک بات سمجھ لو، میں تنہا نہیں کروں گا، میرے ساتھ بڑے بڑے پنڈت، بڑے بڑے بت بھی ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ پھر مجھ سے کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہ کرنا.....

میں کرب کے عالم میں گرفتار تھا جب انکارانی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ شاید وہ بھی جاگ رہی تھی، اُسے بھی میری بے چینی کا علم ہو گیا تھا۔

”جیل..... دل چھو مت کرو۔ میں جو تمہارے پاس ہوں۔“ وہ مجھے سمجھا رہی تھی۔ ”جو چلے گئے وہ واپس نہیں آسکتے۔ جو باقی ہیں ان کے بارے میں بھی کبھی محبت سے سوچ لیا کرو.....“

”تم تین کی بات کر رہی ہو.....؟“ مجھے وہ گڑباید آگئی جسے میں نے اشرفی بیگم سے زبردستی چھین لیا تھا۔ وہ مجھے بابا کہنے لگی تھی، میری نگاہیں بھی اُسے ماں کی طرح پیار کرتی تھی۔ ہم دونوں نے سید غوث کا انتخاب کر کے اُس کی عروسی کر دی تھی۔ ایک مدت سے میں نے اپنی گڑیا کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میرے اندر کا غلام تو تین کا نام سن کر چھٹنے لگا، خیالات کے بہاؤ کا رخ بھی تبدیل ہو گیا۔

”اور بھی کچھ دلوں میں تمہاری بے پناہ محبت موجود ہے۔“ وہ بڑی اداسی سے بولی۔ ”تم نے کبھی دل میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

”کبھی فرصت ملی تو اطمینان سے دیکھوں گا.....“ میں نے انکارانی کا دل رکھنے کو کہا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے مرجھائے ہوئے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اُمید کی کرنیں اُس کی آنکھوں میں جھلکانے لگیں۔ پہلے وہ احساسات اور جذباتوں کی صداقت سے ناواقف تھی، میرے ساتھ رہتے رہتے وہ بھی سرد و گرم کا فرق سمجھنے لگی تھی۔

”کس کس کو دیکھنے کا وقت نکالو گے.....؟“ اُس نے شوخی سے کہا۔ ”اس چھت کے نیچے بھی ایک باسی کڑھی میں اُبال آ رہا ہے۔ میں اوشا کماری کی بات کر رہی ہوں۔ نارنگ ابھی تک جاگ رہا ہے، اپنے اُلجھے ہوئے کبھیڑوں کا حل تلاش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اور وہ اُس کے ساتھ لیٹی تمہاری یاد میں ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر رہی ہے.....“

”تمہیں برا نہیں لگ رہا.....؟“ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ اب صرف وہی رہ گئی تھی۔ وہ بھی زوٹھ کر رخصت ہو جاتی تو زندگی میں بڑا سناٹا طاری ہو جاتا۔ کبھی صرف سائیں سائیں کی خیالی آوازیں بھی انسان کو ڈنک مارنے لگتی ہیں، اضطراب میں جتنا کر دیتی ہیں۔

”ایسا مت سوچو جیل.....“ انکارانی میرے خیالات پڑھ کر کسمانے لگی۔ پیار سے بولی۔ ”میں خود سے تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ تم دھتکار دو تو اور بات ہے.....“

”میں تمہاری مجبوریاں سمجھتا ہوں انکارانی، مجھے اپنی کوتاہیوں کا بھی احساس ہے۔ لیکن کبھی کبھی انسان خود اپنے آپ سے بھی بے بس ہو جاتا ہے۔ بذات سر ابھارتے ہیں تو کچھ بھائی نہیں دیتا۔“ میں نے سچے دل سے کہا۔ ”میری باتوں کا براندہ مانا کرو..... تم تو میری زندگی کے ہر پہلو، تمام نشیب و فراز سے واقف ہو۔ میں غلام نہیں کہہ رہا.....؟“

”اب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے.....؟“ اُس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

”میں نے طے کر لیا ہے..... میری اگلی منزل ہر دوار ہوگی۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں جیل،! جو ہوگا، دیکھا جائے گا.....“ انکارانی کے لہجے میں اُس کا غلوں بھی شامل تھا۔ میرے ذہن سے تنہائی کا احساس چھٹنے لگا.....!!



KHAN BOOKS
& LIBRARY
6527, BHABRA BAZAR, RAMAKRISHNA
Call: 0345-5048634 0345-5048634
Prop: Ali Khan

<http://urdu-novelist.blogspot.in>

KHAN BOOKS & LIBRARY
S-527, BHABHA BAZAR, RAWALPINDI
Cell: 0345-5048634 - 0345-5048559
Prop: Ali Khan

صبح ناشتے کی میز پر سب ہی اُداس تھے۔ شاید نارنگ نے انہیں میری روانگی کی اطلاع دے دی تھی۔ خود نارنگ بھی کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ میری نظریں رہ رہ کر امریتا کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ اُس کا جسم بے حد تروتازہ و سدا بہار نظر آ رہا تھا۔ اسی جسم میں گزشتہ رات میری کلدیپ مجھ سے آخری بار ملنے آئی تھی۔ اس جسم کے غلبہ و وفراز میں مجھے کلدیپ کا عکس نظر آ رہا تھا۔ اوشا کماری کے چہرے پر اُداسی کے علاوہ کوئی شکست کا احساس بھی چل رہا تھا۔ وہ نارنگ سنا جیسے قد آور شخص کی بیوی تھی۔ نارنگ پر نہ کسی دوسروں پر اُس کا حکم ضرور چلتا تھا۔ اُس کے ایک اشارے پر کوئی بھی اُس کے قدموں میں جھک سکتا تھا۔ نہ جھکتا تو کسی نا کردہ گناہ کے الزام میں مار دیا جاتا۔ میرے سلسلے میں اُسے مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے شکار کو بے بس کر کے مارنے کی عادی تھی۔ اُس نے میرے اوپر بھی جال ڈالنے کی کوشش کی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں بھی دو چار روز میں اس کی حیثیت سے استفادہ حاصل کرنے کی لالچ میں آ کر اس کی خواہشات کی دہلیز پر سر جھکا دوں گا۔ میں اتنی جلدی جانے کے لئے پابہ رکاب ہو جاؤں گا، یہ بات اُس کے وہم و گمان میں نہیں تھی۔ ورنہ ممکن ہے وہ مجھے تسخیر کرنے کا عمل تیز کر دیتی۔ انکارانی میرے سر پر بیٹھی سب کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔

”جیل.....“ میں ناشتے سے فارغ ہو کر اٹھنے لگا تو اُس نے میرے کان میں سرسوشی کی۔ ”مجھے نارنگ کے ارادے نیک نظر نہیں آ رہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔

”وہ تمہیں ہر دو بار جانے سے روکنے کے منصوبے ہے۔“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔

”اُسے ابھی دہلی میں تمہاری ضرورت ہے۔“

”ایسا نہیں ہو گا۔“ میں نے ٹھوس آواز میں جواب دیا۔ ”نارنگ مجھے روکنے میں

کا میاب نہیں ہو گا۔ میں اُسے اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا ہوں۔“

انکا نے کوئی جواب نہیں دیا، اُس کی نظریں نارنگ کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ میں سب سے رخصت ہو کر کوٹھی کے باہر آ گیا۔ نارنگ میرے ساتھ ساتھ تھا۔ پورٹیکو میں ایک کاریگر کھڑی تھی، باوردی ڈرائیور بھی موجود تھا۔

”مہاراج..... کیا تم میرے لئے کچھ دن اور نہیں رُک سکتے؟“ نارنگ نے دہلی زبان میں کہا۔ ”تم نے بڑی مچھلیوں کے بارے میں جو کچھ کہا وہ غلط نہیں ہے۔ وہ گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُن کی نظریں مجھ تک پہنچ جائیں۔“

”اسی کارن میں نے کہا تھا کہ کچھ دنوں کے لئے ملک سے دُور چلا جا.....“ میں سپاٹ لہجے میں بولا۔

”اور وہ سور کے بچے جو میری قید میں ہیں؟“ وہ ہونٹ چبانے لگا۔

”انہیں ختم کرا دے۔“

”اتنی جلدی میں انہیں موت کی نیند نہیں سلاؤں گا۔“ نارنگ کسی زہریلے ناگ کی طرح مل کھانے لگا۔ ”اُن حرازدوں نے امریتا پر ہاتھ ڈالنے کی غلطی کی تھی۔ نارنگ کی عزت سے کھانے کی حماقت کی تھی۔ میں انہیں سکا سکا کر بڑی اذیتناک موت ماروں گا۔“

”میری مرضی.....“ میں نے لا پر واپسی سے شانے اچکائے۔

”رُک جاتے تو اچھا تھا.....“ اُس نے بڑی عاجزی کا اظہار کیا۔

”مجھے بھی کچھ ضروری کام نمنانے ہیں۔ موقع ملا تو پھر آؤں گا۔“ میں نے قدم آگے بڑھادیے۔ اُس نے دوبارہ مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر اسٹیشن کے لئے روانہ ہو گیا۔ انکا میرے سر پر اتنی باتیں مارے بیٹھی کسی سوچ میں متفرق تھی۔ میں نے اُسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ابھی تک نارنگ کے خیال سے چمکا رہا نہیں حاصل کر سکی تھی۔ میرے دماغ میں ابھی نارنگ ہی کلبار رہا تھا۔ میں نے زیر زمین کام کرنے والے دشمنوں کے بارے میں زبان چولیں کر کسی دُور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ مجھے اپنی زبان بند رکھنی چاہئے تھی۔ جرائم کی غلطیوں میں تھڑے ہوئے گرہ لے آدم خوروں کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ بے شک پڑ لیں تو شیر بھی دلدل سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

وقتیں طور پر نارنگ نے میری بڑائی تسلیم کر لی تھی۔ میں نے اُسے اوشا کماری کی زبانی امریتا کے انعام کی تفصیل سنوا کر اپنا غلام بنالیا تھا۔ میں دہلی میں اُس کی کوٹھی میں رہتا تو وہ میرے پاؤں دھو کر اپنے سے بھی کبھی دریغ نہ کرتا۔ لیکن وہ میری دُوری برداشت نہیں کر سکتا تھا، بڑے پیانے پر جو انعام کرنے والے پیشہ ور افراد اپنے کسی راز کو کبھی دوسروں کے ہاتھ نہیں لگتے دیتے۔ ایک ذرا سے شہ پر وہ اپنے گئے بھائی کو بھی زندہ درگور کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ میں نارنگ کا رشتہ دان نہیں تھا، میں نے اُسے آنے والے حالات سے بھی باخبر کر دیا تھا، یہ وارننگ بھی دی تھی کہ اگر اُس نے میرا کہا نہ مانا تو اس کے ستارے گردش میں آجائیں گے۔ اگر وہ صرف جرائم پیشہ لوگوں کی پانیا کا سربراہ بھی ہوتا تو میری بات پر عمل کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتا۔ لیکن وہ ایک ایسی ہی وقت میں دو کشتیوں پر پیر جمائے کھڑا تھا۔ راج منتری کی حیثیت میں اُس نے جو ساکھ بتائی تھی وہ اُس کے جرائم کی پردہ پوشی کرتی تھی۔ حکومت کا ایک اہم ستون ہونے کے ناتے اُسے بڑے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اُس کے مخالفین بھی اُس کی سرد و گرم سننے اور برداشت کو سننے پر مجبور تھے۔ وہ اس عہدے کو چھوڑنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا، شیر کی کھال اُس کے جسم سے عارضی طور پر علیحدہ ہو جاتی تو نہ صرف اُس کے سیاسی دشمن اُس کی جان کے لاگو ہو جاتے بلکہ انڈر ورلڈ کے مخالفین بھی پہلی فرصت میں اُسے بھنبھوڑ ڈالنے کی خاطر دانت تیز کرنے لگتے۔ نارنگ کسی ایک کشتی سے بھی پاؤں ہٹانے کو تیار نہیں تھا۔ اسی لئے مجھے روکنے کی بار بار کوشش کر رہا تھا۔ وہ میری پراسرار ماورائی قوتوں کے ذریعے اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں اُس کے خواب چکنا چور کر کے واپس جا رہا تھا۔ اُس کا تملانا قدرتی امر تھا۔

ایشیئن کے راستے میں میرے اور انکارانی کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم رہے۔ گاڑی ایشیئن پر جا کر رکی۔ میں نیچے اُتر تو ریلوے کے عملے کے ایک اعلیٰ آفیسر نے میرا استقبال کیا۔ شاید نارنگ نے فون کے ذریعے اُسے پابند کیا تھا۔ ہر دو دروازے والی گاڑی دوسرے پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ مجھے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں بٹھا دیا گیا جس میں دو مسافر پہلے سے موجود تھے۔

”کچھ جل پانی کرو گے مہاراج.....؟“ جس آفیسر کو میری دیکھ بھال کی ہدایت کی گئی تھی

اُس نے بڑی انکساری سے پوچھا۔
 ”گاڑی چلنے میں کتنی دیر باقی ہے.....؟“ میں نے اُس کی بات نظر انداز کر دی۔ انکا کچھ سوچ کر میرے سر سے اُتر گئی۔
 ”میں منٹ.....“
 ”تمہارا شبہ نام.....؟“

”سیوک کو راجہ رام کہتے ہیں.....“ اُس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”منتری جی کی بڑی کرپا جو انہوں نے آپ کی سیوا کے لئے میرا چناؤ کیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ آپ مہان فطرتی کے مالک ہیں۔ مئی کو ہاتھ لگا دیں تو وہ بھی سونا بن جائے۔ چکواپے اس سیوک کو بھی دان کر دو مہاراج.....“

میں نے سرسری نظر سے اُس کے دل میں جھانک کر دیکھا تو مجھے ہنسی آئی۔ وہ ایک عیاش صفت آدمی تھا۔ جس عہدے پر فائز تھا وہاں تک پہنچنے کی خاطر بھی اُس نے خوشامد اور خوبصورت لڑکیوں کی سفارش استعمال کی تھی۔ ایسا نہ کرنا تو ہیڈ کلرک کے عہدے سے اُسے کبھی نہ بڑھ پاتا۔

”تمہارا ایک اشارہ ہو جائے گا، میرے بھاگیہ کے“ اُس نے دوبارہ منٹ کیا۔

”میری ایک بات مانے گا.....؟“ میں نے سنجیدگی سے اُسے گھورا۔
 ”تم حکم دو مہاراج.....“

”صرف رام رام کرنا شروع کر دو۔ راجہ کا پھندا نا اپنے نام سے نکال کر پھینک دے۔“
 ”میں..... میں سمجھا نہیں مہاراج.....“ وہ گڑبڑانے لگا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہے، جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

”گھر کی صاف ستھری سبزی، تازہ بھانجی پر گزارا کرنے کی معاونت ڈال لے۔ بازار کے چٹ پٹے بھوجن پر منہ مارتا رہا تو پیٹ گڑبڑا ہو جائے گا۔ میں نے نصرت کا اظہار کیا۔
 ”جا..... پھنسی کر۔ کوئی دفتر میں بیٹھی تیری راہ تک رہی ہے۔“
 میں نے اُس کی پول کھول دی تو وہ شیشا نے لگا۔ خاموشی سے اُسھ کر چلا گیا۔ میں نے

میں سنی سستانی بیٹھی تھی۔ دونوں مرد مسافروں کی نظریں بار بار خاتون کی طرف اٹھ رہی تھیں جو برقعہ میں چہرہ چھپائے پلٹ فارم کی دوسری جانب متوجہ تھی۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکا موجود نہیں تھی۔

گاڑی نے وقت مقررہ پر ریٹنا شروع کر دیا۔ میں پھر چندرا اور نول کشور کے خیال میں گم ہو گیا۔ نول کشور کو علم ہوگا کہ میں کئی بار جان چھٹی پر رک کر کالی کے مندروں میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس نے میرا راستہ روکنے کی خاطر بہت سوچ سمجھ کر ہی کوئی موثر قدم اٹھایا ہوگا۔ ایسا منڈل کھینچا ہوگا جس کے اندر میری رسائی ممکن نہ ہو۔ اُسے دُرگ کی حمایت بھی ضرور حاصل ہوگی جس نے کل دیپ اور پریتم لال پر بندشیں لگا دیں۔ میں نے سید کی لالھی پر گرفت مضبوط کر لی۔ مجھے یاد ہے، ایک بار کل دیپ نے بھی کہا تھا کہ میں اس لالھی کو سنبھال کر رکھوں، کسی آڑے وقت میں یہ میرے بڑے کام آئے گی۔ پریتم لال بھی اس لالھی کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا تھا۔ اُس نے بھی کہا تھا کہ اپنی زندگی بھر کی تمام پونجی اور لازوال قوتوں کے عوض بھی اگر وہ اس لالھی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو سودا ہنگامہ

میں نے بڑی عقیدت سے لالھی کو بوسہ دے کر سیتے سے لگایا۔ وہ اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ انکا ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ برقع پوش خاتون بدستور غائب ہے چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ دونوں مسافر مردوں کی دلچسپی اُس میں بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک بار سب مل چاہا کہ اُن کی تھوڑی سی گوش مالی کر ڈوں۔ لیکن میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ہر دو دن پہنچنے سے پیشتر میں کسی معاملے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مقدر کے لکھے کو مٹانا بھی میرے بس نہ تھا۔

گاڑی تیسرے یا شاید چوتھے اسٹیشن پر رکی تو ڈبے کا دروازہ کھلا۔ ایک انسپلر چار پولیس والوں کے ساتھ دندنا ہوا اندر داخل ہوئے انہوں نے مجھ پر یو ایل اور راسفلش تان لیں۔ میں موقع کی نزاکت نہ محسوس کر سکا۔

”تمہارا نام جمیل احمد خاں ہے۔“ انسپلر نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”ہمارے پاس تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہے۔“ وہ گرج کر بولا۔ ”تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

KHAN BOOKS
& LIBRARY

S-527, BHABRA BAZAR, RAIALPINDI
Cell: 0345-5048634 - 0345-5048559

Prop: Ali Khan

آنکھیں بند کر کے نشست سے ٹیک لگائی۔ میرے ذہن میں نول کشور اور چندرا کا خیال کلبلائے لگا۔ میں نے ارتکاز اور مراقبہ کا عمل شروع کیا۔ اندھیرے میری نگاہوں کے سامنے سے چھٹنے لگے۔ مجھے کالی کا وہ عظیم الشان مندر نظر آنے لگا جہاں میرے دشمن چھپے بیٹھے تھے۔ مندر بڑے وسیع و عریض تھا۔ تہہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اُس کے گنبد پر سونے کے کلس جھلملا رہے تھے۔ پنڈت پجاری، دیو داس اور پجاریوں جو درجہ مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک میلے کا ساں نظر آ رہا تھا۔ میں نے مندر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ میں ایک نظر چندرا کو دیکھنا چاہتا تھا جو عہد شباب میں چور کی باتیں سوچ رہا تھا۔ میں اُسے مورد الزام نہیں ٹھہراتا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا تو شاید باپ کے انتقام کی آگ مجھے بھی جھلسا دیتی۔ میں بھی عقل و دانش سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ میں روڑتا ہوا گاڑھا اور جوان خون مجھے بھی سیاہ و سفید کے فرق سے بے نیاز کر دیتا۔ جوں جوں مجھے بے تجربہ نہیں رکھتے وہ بھی اپنے پیاروں کو بچانے کی خاطر آنکھ بند کر کے سمندر میں جھلنا لگتا۔ دیکھتے ہیں۔ حماقت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب موت کے احساس سے دم چھٹتا ہو۔

چندرا کو بھی غالباً علم نہیں تھا کہ وہ گھبری ہو کر پہاڑ سے ٹکرانے کا فیصلہ کر بیٹھا ہے۔ نول کشور نے اُسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا ہوگا، اُسے بتایا ہوگا کہ وہ اُس امر لال کا واحد سیوک ہے جسے دوسرے تمام پنڈت پجاریوں کے مقابلے میں کالی کا آشیر باد سب سے زیادہ حاصل تھا۔ گمراہی کے راستوں پر ڈالنے کی خاطر اُس کے معصوم کانوں میں زہر کے قطرے پکائے ہوں گے۔ زہریلی باتیں کی ہوں گی، اُسے اُکسانے کے لئے اپنے تجربوں کی دودھاری تلواریں استعمال کی ہوں گی۔ اُس سے کہا ہوگا کہ جمیل احمد خاں کو جان سے مارنے کے بعد وہ امر ہو جائے گا۔ امر لال کی آتما کو بھی قرار آ جائے گا۔

چندرا کے علاوہ میں پنڈت نول کشور کے درشن بھی کرنا چاہتا تھا جو منڈل میں بیٹھا بیجا رہا تھا۔ نا عاقبت اندیش پنڈت پجاریوں کو دھرم کے نام پر موت کے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل رہا تھا۔ لیکن میری آرزو پوری نہ ہو سکی۔ میرے ذہن کی پرواز مندر کے صدر دروازہ پر ہی کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر ختم ہو گئی۔ میں نے مندا کے ایک اور عمل کو آزمایا لیکن اُس حصار کو نہ توڑ سکا جو پنڈت نول کشور نے قائم کر رکھا تھا۔ میں نے تھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ گپاڑ منٹ میں ایک برقع پوش خاتون کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک علیحدہ برقعہ پر کھڑی

نقاب پوش خاتون ایک ادھیڑ عمر کی عورت ثابت ہوئی جس کے چہرے پر چمک کے بے شمار داغ نظر آرہے تھے۔

”آئی ایم سوری میڈم، لیکن.....“ انسپٹر اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ جو کچھ ہوا وہ شاید اُس کی توقع کے برعکس تھا۔ عورت بل کھاتی اپنی نشست پر واپس چلی گئی۔ انسپٹر ایک لمحے خاموش رہا پھر جھلا کر بولا۔ ”کچھ بھی ہو، تمہیں ایس پی کے آفس تک بہر حال میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“

”اپنا وقت برباد مت کرو انسپٹر.....“ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”بغیر وارنٹ کے تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھ سفر کرنے والے دو مسافر بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ تم بلاوجہ مجھے تنگ کر رہے ہو..... بات بڑھانے کی کوشش نہ کرو تو تمہارے حق میں زیادہ مناسب ہوگا۔ جن لوگوں نے تمہیں بھیجا ہے اُن سے جا کر کہہ دینا کہ اپنا کھال ہی میں رہیں..... مجھے دوبارہ چھیڑنے کی کوشش کی تو بڑے گھائے میں رہیں گے۔ سمجھ رہے ہو یا نہیں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”کوئی تیری سیٹی کی آواز سنائی دی، انسپٹر کے تیور یکھت بدل گئے۔ دو سپاہیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا ڈبے سے باہر نکل گیا۔ انکارانی میرے سر پر آگئی۔ اُس کی نگاہوں میں شے دکھائی دے رہی تھی۔

”دیکھ لیا جیل.....؟“ میں نے نارنگ کے بارے میں جو کہا وہ غلط نہیں تھا۔ ”اُس نے مجھے پوری تفصیل سناتے ہوئے کہا۔“ یہ انسپٹر اُسی کے اشارے پر آیا تھا.....“

”بغیر وارنٹ کے.....“ میں نے جواب دیا۔

”میں تمہاری قوتوں سے ناواقف نہیں ہوں۔“ اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”وہی وارنٹ اُس کی جیب سے دوبارہ برآمد ہوگا تو وہ اپنا سر پہنے لے گا۔ یہ بھی مت بھولو کہ اگر میں نے پولیس کی خریدی ہوئی حسینہ کو روک کر اُس کی جگہ اس تشکیلات پر سے والی برقع پوش خاتون کو گاڑی میں نہ چڑھایا ہوتا تو اُس کے بیان پر تم بغیر وارنٹ کے بھی دھڑلے مارتے۔“

”احسان جتاری ہو.....؟“ میں نے انکارانی کو نیکی نظروں سے دیکھا۔

”نہیں..... تم سے دوستی کا حق ادا کر رہی ہوں۔“ اُس نے مسکرا کر کہا، پھر نقاب پوش

”میرا جرم کیا ہے.....؟“ میں نے انسپٹر سے سوال کیا۔

”تمہارے دو پر دہلی کے ایک شریف خاندان کی لڑکی کو زبردستی اغواء کرنے کا الزام ہے۔“ انسپٹر نے برقع پوش خاتون کی طرف ایک اچھتی ہوئی نظر ڈال کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی بھی تمہارا ساتھ ہی ہے.....“

میرے ذہن میں انکا کچھ نہ گونجنے لگے۔ دہلی سے روانگی کے وقت اُس نے نارنگ کی کوٹھی پر اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے ہر دوار جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا۔ انکارانی کو نارنگ کے ارادے تک نہیں نظر آرہے تھے۔ میں اُس کی بات ٹال کیا تھا، مگر اب صورت حال واضح ہوگئی تھی۔ نارنگ نے مجھے دہلی سے خاصی دور نکل جانے کے بعد روکنے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ عملی صورتحال میں سے سامنے تھا۔ میں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کر لیں۔ انسپٹر کو ایک جھٹکا دینا ضروری تھا۔

”تم نے سنا نہیں..... میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں.....؟“ اُسے شاید میرے آنکھ بند کر لینے کی ادا پسند نہیں آئی تھی۔

”کیا تم مجھے میرا وارنٹ گرفتاری دکھا سکتے ہو.....؟“ میں نے آنکھ کھول کر سلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

انسپٹر نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ دو مسافروں کی موجودگی میں وہ قدرے محتاط نظر آ رہا تھا۔ میری بات سن کر اُس نے بڑے اعتماد سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں اُس کی خود اعتمادی پر مسکرا دیا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے تمام جیبیں کھنگال ڈالیں لیکن دو چار نوٹوں کے سوا کچھ اور برآمد نہیں ہوا۔ اُس کی حیرت قابل دید تھی۔

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے.....“ میں نے بڑے سکون سے کہا۔ ”میں لڑکیاں اغواء کرنے کا کام نہیں کرتا.....“

”یہ..... یہ لڑکی کون ہے؟“ اُس نے جھلا کر برقع پوش خاتون کی سمت اشارہ کیا۔

”تم یہ سوال براہ راست خاتون سے بھی کر سکتے ہو۔“ میرے لہجے میں روکھائی آگئی۔

انسپٹر، خاتون کی سمت بڑھتا چاہتا تھا، وہ خود اُنھ کو قریب آگئی۔

”میں تمہیں کوئی اغواء شدہ لڑکی نظر آتی ہوں.....؟“ خاتون نے برقع کا نقاب غصے سے ہٹایا تو دونوں مسافر بھی کسمسے لگے۔ انسپٹر کے منہ کا مزہ بھی کرکرا ہو گیا۔ میں بھی

”ہاں۔ لیکن ہر دوار کا نام درمیان میں آ جانے سے تم یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ وہ تمہارے دشمنوں سے مل گیا ہے؟“ انکارانی نے مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس وہم کو ذہن سے نکال دو۔ نارنگ، پنڈت پجاریوں کو اپنی ضرورتوں کے تحت مشین کے پرزوں کی طرح ضرور استعمال کرنے کا عادی ہے۔ لیکن دھرم کرم سے اُس کا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا اُس وقت تک جب تک زیر زمین کام کرنے والوں سے اُسے مکمل طور پر چھٹکارا نہ مل جاتا۔“

انکا کی باتوں میں وزن تھا لیکن جب تک میں ہر دوار نہیں پہنچ گیا، میری بے چینی برقرار رہی۔ اپنی منزل پر قدم رکھنے کے بعد ہی مجھے ذہنی سکون ملا۔ پنڈت نول کشور اب تک کالی کے مندر میں چھپا بیٹھا دور دور سے چنگاریاں جھوڑ رہا تھا، شعلے بجڑ کا رہا تھا، سر پھرے پنڈت پجاریوں کو ایندھن کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ اب اُسے براہ راست مقابلے پر آنا پڑے گا۔ جنگ دوسرے کے علاقے میں لڑی جائے تو دھماکوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ اپنی زمین پر ایک پٹانے کی آواز بھی دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ میں بڑی دیر تک پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا کے رخ کا اندازہ لگا رہا۔ انکا بھی پوری طرح محتاط نظر آ رہا تھا۔ اُس کی پتلیاں بڑی مستعدی سے اپنے حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ اُس کے ہاتھوں کی کوئی قید نہیں تھی۔ اُس کی دور بین نظریں سمندر کی تہوں تک بھی پہنچ سکتی تھیں۔ وہ بھی تمام وجوہات میں نظریں دوڑا کر حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

ہر دوار، دریائے گنگا کے ساحل پر واقع صوبہ یوپی کا ایک مشہور شہر ہے۔ ہندو اسے اپنے لئے بڑا مقدس سمجھتے ہیں۔ وہاں کی سرزمین پر ماتھا ٹیکنا بھی ان کے لئے کسی سعادت سے کم نہیں۔ اس شہر میں ہر بارہ سال بھلا شہواجی کی یاد میں کبھ کا میلہ منعقد کیا جاتا ہے۔ پورا ہندوستان سمٹ کر اس شہر میں سا جاتا ہے۔ ہندوستان سے باہر رہنے والے پنڈت پجاری بھی اس میلے میں دنیا کے دور دراز علاقوں سے پہنچ آتے ہیں۔ پنڈت پجاری اور پجاری سب ایک ساتھ گنگا میں اشان کرتے ہیں۔ بڑا عجم دھڑکا ہوتا ہے۔ دن رات مندر کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں۔ سکھ کی آوازیں دلوں کو گرمائی ہیں۔ ہر دوار کو ہری کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کے نقشے میں اسے ”ہری دوار“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی آبادی ایک لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ دو یا تین لاکھ بھی ہوتی تو میری ذہانت پر اس کا

خاتون کے لئے پیر واپس چلی گئی جو اگلے اسٹیشن پر بڑی خاموشی سے اتر گئی تھی۔ انکا دوبارہ میرے سر پر آٹھ۔

سفر جوں جوں گتھا ہوا میرے خدشات کم ہوتے گئے۔ میرا خیال تھا جب نارنگ کے آدمیوں نے اُسے میرے بارے میں اپنی ناکامی کی داستان سنائی ہوگی تو وہ پاگل ہو گیا ہو گا۔ اُس کا شمار ان شریف لوگوں میں نہیں کیا جاسکتا تھا جو اپنی شکست مردانگی سے قبول کر لیتے ہیں۔ اپنے منصوبے کی ناکامی کی اطلاع نہ کر وہ نئے طریقے بھی اختیار کر سکتا تھا۔ اُس کی پیشانی پر ابھرنے والی سلوٹیں بھی حکومت کے لئے بڑے معنی رکھتی تھیں۔ اُس کی ٹوٹی بڑی مضبوط تھی۔ کوئی اُس کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ امریتا کے سلسلے میں، میں نے اُس کی مدد کی تھی۔ ان میں نارنگ کی مرضی یا اس کی خواہش کا دخل نہیں تھا۔ حالات خود مجھے اُس کے راستے میں لے گئے تھے۔ میں اس ڈبے میں سفر نہ کر رہا ہوتا جس میں امریتا کو اغواء کیا جا رہا تھا تو شاید نارنگ کا نام بھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہ آنے پاتا۔ حالات کی ستم ظریفی مجھے درمیان میں لائی تھی۔ دہلی کے پولیس کے محکمے کے تمام بڑے افسران کو اس بات کا علم بھی ہو گیا تھا کہ میں نے نارنگ کی کٹھی میں قیام کیا تھا۔ نارنگ میرے اوپر کوئی بھی الزام لگا دیتا، صرف اس بات کا سرسری طور پر ذکر کر دیتا کہ امریتا کے اغواء میں اصل مجرموں کے ساتھ میری ملی جلت کے امکانات کو خارج نہیں قرار دیا جاسکتا، رائی کا پہاڑ بن جاتا۔ دہلی پولیس کا عملہ مجھ پر ٹنڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑتا۔ مجھے بھاگے راستہ نہ ملتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اپنی ناکامی کی خبر سن کر نارنگ نے یہ بھی ضرور سوچا ہوگا کہ شہد کی کھیوں کے چھتے میں پتھر مارنا خود اُس کے لئے بھی مصیبت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ میری قوت کا اندازہ لگا چکا تھا، امریتا کے سلسلے میں وہ پہلے ہی انڈر ورلڈ کے جرائم پیشہ افراد سے الجھا ہوا تھا، مزید الجھاوے پیدا کرنا اُس کے حق میں مناسب نہ ہوتا۔ یہی سوچ کر اُس نے خاموشی اختیار کر لی ہوگی، صبر کر لیا ہوگا۔ انکا نے بھی میری تشویش محسوس کر کے یہی کہا تھا۔

”تم دوسوں کو دل و دماغ سے نکال دو جیل، نارنگ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہوگا۔ وہ دوبارہ تمہارے راستے میں دیوار کھڑی کرنے کی غلطی نہیں کرے گا۔“

”تم نے کہا تھا کہ وہ مجھے ہر دوار جانے سے ہر قیمت پر روکنے کی کوشش کرے گا۔“

دیدے نچا نچا کر گھنٹیاں بجانی شروع کر دیتیں۔ مدھ اور بھگ کے پیالے گردش میں آ جاتے، پنڈت پجاری مدھوش ہو کر میری موت کا جشن منانے کی خاطر حسین پجاریوں اور مصوم دیوداسیوں کو مال غنیمت سمجھ کر اپنی اپنی آغوش میں گھسیٹ لیتے۔ وہ کوہے مٹا کر گھنٹیاں بجانا بھول جاتیں، ہٹے کٹے پجاریوں کے بازوؤں میں بے بس ہو کر پھڑپھڑانا شروع کر دیتیں۔ کالی کا بت خاموش کھڑا تماشے دیکھتا رہتا۔

میں اپنے خوابوں میں گم تھا جب کسی کی آواز نے میرے حسین خیالوں کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ میں نے نظریں گھما کر دیکھا، وہ ایک سیدھا سادھا نوجوان نظر آ رہا تھا۔ ٹھوس اور گھٹے ہوئے جسم کا مالک۔

”کہاں گم ہو مہاراج.....؟“ وہ میری طرف متحس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”جہری ادوار میں شاید پہلی بار آنا ہوا ہے۔ کہاں جانے کا دوا چاہیے.....؟“

”تم کون ہو.....؟“ میں نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ انکارانی کی نظریں بھی نوجوان پر مرکوز ہو گئیں۔

”اپنا سیوک ہی سمجھ لو۔“ اُس نے بدستور انکساری سے کام لیا۔ پھر میرے سیدھے سادے جواب کو دیکھ کر دبی زبان میں پوچھا۔ ”تمہارا شہ نام.....؟“

”میل، اسی کا اپنا نام ظاہر نہ کرتا.....“ انکار نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”یہ ایک سرائے نما ہوٹل کا نمائندہ ہے۔ تمہیں مسافر سمجھ کر اپنے ٹھکانے پر لے جانا چاہتا ہے۔“

”نام نہ ظاہر کرنے میں کیا مصلحت ہے.....؟“ میں نے جان بوجھ کر سوال کیا۔

”تمہارا بھیجا ہوا پیغام شیو کے ذریعے پنڈت نول کشور تک پہنچ چکا ہوگا۔“ انکار نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اُس کے آگے بروہہ کے تمام راستوں میں پھیل چکے ہوں گے۔ تمہاری خوشبو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ میں تمہیں تھپانے کا مشورہ دوں گی۔“

”میں سمجھ رہا ہوں جان من.....“ میں نے لہرا کر جواب دیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ دشمنوں کو میرے آنے کی اطلاع مل جائے۔ ایسا نہ چاہتا تو شیو کو زندہ چھوڑ کر تہاری ناراضگی کبھی نہ مول لیتا۔ وہ میرا بہت سکون برباد کر چکے۔ اب میری جگہ ہے، انہیں میرے آنے کی خبر ملے گی تو اُن کے اندر بھی پھل مچے گی۔ اٹھل پھل کر رہو گے۔“

”کچھ رہی ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

کیا اثر پڑتا ہے؟ تو صرف دو افراد سے غرض تھی، پنڈت نول کشور جس نے میری پُرسکون زندگی کی سطح پر کتنے پھل کی ماضی پر اب کی لہریں پیدا کر دی تھیں۔ پریم لال نے بھی مجھے صرف دو ہی نام بتائے تھے۔ دو نام میری کلدیپ کے قاتل امر لال کے اکلوتے بیٹے چندرا کا تھا۔ دونوں کالی کے اس عظیم الشان مندر میں چھپے بیٹھے تھے جس پر مہاجنوں اور سیٹھ ساہوکاروں نے بے دریغ سرمایہ خرچ کیا تھا۔ وہ قلعہ بند تھے، خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ لیکن میں اب اُن کا سکون برباد کرنے کی خاطر اُن کے سروں پر پہنچ گیا تھا۔ اب وہ زیادہ دنوں چین کی بھری نہیں بچا سکتے تھے۔

میرے ذہن میں چندرا اور پنڈت نول کشور کا تصور چل رہا تھا۔ میں تصور میں نول کشور کو اپنے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی رقت سے لڑھک رہا تھا۔ اُس کا لبو لہان چہرہ دیکھ کر مجھے اُس پر ترس نہیں آیا۔ وہ بڑا موڈی درندہ تھا۔ درندہ کو آواز نہیں رکھا جاتا، لوہے کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ کر قابو کیا جاتا ہے۔ انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ پھر درندگی کا مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔ بہتر ہے انہیں موت کی نیند سلا دیا جائے۔

میری بے رحم نظریں نول کشور کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ موت کو سر پر منڈلاتا دیکھ کر اُس کی ٹھکی بندھ گئی تھی۔ وہ مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ حرامزادہ مگر چھ کے آنسو بہا کر مجھے رام کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اگر اُسے علم ہو جاتا کہ اُس کے آنسو کے قطرے میرے سینے میں دھکی آگ پر پٹرول کا کام سرانجام دے رہے ہیں تو شاید اس کے آنسو ختم جاتے۔ وہ میرے پیروں پر سر رکھ دیتا۔

نول کشور کے برابر امر لال کا وہ نوجوان بیٹا بھی دم بخود کھڑا مجھے ٹھکی باندھے دیکھ رہا تھا جس نے دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کی خاطر وندھیا چل کی برفانی گچھاؤں میں جاپ منتر کئے تھے۔ مجھے اُس کی جوانی پر ترس بھی آ رہا تھا۔ اس ولد الحرام نے بھی مجھے نچا دکھانے کی خاطر اپنے سارے جنت منتر آزما ڈالے تھے۔ میرے قدم ذرا رپٹ جاتے، میں لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا ہوتا تو وہ اور نول کشور دونوں جنگی سوروں کی طرح میرے اوپر چڑھ دوڑتے۔ میری زندگی کا چراغ گل کرنے کی خاطر کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرتے۔ میرے مرجانے کے بعد بھی شاید وہ میرے مردہ جسم کو بھنبوڑتے رہتے، روندتے رہتے۔ پھر کچھ پھونکے جاتے، کالی کو میری موت کا مژدہ سنانے کی خاطر حسین پجاریں منک منک کر

انکار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا پیش کردہ جواز معقول تھا۔ وہ میری طرف سے توجہ ہٹا کر پھر نو جوان کو ہٹانے لگی۔

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا مہاراج.....“ نو جوان اصل مقصد کی طرف آ گیا۔ ”اگر ہری دوار میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے تو سیوک کے ساتھ چلو۔ ہمارے مسافر خانے میں تمہیں گھر جیسا آرام ملے گا۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

”یہاں کا سب سے بڑا ہوٹل کون ہے؟“ میں نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔
 ”آند بھون.....“ نو جوان نے برا سامنے ٹاپا۔ ”آج کل رش نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں خالی کمرہ مل جائے۔ لیکن.....“ وہ خاموش ہو کر میرے لیے کا جائزہ لینے لگا۔

”چپ کیوں ہو گئے بالک.....“ میں نے اُس کی نگاہوں کا غہوم سمجھ کر پوچھا۔ ”کیا آند بھون میں مسافروں کی جیب کی بجائے اُن کے تن کے کپڑوں کا زرد دھیان رکھا جاتا ہے.....؟“

”تم خود سمجھداری کی بات کر رہے ہو تو پھر میں کیا بتاؤں؟“ اُس نے زہر اُٹھانے کی چال چلی۔ ”وہاں سیدھے سادھے یاत्रीوں کی کھال اُدھیر لی جاتی ہے۔ بڑے بڑے سینھ ساہوکار ہی اُدھر کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے تمہیں کھل کر بتا دیا، آگے تمہاری مرضی۔“

”تم یہیں ٹھہرو جیل..... میں ابھی آتی ہوں۔“ انکارانی مجھے رکنے کا اشارہ کر کے سر سے اتر گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ میں نو جوان سے باتوں میں مصروف تھا کہ ایک بانکا بھیلوا جوان میرے سامنے آ کر رُکا۔ سر اُٹے نما ہوٹل کا جوان اُسے دیکھ کر خاموشی سے سرک گیا۔ میں نے آنے والے پر نظر ڈالی۔

”میرے ساتھ آؤ مہاراج.....“ اُس نے بڑے مہذب لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔
 ”باہر گاڑی بھی موجود ہے۔“

”تم.....؟“

”آند بھون کا میئر ہوں۔“ اُس نے مسکرا کر اپنا تعارف کرایا۔ ”مجھے دیر سے خبر ملی، ورنہ تمہیں اتنی دیر بھی انتظار نہ کرنا پڑتا۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ انکارانی کے زیر اثر تھا۔ میں باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ آند بھون شہر سے کچھ فاصلے پر تھا، لیکن اسے دیکھ کر دہلی کا اشوکا یاد آ گیا۔ میری نگاہیں تمام راستہ جھٹکتی

رہیں۔ میں کالی کے مندر کی تلاش میں تھا جو میرے بدترین دشمنوں کی پناہ گاہ تھی۔ مگر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ راستے میں جگہ جگہ پنڈت پجاری چلتے پھرتے نظر آئے۔ دو چار چھوٹے موٹے مندر بھی دکھائی دیے۔ میں نے راستے میں میئر سے بات نہیں کی، اپنے خیالوں میں متفرق رہا۔

گاڑی آند بھون کے خوبصورت پارکنگ لاث میں جا کر رُکی۔ ہوٹل کی چار منزلہ عمارت کا حسن اور رکھ رکھاؤ قابل دید تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ میئر نے مجھے ہوٹل کے مندر دروازے پر اُتارنے کی بجائے پارکنگ لاث کا رخ کیوں اختیار کیا؟ میں نے فوری طور پر کوئی باز پرس مناسب نہیں سمجھی۔ انجن بند کر کے اُس نے تیزی سے نیچے اتر کر میرے لئے دروازہ کھولا۔ میں باہر آیا تو کہنے لگا۔

”ایک راستہ پارکنگ لاث سے بھی آند بھون کے اندر جاتا ہے، اسے کیول ہمارے خاص گاہک استعمال کر سکتے ہیں۔ عام مسافروں کو یہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم اپنے مہربانوں کی سیوا کا خاص دھیان رکھتے ہیں۔ تم تو دھرماتما ہو مہاراج، ہمارے چرنوں کی برکت سے آند بھون کا کاروبار بھی چمک اٹھے گا.....“

میئر باتونی آدی تھا۔ میں خاموشی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ عقبی راستے کو اس طرز پر بنایا گیا تھا کہ کسی سرگ سے گزرنے کا احساس ہوتا تھا۔ باہر سبزہ ہی سبزہ تھا، اندرونی راستوں پر بھی پتوں کے جھللاتے مخصوص گملوں میں خوشنما پودے موجود تھے۔ روشنی کا اہتمام بھی اس طرح کیا گیا تھا کہ وہ چھت کے گوشوں سے پھوٹتی نظر آتی تھی۔ مجھے پہلی منزل کے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں آرام اور آسائش کا ساز و سامان بھی دہلی کے اشوکا سے کم نہیں تھا۔ مجھے کسی لکھا پرچی کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ راہداری میں مجھے ہوٹل کے عملے کے افراد بھی نظر آئے۔ اُن میں حسین و زیبائیاں بھی شامل تھیں جن کے ماتوں پر سرخ رنگ کی بندیاں موجود تھیں۔ ان بندیوں کے اندر آند بھون کا نام سنہری حروف سے لکھا گیا تھا جو دور سے جگمگاتا نظر آتا تھا۔ یہ گویا اُن کی شناخت تھی۔

”کچھ دیر سستا لو مہاراج۔“ میئر نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”نور آئے ہو، تھک گئے ہو گے۔ کوئی ضرورت ہو تو گھنٹی بجاکر کسی بھی سیوک کو بلا لینا۔ میں بھی آند بھون کا.....“ اُس نے بستر کے ساتھ ہی ایک طرف لگے ہوئے سوچ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑی

انکارانی سے کہا۔ ”آئند بھون کے سیوکوں کو تمہاری سیوا کر کے جو آئند ملے گا، وہی ہمارا انعام ہوگا۔“

”تمہارا انعام.....؟“ میں نے بستر پر کمر سیدھی کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”سیوک کو بھنڈاری کہتے ہیں.....“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”کالی کا بڑا مندر یہاں کے قلعے میں ہے.....؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو مہاراج.....“ وہ میرے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ ”تمہارے

لئے دُور کیا اور نزدیک کیا۔ تم پلکوں کو ایک (شہر) کو بنا، آئند بھون کی گاڑیاں کس دن کام آئیں گی؟ سب کچھ اپنا ہی سمجھو۔“

”ایک بات اور دھیان سے سن لے بالک.....“ میں نے ذرا تیز لہجہ اختیار کیا۔

”ہمارے سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔ کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم سنایا ہی لوگ ہیں،

دوسروں سے الگ تھلک رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ نمائش تم جیسے بالکوں کو شہر بھادیتی ہے۔

کالی کے مندر میں ہمارا ایک کام نہ انگ جاتا تو ہم ادھر کبھی نہ آتے۔ کام پورا ہو جاتا ہے ہی کام

کہیں اور سدھار جائیں گے۔ چنڈت پجاریوں کو ہمارے بارے میں بھٹک مل گئی تو آئند

بھون میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ہوگی۔ ہم کس کس کی درشن پیاس بجھائیں گے؟ سن رہا

ہے میری بات.....؟“

”تم چتا مت کرو مہاراج، مجھے بھی اپنا بھگت ہی سمجھو.....“

”بھگت ہی رہنا..... بگلا بھگت بننے کی کوشش نہ کرنا۔“ میں نے اُسے تنبیہی نظروں سے

گھورا۔

”تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی مہاراج.....“ وہ سہم کر بولا۔ میں نے آنکھیں موند

لیں۔ اُس کے قدموں کی آواز ابھر کر دُور ہوتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد انکا کی آواز میرے

کانوں میں گونجی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

”تم نے تو بھنڈاری کی جان ہی نکال دی۔ بگلا بھگت والی بات سن کر اُس کے پیٹے

چھوٹ گئے تھے۔“

”بھنڈاری کو جہنم میں جھونکنا انکارانی.....“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تم جانتی

ہو کہ میں ہر دوار میں تفریح کی غرض سے نہیں آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے دشمن میری گھات

لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے اوپر کوئی جال بھینکیں، میں پیش قدمی کر

کے خون سے ہوئی کھیلنا زیادہ پسند کروں گا۔ منزل پر پہنچ کر سناٹا میرے اصول کے خلاف

ہے۔ اب فیصلے جتنی جلدی ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ مجھے زندگی کی آرزو کبھی نہیں ہوئی۔

موت کی پرواہ بھی نہیں ہوگی۔“

”ایسی باتیں مت کرو جمیل.....“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”میں ہوں نا تمہارے ساتھ.....“

”اب کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ میں نے سچا ہونٹ کاٹتے

ہوئے سرد آدھ بھر کر جواب دیا۔ ”تم نے برسوں پہلے میری زندگی میں جو جج بوا تھا اب اس

کی فصل کاٹنے کا وقت سر پر آ پہنچا ہے۔“

”جمیل.....“ انکا نے احتجاج کرنا چاہا، میں نے اُسے موقع نہیں دیا۔

”میں تم سے کوئی شکوہ، کوئی گلہ، کوئی شکایت نہیں کر رہا۔“ میں نے واضح الفاظ میں بڑی

سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اب ان باتوں کا وقت بھی نہیں ہے۔ سچ منجدھار میں پھنس جانے

کے بعد صرف حسرت بھری نظروں سے ساحل کی طرف دیکھنے سے کام نہیں چلتا۔ مجھے

کنارے کی تلاش بھی نہیں ہے۔ لیکن ڈوبنے سے بدشتر میں ان کو بھی غرق کر دینے کا آرزو

مندر ہوں جو بار بار مجھے الجھا دیتے ہیں۔ کس کی جیت ہوگی؟ کون گھٹنے ٹیک دے گا؟ یہ

سننے والا وقت ہی بتائے گا۔“

”تم کچھ دیر آرام کر لو..... میں حالات کی سن گن لگا کر آتی ہوں۔“ انکا نے اپنائیت کا

انکھار کیا۔

”جانے سے پہلے ایک بات اور سن لو، میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔“ میں نے کہا۔

”پر تم لال کو دیوتاؤں نے آسمانوں پر بلا لیا ہے، یہ خبر تم نے ہی سنائی تھی۔ کلدیپ کا

ساتھ بھی ختم ہو گیا۔ ایک ہمدرد گرد و پر تلپ کی شکل میں سامنے آیا تھا، اُسے دُرا کا عتاب

چاٹ گیا۔ میرا تمہارا ساتھ بڑا پرانا ہے انکارانی۔“ میں نے تو قف سے بات جاری رکھی۔

”ہم ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھتے ہیں۔ ہمیں ایک دوسروں کی قوتوں کا بھی اندازہ ہے

..... ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو، مگر فی الحال میں یہی سمجھ رہا ہوں کہ دُرا کا میرے راستے کی

سب سے بڑا رکاوٹ بن گئی ہے۔ وہ مجھے تنہا کرنا چاہتی ہے، اپنے چھتوں کے مقابلے میں

اُسے میری فتح منظور نہیں ہوگی..... ہونی بھی نہیں چاہئے۔ اس کا اختیار تو رہنا تو شاید

پرستم لای کے بعد وہ تمہیں بھی کوچ کر میرے وجود سے علیحدہ کر دیتی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ مگر میں تجھ کو باہوں کہ شاید.....“

”اس سے آگے اور کچھ کہنا جیس.....“ انکا تڑپ کر بولی۔ ”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔ کل کیا ہونے والا ہے؟ حالات کیا صورت اختیار کریں گے؟ میں جانتی ہوں۔ لیکن زبان نہیں کھول سکتی..... میں نے تم سے پہلے بھی یہی کہا تھا کہ کچھ مجبوریاں لاحق ہیں..... ایک بات اور بھی کہی تھی، اپنے ذہن کو روک کر دیکھو، یاد کرو..... میں نے کہا تھا کہ میں خود سے تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی..... ہاں، تم دھکا دو تو وہ بات ہے۔“

انکا کے لہجے میں خلوص تھا، اعتماد تھا۔ وہ ڈیڑھ بائیس فیصد ڈرگا کے مقابلے پر میرا ساتھ نبھانے کا یقین دلا رہی تھی۔ میرے اختیار میں ہونا تو اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا۔ اُس کے ہونٹ چوم لیتا، دل کے کسی محفوظ گوشے میں ہمیشہ کے لئے چھپا لیتا۔ اُس کی ہلاکتیں لیتا..... میری آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے۔ میں نے الفاظ کو اظہار تشکک کا ذریعہ بنانے کی ٹھانی۔ اُس نے موقع نہیں دیا، پھدک کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں موند لیں.....!

شام کو بھینڈاری نہ جگاتا تو میں سوتا ہی رہتا۔ میں نے سر پر نظر ڈالی، انکارانی وہاں موجود نہیں تھی۔ اُسے گئے بہت وقت گزر چکا تھا۔ ہر دو اراتا بڑا شہر نہیں تھا کہ انکارانی کی واپسی میں اتنی دیر ہوتی۔ اُس کے لئے فاصلوں کی کوئی قید بھی نہیں تھی۔ وہ بجلی کی رفتار سے تیز کام کرنے والی حیرت انگیز قوتوں کی مالک تھی۔ کالی کے مندر میں میری ذہنی پرواز بھی منزل کے نادیہ آہنی چال سے ٹکرا کر واپس آگئی تھی۔ ممکن ہے انکا کو بھی اندر داخل ہونے میں دشواری پیش آرہی ہو۔ مندر میں داخل ہوئے بغیر وہ نول کشور اور چندرا کے بارے میں نہیں جان سکتی تھی۔ ابھی تک اسی تنگ و دو میں لگی ہوگی، ممکن ہے وہ درمیان میں کسی وقت آئی ہو، مجھے خوشخواب دیکھ کر واپس چلی گئی ہو، اُس نے مجھے جگانا مناسب نہ سمجھا ہو۔ مندر میں داخل ہونے کے لئے اُس کے پاس اور بھی کئی طریقے تھے۔ وہ کسی پنڈت یا پجاری کے سر پر پنجے گاڑ کر بیٹھ جاتی، سارے منزل دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ وہ وقتی طور پر کسی پجاری کا ذہن پلٹ کر اُسے اندر کے حال احوال بتانے پر مجبور کر سکتی تھی۔

”تم اٹھ کر اشیان کر لو مہاراج، تجھے ہو گے، میں تمہارے لئے جل پانی کا بندوبست

کرتا ہوں۔“ بھینڈاری اپنی بات مکمل کر کے واپس چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر غسل خانے کا رخ کیا۔ نیم گرم پانی سے غسل کرنے سے ذہن قدرے ہلکا ہو گیا۔ میں تیار ہو کر باہر نکلا تو آئند بھون کی ایک ہوشس اپنے لبوں پر مسکراہٹیں نکھیرے میری منتظر تھی۔ ٹرائی میں پھل، دودھ اور دوسرے لوازمات رکھے نظر آرہے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس خوبصورت اور جوان حسینہ سے دل بہلانے کی باتیں ضرور کرتا۔ لیکن میں نے اُسے صرف ایک نظر بھر کر دیکھا، پھر اشارے سے باہر بھیج دیا۔ اُس کو میرا خشک رویہ پسند نہیں آیا، تیزی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ بھینڈاری نے اُسے میرے کمرے میں بھیجنے سے پیشتر محتاط رہنے کی تاکید ضرور کی ہوگی۔

پیٹ کو ایندھن نہ ملے تو دل و دماغ پر بے کیفی مسلط رہتی ہے۔ میت میں شرکت کرنے والوں کے لئے بھی کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ عجیب رسم و رواج ہیں اس دنیا کے۔ ایک باپ اپنے جوان بیٹے کے غم میں ٹڈال ہوتا ہے، اُس کے بڑھاپے کا سہارا چھن جاتا ہے، کمر ٹوٹ جاتی ہے، عزیز و اقارب، دوست احباب میت کے نہلانے دھلانے اور دفنانے تک اُس کی نمکساری میں لگے رہتے ہیں۔ اُس ٹڈال شخص کو خود اپنا ہوش نہیں ہوتا، کل کی نمکساری ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی لازم ہے کہ نمکساری کے لئے آنے والوں کی خاطر مدارات کرے، کھانے پینے کا اہتمام کرے۔ نہ کرے تو لوگ باتیں بنانی شروع کر دیتے ہیں۔ ساری رواداری بھول کر تنقید کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ میرے تو ایک دو نہیں، کئی اپنے ایک ایک کر کے چھوچکے تھے۔ میں کسی اور کا نہیں، خود اپنا پیٹ بھر رہا تھا۔ انسان کا جی نہ چاہے تب بھی اُسے کچھ نہ کچھ نرم مار کر پڑتا ہے۔ خوراک انسان کے جسم کے لئے ایک ضرورت ہے، اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ کھانے کو تیل نہ ملے تو وہ بھی چلتے چلتے جام ہو جاتی ہے۔ خوراک بڑی ظالم شے ہے۔ پیٹ کے لئے خوراک ضروری ہے اور خوراک حاصل کرنے کی خاطر پیسے درکار ہوتے ہیں۔ انسان کے پاس خوراک خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوں تو وہ چوری کرنے، ڈاکہ مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ نہ کھا پڑے تو خود کشی کر لیتا ہے۔ جانوروں میں بھی خوراک ہی کا مسئلہ درندگی تک طول پکڑ لیتا ہے۔ ایک دوسرے کو پھاڑ کھاتے ہیں، انسان اور جانوروں میں صرف خوراک ہی ایک قدر مشترک ہے جو دونوں کو جرم اور درندگی پر اکساتی ہے۔ یہی خوراک انہیں آپس میں بھی ایک دوسرے کا دشمن بنا

دیتی ہے۔ سلسلہ یوں ہی جڑ پکڑتا ہے۔ پھر بات بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پیٹ بھرنے سے پہلے انسان کو صرف جسم کی غذا کی ضرورت ملتی ہے۔ پیٹ بھر جائے تو ہری ہری سوچھے لگتی ہے۔ دانہ خندم کی خواہش انسان کو درہنگی کر دیتی ہے۔ ہماری انسانیت کی طویل تاریخ کی ابتداء بھی دانہ خندم کی سے ہوئی تھی، پھر فسانے میں جوڑ لگتے گئے۔

میں بھی پیٹ میں ایندھن بھر رہا تھا۔ میرے ذہن میں انکارانی کی غیر موجودگی کا احساس کروٹیں بدل رہا تھا۔ میں جس منہ پر ہنسی چکا تھا وہاں قدم قدم پر خطرات موجود تھے۔ ایک ذرا سی لغزش سارا کھیل چوہن لے کر کسب بن سکتی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ ہوش کچھ دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک دے کر اندر آئی۔ کمرہ اس کے حسن کی چمک دمک سے روشن ہو گیا۔ اس کے جسم کی خوشبو نے پورے ماحول کو معطر کر دیا۔ میں نے پھر اُسے نظر انداز کر دیا۔ وہ خاموشی سے ٹرائی گھسیتی، لہرائی، منہ نکالی واپس لوٹ گئی۔ میں نے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ انکا کے بارے میں میری تشریف بازی جاری تھی۔ وہ میرے سر پر واپس آگئی تو میں نے عالم تصور میں اُسے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات غمازی کر رہے تھے کہ اُس کے پاس میرے لئے اچھی بری کئی خبریں سنائیں۔ موجود تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں متضاد کیفیتیں نظر آرہی تھیں۔

”جو کچھ جمع کر کے لائی ہو میرے سامنے ڈھیر کر دو۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جو چیزیں میرے کام کی ہوں گی، میں ایک طرف کر لوں گا۔ باقی کو نظر انداز کر دوں گا۔ اختصار سے کام نہ لینا۔ میں تفصیل سننا پسند کروں گا۔“

”جیل.....“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کالی کے مندر کے چاروں طرف بڑا مضبوط منڈل کھینچا گیا ہے۔“

”کیا تم نے اندر جانے کی کوشش کی تھی.....؟“ مجھے اُس کی مجبوری کا خیال آ گیا۔ ”نہیں..... تمہیں معلوم ہے، میں کالی کے مندر میں نہیں جاسکتی۔ لیکن میری نظروں نے جس حصار کو دیکھ لیا ہے اس میں صرف کسی پنڈت یا پجاری کی قوت کو دخل نہیں ہو سکتا، کسی دیوی کی شکتی بھی ضرور شامل ہے۔“

”دُرگا.....“ میرے ذہن میں ایک ہی نام ابھرا۔ ”مندر کے اندر کے حالات معلوم کرنے کی خاطر مجھے ایک نئے پجاری کا انتخاب کرنا

پڑا جو کچھ روز پہلے ہی بتا رہا تھا۔ اُس کا ذہن کچا تھا اس لئے آسانی سے میرا معمول بن گیا۔ مندر سے واپسی میں اُسے دیر لگی۔ میں سمجھی شاید میرے بچوں کا اثر اُسے پوری طرح قابو نہیں کر سکا۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی کا ذہن بھی معطل کر کے اُسے اپنے اشاروں پر نچا سکتی ہوں۔ لیکن میری موجودگی اُس کے سر پر ہونا شرط ہے۔ پر تیم لال مہاراج نے میری اس قوت میں بھی کچھ اضافہ کیا تھا۔ اب میرے بچوں کا اثر کسی کے لئے مختصر وقت تک قائم رہ سکتا ہے۔ پجاری کی واپسی میں دیر ہوئی تو میں بھی فکر مند ہو گئی۔ لیکن وہ واپس آ گیا۔“

”کیا بتایا اُس پجاری نے.....؟“ میں نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”تمہارا ایک شکار ہاتھ سے نکل گیا۔“ انکا دلی زبان میں بولی۔

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“ میری دشتوں میں اضافہ ہو گیا۔ ”کون نکل گیا؟“

”چندرا.....“

”کیا.....؟“ میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ ”وہ سنپولا کیسے نکل گیا؟ مجھے بتاؤ انکارانی، اس وقت وہ کہاں ہے؟ یہ دنیا میرے پیروں کے چکر سے زیادہ وسیع نہیں ہے۔ وہ حرامزادہ دیال کے جس کونے میں بھی ہوگا، میں اُسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں اُسے ختم کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ سنا تم نے؟ میں جب تک اُسے جہنم رسید نہ کر لوں، سکون کا ایک لمحہ بھی میرے اوپر حرام ہوگا۔ تم مجھے صرف اُس کا پتہ بتا دو، میں اُسے پاتال سے بھی چٹیا پکڑ کر باہر نکھینٹ لوں گا۔ وہ میری دسترس سے دُور نہیں جاسکتا..... ناممکن ہے۔“ میرے جنون میں اضافہ ہونے لگا۔

”خود کو سنبھالو جیل.....“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہر دو رات آگئے ہو تو پنڈت نول کشور کا قصہ پاک کر لو۔ ایک رہ جائے گا، دوسرا مل جائے گا۔ کہاں تک بھاگے گا؟ کب تک جان بچائے گا.....؟“

”کیا تمہیں علم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے.....؟“ انکا کسمسائے لگی۔ ”مجھے حیرتوں کے پہاڑ معلوم ہوتا تو تم سے کیوں چھپاتی.....؟“ انکا کسمسائے لگی۔ ”مجھے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔“

”تم..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو انکارانی.....؟“ میں نے اُسے بڑے غور سے دیکھا۔ ”تم

جوانوں کو تو توں کی مالک ہو، جس کے سامنے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، جو دلوں کی گہرائیوں میں ہجماک کر انسانی خیالات بھی پڑھنے کی ناقابل یقین صلاحیت رکھتی ہے۔۔۔۔۔ وہ میرے اندیشہ شکن کا پتہ نہیں لگا سکتی۔ کیا۔۔۔ کیا میں تمہاری بات پر اعتماد کر لوں؟ دل نہیں مانتا۔۔۔

”ہاں جمیل۔۔۔ میں غلط نہیں کہتی۔“ اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے یقین دلایا۔ ”یہ پہلا اتفاق ہے جب میری نگاہوں کے سامنے ایک ایسی کھڑی کی جا رہی ہیں۔ لندن سے واپسی کے سفر کے دوران بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تم درمیان میں نہ آ گئے ہوتے تو میں اشوک کی اچانک دیوانگی کا بھید ضرور پالیتی۔ وہ قوت میری نظروں سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس بار۔۔۔ اس بار۔۔۔“

”اس بار کیا ہو گیا۔۔۔؟“ میں نے تلملا کر پوچھا۔ ”اس بار توں کی مجھ ہی آڑے آ رہی ہے۔۔۔؟“

”میں اس کا بھی کھوج لگا لوں گی۔“ انکا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ”ممکن ہے تمہارا اندیشہ درست ہو، دُرگا کی مہمان شکتی میرے راستے میں آ گئی ہو۔۔۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ تو توں کے توازن کو برقرار رکھنے کے معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ مجھے کچھ سمجھنے کا موقع دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ چندرا کا سراغ لگتے ہی تمہیں آگاہ کر دوں گی۔“

”اگر سراغ نہ ملا تو۔۔۔؟“ میں نے اُسے ضاحت طلب نظروں سے گھورا۔ ”پھر دُرگا کی طرح مجھے بھی آسمان پر کئے گئے وعدوں کی خلاف ورزی کرنی پڑے گی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”اپنی انکارانی پر بھروسہ رکھو، میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔“

”پجاری نے تمہیں کالی کے مندر کے اندر کا اور کیا حال بتایا ہے۔۔۔؟“ میں نے اپنی وحشتوں پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

”شیوا نے تمہارا پیغام پنڈت نول کشور تک پہنچا دیا ہے۔“ اُس نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”شیوا کو اس جرم کی سزا بھی مل چکی ہے۔ اُسے مندر کے تہہ خانوں میں ایک کال کٹھڑی میں قید کر دیا گیا ہے۔“

”کیا جرم سرزد ہوا تھا شیوا سے۔۔۔؟“

”زندہ رہنے کا جرم۔۔۔“ انکا نے پہلو بدل کر کہا۔ ”نول کشور تمہارے سلسلے میں اپنی

پر چھائیں دیکھ کر بھی بڑک اٹھتا ہے۔ اُسے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ تم نے شیوا کو محض ایک پیغام پہنچانے کی خاطر زندہ چھوڑ دیا ہو گا۔ وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ شیوا نے زندگی بچانے کی خاطر تم سے کوئی سمجھوتا کر لیا ہے۔۔۔؟“

میرا دل چاہا کہ دیوانہ وار تہمت لگا شروع کر دوں۔ نول کشور کو میرے تصور نے یقیناً پاگل کر دیا تھا۔ اگر وہ پاگل نہ ہوتا تو شیوا پر شہ نہ کہنا۔ اُسے اپنے خاص خاص آدمیوں کی پہچان ہوتی۔ اُس کے لئے ہرے اور کچ کے کٹڑے کا فرق جاننا ضروری تھا۔ وہ اپنے رسم و رواج کے مطابق شیوا کا کوئی امتحان بھی لے سکتا تھا، شیوا اس امتحان میں بھی ضرور پورا اترتا۔ میری نظروں نے اُسے شناخت کر لیا تھا، وہ کمر اسوتا تھا۔ اُس میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ اُس نے میرے مقابلے میں مردوں کی طرز سیدتان کر اپنی شکست تسلیم کی تھی۔ دامن پھیلا کر زندگی کی بھیک نہیں مانگتی تھی۔ اُس نے فحش لہجے میں کہا تھا۔ ”میں اب بھی سیدتانے مردوں کی طرح قدم جمائے کھڑا ہوں۔ مجھے مار دو۔ میں تم سے جیون کی بھیک نہیں مانگوں گا۔“ انسان جب اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے تو اُس کی خود اعتمادی برقرار نہیں رہتی۔ اپنے بازوؤں کا اعتماد ختم ہو جائے تو وہ بزدل بن جاتا ہے۔ کسی پناہ گاہ میں پناہ پزیر ہو کر بڑی بڑی باتوں کا اعلان کرتا، ڈینگیں مارنا اور بات ہے۔ طاقت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب دور ترقی میدان میں اترتے ہیں۔

میں بددیانتی کا انجام بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ بیلا زین، بڑا ڈور اندیش، بڑا شاطر اور بڑی کمینہ خصلتوں کا مالک تھا۔ جب تک میں کمزور رہا وہ بار بار میرے تعاقب میں لپکتا رہا۔ مجھے آنکھیں دکھانے پر انکارانی کو چپ کے ذریعے حاصل کرنے کے بعد تربیتی جیسا کتا بھی شیر بن گیا تھا۔ اُس کا اہم کام میری خواہش کے عین مطابق ہوا۔ بددیانتی نرا سن وقت کی رفتار، ہواؤں کا رخ اور طاقت کا توازن کے کھلے عادی تھا۔ میں نے جب قوتیں حاصل کر لیں، جب تند اور کپالا کی تعلیم نے مجھے زندگی اور موت، انسانیت اور درندگی کے فتنے سے آگاہ کیا، جب انکارانی بھی میری قوتوں سے آنکھ مٹانے سے کترانے لگی تب بددیانتی جیسے پنڈت نے بھی عورتوں کی طرح میرے ساتھ آنکھ پھونک کر چھوٹی کر دی۔ امر لال بھی اُس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا۔۔۔؟ جیت احمد اور یقین کی ہوئی۔ میری کلدیپ تو اس وقت میسوری پہاڑیوں سے نیچے آئی تھی جب امر لال نے

کیسے کی شہوت پیش کیا تھا۔ وہ درمیان میں نہ آتا تو سید کی لاشی ہی بدری نرائن کے لئے بہت ہوتی۔

”کیا سوچا ہے جو جیل.....؟“ انکا نے پوچھا۔

”تمہارے مشورے پر غور کیا ہا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ہر دو ارتکب آیا ہوں تو پنڈت نول کشوری اتنی کبھی شمشان گھاٹ تک پہنچاؤں، اس کے بعد چندرا کی باری ہوگی۔“

”ہر دو ارتکب تمہارے آنے کی اطلاع پانچ کالی کے مندر میں بڑے بڑے گیانی دھبانی پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ سب کا خیال ہے کہ مندر کو ان کے گندے خون سے ناپاک نہ کیا جائے، باہر نکل کر گھیرا جائے۔ لیکن وہ پنڈت نول کشور کا کہا بھی نہیں ٹال سکتے۔“

”وہ کیا کہہ رہا ہے.....؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”وہ ابھی تک کالی کے نام پر دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔“ انکا نے حلاء میں چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ہر وقت پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا۔ نول کشور کی چندال چوڑی میں بیچ ذات کا ایک چمار بھی شامل ہے۔ میں نے جس پجاری کو معمول بنایا تھا اس نے بتایا ہے کہ وہ چمار سغلی کا ماہر ہے۔ اس نے پنڈت پجاریوں کے بیچ بیٹھ کر دعویٰ کیا ہے کہ وہ تمہیں دُور رہ کر بھی اپنے گندے عمل سے ہلاک کر سکتا ہے۔“

میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ انکارانی کی بات سن کر میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ذہن میں آتش فشاں کروٹیں بدلنے لگا، مجھے اپنی کہانی یاد آرہی تھی۔ میرا پورا ماضی میری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگا۔ مجھے وہ بھیا تک اور خوفناک منزلیں یاد آئیں جن سے گزر کر میں اس مقام تک پہنچا تھا۔ ان ہولناک کہانیوں کو یاد کر کے مجھے جھرجھری آ گئی۔ میرے نام لیوا، میرے قارئین گواہ ہیں کہ میں نے کبھی حالات کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے، کسی سورا سے خوفزدہ ہو کر زندگی کی بھیک نہیں مانگی۔ میں پارسائی کے دعوے نہیں کر سکتا، میری زندگی کا ورق ورق گناہ آلود ہے۔ کیوں ہوا؟..... کیسے ہوا؟..... میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا۔ ہر شخص اپنے جذبات، اپنے احساسات کا خود گواہ ہوتا ہے۔ میں بڑی دیانت داری سے اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ میں صرف نام کے اعتبار سے مسلمان ہوں، مذہب سے میرا دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ مگر..... ایک بات یہ بھی درست ہے کہ

میں نے خدا کے وجود سے کبھی انکار نہیں کیا۔ کسی اور کو اُن کے برابر نہیں سمجھا۔ یہ خیال بھی میرے دل و دماغ کے کسی نہ کسی گوشے میں ہمیشہ محفوظ رہا کہ مرنے کے بعد مجھے اُسی کے سامنے پیش ہونا پڑے گا جس نے مجھے زندگی کی نعمتوں سے مالا مال کیا تھا۔ میرا نامہ اعمال میرے ہاتھ میں ہوگا۔ میں اس ”لم یزل“ کے سامنے سر ہٹائے کھڑا ہوں گا۔ وہاں میری لن ترانیاں کسی کام نہیں آئیں گی۔ انکارانی بھی میرا ساتھ چھوڑ دے گی۔ وہ فیصلہ سنا دے گا۔ بندے کی ترکی تمام ہو جائے گی۔ زبان ہلانے، دُسمارنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اُس دن شیطان مردود اپنی کامیابی کا جشن منائے گا، انسان بے بسی سے کھڑا تماشہ دیکھتا رہے گا..... وقت گزر چکا ہوگا، پیچھے تلوے کسی کام نہیں آئیں گے۔!

مجھے بھی شیطانوں نے بھنک دیا تھا۔ میں نے اُن کا قہقہہ ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔

”کہاں کا ارادہ ہے جیل.....؟“ انکا نے مجھے اُلٹا دیکھ کر پوچھا۔ اُس کی نظریں میرے چہرے کے تاثرات پر مرکوز تھیں۔

”کالی کے مندر کی کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔“ میں نے زہر خند سے جواب دیا۔ ”آئندہ یوں میں سستانے اور رنگ رلیاں منانے کے اور بھی مواقع آئیں گے۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔ لیکن تم مندر میں داخل نہیں ہو سکو گے۔“

”میں پہلے بیٹھ کر بھی کیا کروں گا.....؟“ میں کسرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ سید کی لاشی میرے ساتھ تھی۔ انکا نے میرے سر پر ٹھلنا شروع کر دیا۔ اُس کے چہرے پر تشویش کے تاثرات ابھرنے لگے۔ میں عقبی راستے سے گزر کر باہر آیا تو بھنڈاری بھاگتا ہوا سامنے آ گیا۔ کسی نے اُسے میرے باج ٹھٹھکی کی اطلاع کر دی تھی۔

”کہاں جانا ہے مہاراج.....؟“ اُس نے ہاتھ باندھ کر پوچھا۔

”کسی سواری کا بندوبست کر دے.....“ میں نے سرد لہجے میں حکم دیا۔ ”کالی کے درشن کو جا رہا ہوں۔ ذرا عیور سے کہنا کہ جہاں میں کہوں وہاں جا کر واپس آ جائے۔ میں بحث نہیں پسند کرتا۔“

”تم جو کہو گے وہی کرے گا۔ لیکن واپسی میں.....“

”پھر تو نے لیکن ویکین شروع کر دی.....“ میری پیشانی پر سلوٹیں ابھرنی لگیں تو بھنڈاری کی زبان کو بریک لگ گیا۔ اُس کے حکم پر گاڑی آگئی۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا، گاڑی

پارے میں بزرگوں سے اتنا ضرور سنا ہے وہ جس کے نام پر اڑائی جاتی ہیں اُسے پانی میں ڈوبا بھی نہیں چھوڑتیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ خطرناک عمل ناکام ہو جائے تو پھر اسے کرنے والا ہانڈی کا شکار ہو جاتا ہے۔

میں نے سید کی لاٹھی پر اپنی گرفت مضبوط کر رکھی تھی۔ ہانڈی مجھ سے بیس فٹ کے فاصلے پر رک گئی تو انکا نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ پھر اُس کی زبان سے ناقابل فہم زبان میں کچھ جملے ادا ہوتے گئے۔ میں نے پہلی بار انکارانی کو ایک انوکھی زبان بولنے سنا تھا۔ اُس کی آنکھیں کوری ہانڈی پر جمی ہوئی تھیں، چہرے سے غصہ و غضب کا اظہار ہو رہا تھا۔ جس انداز میں وہ بول رہی تھی اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا وہ کسی نادیدہ قوت کو بے نقط سنار ہی ہو۔ ہانڈی فضا میں معلق گردش کرتی رہی۔ انکارانی کی زبان سے شعلے لپکتے رہے۔ وہ خاموش ہوئی تو کسی نے ناک میں مننا نا شروع کر دیا۔

”تو درمیان میں کہاں سے آگئی؟ میرا تیرا کوئی جگہ نہیں ہے۔ تو درمیان سے ہٹ جا، میں نے جس دھڑکے پلید نام پر ہانڈی چھوڑی ہے اس کا کریا کرم ہو کر رہے گا۔ کالی اور دُرُک کی بھی یہی اچھا ہے۔ میری بات مان لے۔۔۔۔۔ درمیان میں آئے گی تو، تو بھی نہٹ ہو جائے گی۔“

انکارانی کی نگاہوں سے نفرت کی چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اُس نے پھر اپنی زبان بولی شروع کر دی۔ اب دلچسپ سے اُس کے غصے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ نہیں گرائے، ہانڈی بھی ایک ہی جگہ پر پکڑی ہوئی رہی۔

”ایسا کبھی نہیں ہو سکا۔۔۔۔۔ اپنی ہٹ سے باز آ جا، میرا کہا مان لے۔ سے بیت رہا ہے۔ میں تجھے ایک آخری موقع اور دے رہا ہوں، اس کے بعد میں ڈوری چھوڑ دوں گا۔ آگے نہ جان۔“

جب میں پھر انکارانی کے منہ سے شعلوں کی دھواں دھار آتش بازی چھوٹنے لگی۔ دوسری جانب سے آخری وارننگ دی گئی، انکا دونوں ہاتھ بلند کر کے جی کھڑی رہی۔ اُس کی پلوں کی جنبش ختم ہو گئی، وہ ٹھٹکی باندھے ہانڈی کو پکڑا تا دیکھتی رہی۔ موت اور زندگی کا صبر آزمائیں بڑا اعصاب شکن تھا۔

اچانک ہانڈی کو ایک جھٹکا لگا، وہ برق رفتاری سے پیچے آئی۔ انکارانی شاید ہی بات کی

جس پہلی۔۔۔۔۔ انکا نے دہی زبان میں کہا۔ ”اپنے گرد و حصار کھینچ لو، دائرے سے باہر نکلنے کی غلطی نہ کر۔ یہ خیال ہے وہ تمہیں مندر تک پہنچنے سے پہلے کہیں راستے میں گھیرنے کی کوشش ضرور کریں گی۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انکا کا اندازہ بھی غلط ثابت نہیں ہوا۔ ڈرائیور بڑی مستعدی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ لیکن ایک میدان سے گزرتے وقت اُس نے اچانک فٹ بریک لگا کر گاڑی روک دی۔ پھر دروازہ کھول کر ہانڈی کے انداز میں چنٹا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ انکا کی نظروں میں شعلے بھڑکنے لگے۔

”وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔۔۔۔۔“ اُس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”ہمارے تمہارے اوپر سفلی کی ہانڈی چھوڑی ہے۔ تم دیکھنا میں اُس کا کیا حشر کرتی ہوں۔“

میں لپک کر گاڑی سے باہر آیا۔ فضا میں ایک کوری ہانڈی تیری ہوئی میری طرف آرہی تھی۔۔۔۔۔ ہانڈی کو بند کرنے کے لئے سرخ رنگ کا کورا کپڑا استعمال کیا گیا تھا۔ میدان کے آس پاس جو دس بارہ مقامی لوگ موجود تھے وہ بھی ہانڈی کو دیکھ کر ”رام دہائی“ شروع کر دی۔

”رام نام ستیہ ہے“ کانفرہ لگاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان کی دوسری طرف کالی کا فلک بوس مندر سر اٹھائے کھڑا تھا۔

”چهار ذات نے ہماری ایک اور مشکل آسان کر دی۔“ انکا نے بڑے یقین سے کہا۔

”تم دیکھنا اب میں کس طرح پنڈت نول کشور کے منڈل کا سواستیاناس کرتی ہوں۔۔۔۔۔“

میری نظریں کوری ہانڈی پر جمی ہوئی تھیں جو فضا میں تیزی سے گردش کرتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔ مجھے بھگوان پر شاد یاد آ گیا، اُس نے بھی مجھے اُس وقت ایسی ہی کوری ہانڈی دی تھی جب تربیتی ایک منڈل میں بیٹھا انکارانی کو اپنے قبضے میں کرنے کی خاطر جاپ کر رہا تھا۔ میں نے ہانڈی تربیتی کی طرف اچھال دی تھی لیکن اُس کا انجام میری توقع کے برعکس ہوا۔ تربیتی بچ گیا۔ بھگوان پر شاد خود اپنے جال میں پھنس کر مارا گیا۔ اُس کی موت بڑی اذیت ناک ثابت ہوئی تھی۔

میں خوفزدہ نہیں ہوا۔ میری نگاہیں اُس ہانڈی کو دیکھ رہی تھیں جو تیر کی طرح میری طرف آرہی تھی۔ مجھے سفلی کے سلسلے میں کچھ نہیں معلوم، لیکن ان ناپاک طلسمی ہانڈیوں کے

نہیں تھی۔ اُس نے زور سے پھونک باری، فضا میں گھن گرج کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا، پھر ہانڈی نے دوبارہ فضا میں بلند ہونا شروع کیا۔ انکارانی کے گلابی ہونٹوں پر فانی تھام کر گراہٹ کھینے لگی۔

کسی کے چہنچہ کی آواز سن کر میری توجہ کالی کے مندر کی جانب مبذول ہوئی۔ ایک لمبا ترنگا کالا بھنگ پجاری نما شخص مصرتی باندھے بھاگتا ہوا مندر کے دروازے سے باہر نکلا۔ اُس کا اوپری جسم ننگا تھا، چہرے سے وحشت چمک رہی تھی۔

”جھیل.....“ انکارانی نے تیزی سے میرے کاندھے پر آکر کان میں سرگوشی کی۔ ”پنڈت نول کشور نے جو منڈل کھینچا تھا اس کے ٹوکے کا وقت آگیا ہے۔ مندر کے اوپر بجلیاں چمکیں، شعلے لپکیں تو سمجھ لینا کہ تمہارا راستہ صاف ہو گیا۔ تم بلا دھڑک اندر چلے جانا۔ اپنے ہوش برقرار رکھنا۔ میں باہر رہ کر بھی تم سے دُور نہیں رہوں گا۔“

مندر سے برآمد ہونے والا شخص پاگلوں کی طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا، لیکن کوری ہانڈی بجلی بن کر اُس کے وجود سے گمراہی۔ پجاری جو یقیناً ہمارا مطلوبہ سٹپل کے والا پجاری تھا، بلبلہ کر زمین چاٹنے لگا۔ اُس کے جسم سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ وہ زندگی پچھلے کی خاطر دوبارہ اُٹھ کر گرتا پڑتا مندر کی طرف بھاگا۔ اُس کے جسم کے شعلے منڈل سے ٹکرائے تو بجلیاں کوندنے لگیں..... بادل کے گرجنے کی خوفناک آوازیں ابھرنے لگیں..... مندر کے چاروں طرف چمکاریاں اُڑتی نظر آرہی تھیں۔ انکا خوشی سے چلائی۔

”جلدی کرو جھیل، نول کشور کا منڈل ٹوٹ کر بکھر چکا ہے..... اپنا خیال رکھنا۔“

میں نے سید کی لائٹی پر گرفت مضبوط کی اور برق رفتاری سے مندر کے بڑے پھانک کی سمت دوڑنے لگا جہاں پنڈت پجاریوں کا ہجوم ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا.....!!

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 555532
PROP: ALI KHAN

KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 555532
PROP: ALI KHAN

مندر کے اطراف جو منڈل پنڈت نول کشور نے قائم کیا تھا، انکارانی نے اس کا ستیاناس کر دیا۔ ایک غلطی بھی انسان کے حق میں بڑی تبدیلیاں ڈالنا کر دیتی ہے۔ سٹپل جاننے والے پجاری باتوں نے وقتی طور پر میرے دشمنوں کو ضرور خوش کیا ہوگا، وہ میری موت کا جشن منانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے، پجاریوں نے بناؤ سنگھار شروع کر دیا ہو گا۔ آنے والے لمحات اُن کے دلوں کو گرما رہے ہوں گے۔ لیکن میری انکارانی نے بازی پلٹ دی۔

نول کشور اور اُس کے ساتھیوں کے دل اس وقت دھڑکنے شروع ہو چکے ہوں گے جب خوفناک ہانڈی کو فضا میں چھوڑا گیا ہوگا، سب کی نظریں اُسی ہانڈی پر جمی ہوں گی، اُن کے چہرے ہمتار رہے ہوں گے۔ وہ ایک کے مقابلے میں سینکڑوں تھے لیکن منڈل میں چھپے بیٹھے تھے۔ سمجھنے آنے کی جرأت کسی میں نہیں تھی۔ نول کشور بھی لمبی چوڑی ڈینگیں مار رہا ہوگا۔ دوسرے ہاں میں ہاں ملانے میں پیش پیش ہوں گے۔ ایک پجاری کے آجانے سے اُن کے حوصلے اور بلند ہوئے ہوں گے۔ چھوت چھات اور اُونچ نیچ کا فرق بھول کر انہوں نے بھٹکی کو بھی اپنا نجات دہندہ سمجھ لیا۔ عام حالات میں پنڈت پجاری کسی مسلمان کے چھوئے برتن میں پانی بھی پینا گوارا نہیں کرتے، کوئی غیر اُن کو ہاتھ لگا دے تو ان کا دھرم بھرٹ ہو جاتا ہے۔ خود اپنے رسوئی گھر میں گھس دوں گے اس کا داخل ہوتے ہیں۔ ہر تہوار پر چھوئے بڑے کا دھیان رکھا جاتا ہے۔ دھرم کے معاملے میں ان کے عقیدے، ان کے نظریات بڑے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن ایک میری ذات نے ان کو اس قدر ہراساں اور خوفزدہ کر دیا تھا کہ انہوں نے کالی کے پوتر مندر میں ایک نیچ ذات پجاری کا داخلہ منظور کر لیا تھا۔ نول کشور مندر کا بڑا پروہت ہونے کے باوجود اُس کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھا، دوسرے پنڈت پجاری بھی اُس کے ہمنوا بن گئے۔ کسی کا دھرم بھرٹ نہیں ہوا۔ ساری اُونچ نیچ ختم ہو گئی۔

میرے خوف نے سب کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔

دو طرف میری موت کے خواہشمند تھے۔ جب چار ذات نے سفلی کے جنتر منتر پڑھ کر بانڈی نضا میں چھوڑ دی ہوئی تو سب ہی کی نظریں اُس پر جم گئی ہوں گی۔ وہ مندر میں کہیں نہ کہیں میری ہولناک موت کا منظر دیکھنے کی خاطر دیکے بیٹھے ہوں گے، وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دل کی دھڑکنیں بھی بتا رہی تھیں تیز ہو گئی ہوں گی۔ لیکن پھر نتیجہ کیا نکلا.....؟

جیو دھاری بانڈی کی واپسی کا منظر دیکھ کر سب کے منہ لٹک گئے ہوں گے، آنکھیں پٹپٹانے لگی ہوں گی، بکھجوں پر سانپ لوٹ گئے ہوں گے۔ سب کی سوالیہ نظریں سفلی کرنے والے پر اٹھی ہوں گی، اُس کی دھوٹی ڈھیلی ہوئی ہوگی سب کے دلوں میں چھوت چھات اور اُونچ نیچ کا خیال پھر ابھرا ہوگا۔ پنڈت نول کشور نے خبروں لیا ہوگا کہ بانڈی کا پلٹنا نیک شگون نہیں ہے، اُس کی تیوری پر بل آ گئے ہوں گے۔ اُس نے کچھ بڑے حکمانہ انداز میں کہا ہوگا۔

”اس نیچ ذات کے چمار کے منہ پر کاک تھوپ دو، اس کی چھیا کاٹ ڈالو جو بے جا کر باہر نکال دو۔“

انکارانی اسی بات کی منتظر تھی۔ چمار باہر نکلا، اُس کا پلید عمل اُسی پر لوٹ گیا۔ وہ جان بچانے کی خاطر دوبارہ مندر میں جانے لگا تو منڈل سے نکل گیا، انکارانی پلک جھپکتے میں اپنا کام کر گزری۔

ہر طرف چنگاریاں اُڑ رہی تھیں، پنڈت پجاریوں نے خوف کے مارے اُونچی آواز میں اشلوک پڑھنا شروع کر دیا، کالی کو خوش کرنے کی خاطر دیو داسیاں بھجن گانے لگیں، سب کے چہرے ست گئے، سب کو اپنی اپنی پڑی تھی، کسی نے میری طرف دھیان نہیں دیا۔ میں اُن کی بھیڑ میں شامل ہو کر آہستہ آہستہ جگہ بنانا اندر داخل ہو گیا۔ سید کی لائٹی کو میں نے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ چھوٹے بڑے مندروں کو کس انداز میں تعمیر کیا جاتا ہے؟ اس کا تھوڑا بہت تجربہ میں پہلے بھی کر چکا تھا۔ میرے جسم پر سادہ لباس تھا، پنڈت پجاری بدحواس نہ ہوتے تو پہلی ہی نظر میں ضرور چو سکتے۔ میں نے غلٹ سے کام لیا، مندر کے وسیع و عریض چبوترے کے اطراف مہندی کی باڑھ لگی تھی۔ میں اُس کی آڑ لیتا ہوا برق رفتاری سے عقبی حصے کی طرف نکل گیا جہاں یاتریوں کے ٹھہرنے کے لئے کمرے تعمیر تھے۔ ہر طرف بابا کار

چچی تھی۔ سب کے چہرے فنی تھے، مجھے مسخ مل گیا۔ میں قدم بڑھاتا ایک کمرے میں داخل ہو گیا، سامنے پلک پر ایک بڑھا پڑا تھا۔

”کیا ہوا لرام؟“ بوڑھے نے مجھے اپنا ساتھی سمجھ کر پوچھا۔ ”باہر کیسا شور ہو رہا ہے؟“

”بڑے پروہت جی کی موسیٰ کا انتقال ہو گیا۔ سب سینہ کوٹا کر رہے ہیں۔“ میں نے

نفرت سے کہا، پھر پلک کمراس کی گردن دبوچ لی۔ وہ عمر کے ال حصے میں تھا جہاں انسان

اٹھ کر پانی بھی نہیں پی سکتا۔ مجھے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی، چار جھکوں میں ہی اُس

کی آنکھیں اُٹل کر باہر آ گئیں۔ میں نے پلٹ کر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا لی، ایک

طرف شین کے صندوق پر میری لباس موجود تھے۔ میں نے زرورگ کی ایک دھوٹی نکال کر

باندھ لی۔ کھوٹی پر لٹکی ہوئی دو چار مالائیں بھی گھلے میں ڈال لیں۔ مرنے والے کے ہاتھ کا

کڑا اتار کر سیدھے ہاتھ میں پھن لیا، ماتھے پر چندن تھوپ تھاپ کر دروازے کے قریب آ

گیا۔ سید کی لائٹی بدستور میرے ساتھ تھی۔ میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ حلیہ

تبدیل کر لینے کے بعد وہ مجھے آسانی سے شناخت نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ دیر دروازے سے

لگا کھڑا میں باہر کی سن گن لپتا رہا، پھر کنڈی کھول کر باہر آ گیا۔ میں نے صدر دروازے کی

طرف جانے کی غلطی نہیں کی، عقبی حصے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ پنڈت پجاریوں کی

نولیاں کھجے موجود تھیں، سب اسی ہنگامے کی بات کر رہے تھے جو انکارانی نے پکا کیا

تھا۔ دو چار بڑے پنڈتوں کے ہاتھ میں مجھے انھیاں اور ڈنڈے بھی نظر آئے۔ مجھے

اطمینان ہو گیا۔ میں نے سید کی لائٹی اس طرح تھام لی جیسے اسے سہارے کے طور پر

استعمال کرنے کا عادی ہوں۔

مندر میں موجود کئی لوگوں نے مجھے اسی طور پر دیکھا لیکن کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں

پوری طرح محتاط تھا، کالی کے اس مندر میں جگہ جگہ گئی تختیوں نے میرے لئے بڑی آسانی

پیدا کر دی تھی۔ وہ یاتریوں کی رہنمائی کے لئے لگائی گئی تھیں، اس وقت میرے کام آ

رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے تک میں ادھر ادھر کوئی مناسب جگہ تلاش کرتا رہا، پھر مجھے اپنی غلطی کا

احساس ہوا۔ ہنگامے کی شدت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ پنڈت پجاری صدر دروازے

سے ہٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔ پنڈت نول کشور کی طرف

لے بار بار چاروں طرف بلندی پر لگے لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے اعلان کیا جا رہا تھا کہ
مہاراجہ کو کچھ دیر کے لئے بند کیا جا رہا ہے۔ سب سے درخواست کی جا رہی تھی کہ وہ
اپنے اپنے کھانوں پر بیٹھ جائیں۔ میں اس اعلان کا مطلب سمجھ گیا۔ دھماکوڑی کے وقت
سب ہی کا ذہن مغلط ہو گیا تھا، اب دشمنوں کی نظریں مجھے تلاش کر رہی ہوں گی۔ انہیں یہ
گمان بھی ضرور ہوا ہو گا کہ میں موقع پا کر ان کے درمیان نہ پہنچ گیا ہوں۔ اپنی تسلی کی خاطر
وہ ایک ایک کونے کھدے میں میری تلاش کریں گے۔ میں ہاتھ آ گیا تو میری تھکے ہوئی
کمرے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مجھے اپنے لئے چھپنے کی خاطر کسی مناسب جگہ کی فوری
ضرورت تھی۔ میں دوبارہ یا تریوں کی رہائش گاہ کی طرف لوٹ رہا تھا جب ایک
خوبصورت پجاریں میرے سامنے آ گئی۔ وہ کمن کمن چلی تھی۔ لیکن اُس کے چہرے سے
پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جس انداز میں اُس نے سامنے آ کر چلنا میرا راستہ روکا تھا
اس سے یہی گمان ہوا کہ وہ میرے اوپر کسی اور کا دھوکہ کھا رہی تھی۔ میرے چہرے کے
خدوخال اُس کے کسی واقف کار سے ملتے ہوں گے۔

”مہاراج.....“ اُس نے ہاتھ باندھ کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بڑی سچائی
تمہاری، ایک نظر میری ماں کو دیکھ لو۔“

”کیا ہوا اُسے.....؟“ میں نے آواز بنا کر پوچھا۔

”کل رات سے اُس کے منہ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا۔ شریہ بھی تپ رہا ہے۔ گرد و
ہوتے تو وہ دیکھ لیتے.....“ وہ بڑی سوگوار نظر آرہی تھی۔

”گرد و.....؟“

”وہ کچھ دنوں پہلے دیوی درشن کو آئے تھے، دو دن ہوئے واپس چلے گئے۔“ اُس نے
مختصر بتایا۔ ”اُن کے ہاتھ میں چادو تھا مہاراج..... ماں ایک دم بجلی چٹکی ہو گئی تھی، جیسے کبھی
روگ نہ رہا ہو۔“

”تم یہاں کیا کرتی ہو.....؟“ میں نے دہی زبان میں اُسے ٹولا۔

”جب ماں ٹھیک ہوتی ہے تو وہ بڑے پروہت کی سیوا کرتی ہے۔ آج کل یہ کام مجھے
کرتا پڑ رہا ہے۔“

”تمہارا مطلب پنڈت نول کشور مہاراج سے ہے؟“ میں نے دل پر جبر کر کے اپنے

دشمن کے لئے مہاراج کا لفظ استعمال کیا۔

”ہاں مہاراج.....“

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شاید قسمت مہربان تھی جو میرا اُس کا گراؤ ہو گیا۔
میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا، سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ ”کیا پروہت مہاراج
تمہاری ماما کا علاج نہیں کرتے؟“

”اُن کے پاس اتنا سے کہاں ہے؟“ اُس کے جواب میں احساس محرومی بھی شامل تھا۔
”میں کیا کر سکوں گا؟“ میں نے کہا۔ ”میں بھی آج صبح ہی دیوی درشن کے کارن بہت
دور سے چل کر آیا ہوں۔“

”اور کچھ نہیں تو بیمار کے شریہ پر ہاتھ رکھ کر بھگوان سے پرارتنا ہی کر دینا۔“ اُس کی نیل
کنول جیسی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”میرے من کو چین آ جائے گا۔“

میرے پاس وقت کم تھا، میں نے اُس کی بات مان لی، اُس کے ساتھ ہولیا۔ مجھے زیادہ
دور نہیں چلنا پڑا۔ دو چار موڑ کاٹ کر وہ حصہ آ گیا جہاں دس بارہ ٹنما چھوٹے چھوٹے
کارڈ بڑی خوبصورتی سے تعمیر کئے گئے تھے۔ شاید وہ نول کشور کے مخصوص ملازموں کے
کے وقف تھے۔ ادھر سناٹا ہی تھا۔ وہ مجھے ایک کوارٹر میں لے گئی جو چھوٹے چھوٹے دو
کمروں پر مشتمل تھا۔ چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ پجاریں نے مجھے اپنا نام جھرتا بتایا تھا۔ ایک
کمرے میں اُس کی بیار ماں فرش پر پڑی تھی۔ اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ بخار کی شدت اور
نفاہت نے نڈھال کر رکھا تھا۔ میں نے چٹائی پر بیٹھ کر اُس کی کٹائی پر ہاتھ رکھا۔ جھرتا نے
غلط نہیں کہا تھا، عورت کا جسم صحت کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ شدید بخار میں مبتلا تھی۔

”جیل.....“ میرے کانوں میں انکارانی مانوس آواز اُبھری۔ ”تم قسمت کے دہنی ہو جو
جسمیں سر چھپانے کا ٹھکانا مل گیا۔ جھرتا کے مکان پر اسی کو تمہاری موجودگی کا گمان بھی نہیں
ہو سکتا۔ اس کی ماں جب بارہ سال کی تھی تب سے نول کشور کی سیوا کر رہی ہے۔ جھرتا بھی
نول کشور کی شرافت کا کڑوا پھل ہے، تم اسے اعتماد میں لے کر دشمن کرو، یہ تمہارے لئے
بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔“

مجھے انکارانی کی آواز سن کر تعجب ہوا۔ وہ کسی طور بھی کالی یا ڈرگا کے مندروں میں داخل
نہیں ہو سکتی تھی، کسی مندر میں اُس کی آواز بھی پہلی بار میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ شاید

اس میں بھی پریم لال کی دان کی ہوئی تو توں کا دخل شامل رہا ہو۔ مندر میں داخل ہوتے وقتے انکا نے کہا بھی تھا کہ وہ باہر رہ کر بھی مجھ سے دُور نہیں رہے گی۔ اُس نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں اُس کی آواز واضح طور پر سن رہا تھا۔

”کیا تم سب کچھ دیکھ رہی ہو.....؟“ میں نے عالم تصور میں انکا کو مخاطب کیا۔

”ہاں۔ تم جہاں جہاں جاؤ گے، تمہارے آس پاس کا کچھ حصہ مجھے نظر آتا رہے گا۔ میں تمہیں صرف مشورے دے سکوں گی، میری قوت مندر کے اندر تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گی.....“ انکا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ غور کرو تمہارے سامنے پڑی ہے اس کا نام جتنا ہے۔ کبھی اس کی بھرپور جوانی کو دیکھ کر بڑے بڑے کچنوں کی رال مٹنے لگتی تھی، اب بھی اس کے ماضی کا حسن اس کے چہرے کے خطوط سے جھلک رہا ہے۔ میں زیادہ دیر تم سے مخاطب نہیں رہ سکتی، آتی جاتی رہوں گی..... میری بات غور سے سننا اپنے سینے کا ایک بال توڑ کر جتنا کے منہ میں ڈال دو۔ ماں بیٹی دونوں تمہاری بے دام علاج بن جائیں گی۔ لیکن جلد بازی سے کام نہ لینا۔ ورنہ.....“

انکا سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ لیکن اُس کے جملے کا مفہوم سمجھ چکا تھا۔ میری نظر اب جتنا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”کس وچار میں گم ہو مہاراج.....؟“ جھرنات کے چہرے پر میری خاموشی سے تشویش کے رنگ اُبھرنے لگے۔

”تمہارے پتا کا دیہانت کب ہوا تھا.....؟“ میں نے برسمیل تذکرہ پوچھ لیا۔ میرے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔

”مم..... مجھے نہیں معلوم مہاراج۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔ ”ماں بتاتی ہے کہ جب میں نے جنم لیا تھا تب وہ حیوت تھی، پھر میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی بھگوان نے انہیں اپنے پاس بلا لیا.....“

”کیا جتنا پہلے بھی بیمار ہوتی رہی ہے.....؟“ میں نے بات کا رخ بدل دیا۔

وہ میرے منہ سے ماں کا نام سن کر چونکی۔ میں بھی اُسے حیران کر دینا چاہتا تھا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا، میں نے اُسے موقع نہیں دیا، بڑے غصے لہجے میں بولا۔

”تجھے کس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے لگی؟ جو حیون سے منہ پھرا کر آکاش سے رشتہ جوڑ

بنے ہیں وہ سارے مجید بھاء سمجھنے لگتے ہیں..... تو ابھی نادان ہے، سیانی ہو جائے گی تو تیری بندھی بھی باہر کرنے لگے گی۔“ میں نے اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”جواندھیروں میں دُور سبک دیکھنے کی شہتی پراپت کر لیں، پھر اُجالوں میں ان کا من نہیں لگا۔ اپنی زبان پر تالے ڈال لے، تیری زبان میرے بارے میں کسی کے سامنے کھل گئی تو بونچال آجائے گا۔ میں تیری کوئی سہاوا بھی نہیں کر سکوں گا، تجھ رہی ہے مری یات؟ میں کب آیا؟ کب گیا؟ کسی کو بھٹک بھی نہ ملے۔ کسی سے پوچھ نہ کہنا..... ہڈت قول کشور کے سامنے بھی زبان بند ہی رکھنا۔“

”تم میری ماں کو اچھا کر دو، میں سارا جہن تمہارا انکار نہیں بھولوں گی۔“ اُس نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔ ”جیسا کہو گے وہی ای کر دوں گی۔“

”چھتا مت کر، میں آگیا ہوں، اب تیری ماں کو کچھ نہیں ہوگا..... نیر بہانا بند کر دے، تو بڑی بھگوان ہے جو تو نے مجھے کھوج لیا۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے جھرنات کے معصوم ذہن کو تسخیر کرنے کی خاطر یونہی ہونٹ ہلانا شروع کر دیے۔ ”اُمید و بیم کی کبتوں سے دوچار تھی۔ جتنا بے سدھ پڑی کراہ رہی تھی۔ کرے میں کچھ برساتنا طاری ہا۔ جھرنات کبھی حسرت بھری غروں سے ماں کو دیکھنے لگتی، کبھی اُمید نظروں سے مجھے نکلنے لگتی۔ میں نے زیادہ وقت نہیں لیا، ہونٹ ہلانا بند کر کے معنی خیز نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر سینے کا ایک بال ڈر کر جتنا کے منہ میں ڈال دیا، اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

”اب آنکھیں کھول دے جتنا، اٹھ کر بیٹہ جا..... میری آگیا کا پالن کر۔ میں نے تیرا روک دُور کر دیا ہے۔“

جھرنات نے ماں کو میری آواز پر کسمپاسی سے دیکھا تو اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جتنا نے آنکھیں کھول کر مجھے غور سے دیکھا، پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں خود بھی ششدر رہ گیا۔ جھرنات پر بھی حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بے اختیار ماں کے سینے سے لپٹ کر فٹی کے آنسو بہانے لگی۔ جتنا مجھے گھورے جا رہی تھی۔

”تیری میٹرل میرا ہاتھ تھام کر لے آئی تھی۔“ میں نے اُسے سمجھانے کی خاطر کہا۔ ”جس گردو دیو نے تیرا علاج کیا تھا وہ کیول تیرے شریر کو اُپر ہی اُپر دیکھا، اندر جھانک

کرتیہ اصلی روگ نہیں جان سکا..... میں نے بڑے سوچ و چار کے بعد تجھے وہ وارو دیا ہے جو سن لو..... کر سکے۔ جو گزر گئی، گزر گئی۔ جو باقی رہ گئی اسے بھی ہنس کر بتا دے۔ من کے پچھتاووں کو تو سن لادو..... کیوں بتا لیتی ہے؟“

”تم..... تم کون ہو تمہارا ج؟“ جمنانے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نہیں سمجھ سکی۔“

”بھری..... تو دو پل کے لئے باہر چلی جا.....“ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا، جھرنا سہم کر باہر چلی گئی۔ میں نے جمنانے کی آنکھوں میں دیکھا کہ وہ بولے۔ ”اب پوچھ، کیا چاہتا چاہتی ہے، وہ جو بیت گیا؟ یادہ جو کل پیش آنے والا ہے۔؟“

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھ سکی.....“ اس نے بدستور حیرت کا اظہار کیا۔ ”آج پہلی بار تمہیں دیکھا ہے۔ کوئی بھول ہو گئی ہو تو شاید دینا۔“

”بھول تو تجھ سے بہت پہلے ہو چکی، اب اسے نبھانے کی چتا کر۔“ میں نے سر آواز میں جواب دیا۔ ”جھرنا کو خبر ہو گئی تو اس کے دل پر کیا پتے گی مورکھ، بچی کے بھوش کے بارے میں سوچا کر۔ اس کی رکھشا کرنے کی خاطر آنکھیں کھلی رکھ۔ جو تیرے ساتھ ہو گا وہ جھرنا کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ تو سمجھدار تھی، جمیل گئی۔ وہ نا سمجھ ہے، اس کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ جیو بتیا کر لے گی۔“ میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”میں خود سے نہیں آیا، تیری بھری میرا ہاتھ تھام کر لے آئی۔ میری نظروں نے تیرے من کا روگ جان لیا۔ میں ابھی دو چار روز ہوں، پھر چلا جاؤں گا۔ میری بات کان کھول کر سن، ہر چپکنے والی چیز سن نہیں ہوتی۔ بھگوان یا دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں کچھ نہیں کرتیں۔ وہ کوئی دوش کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتیں۔ منس راکشس بن جاتا ہے..... اپنے من میں جھانک، اپنے جیون کی پستک کے پنے پلٹ کر دیکھ، ایک پنے پر تجھے اس چندال کی صورت نظر آ جائے گی جو کال کے پوتر استھان پر دھرنا بجائے بیٹھا پچارنوں کے اُجلے تن سے کھلونوں کی طرح کھیل رہا ہے..... دیو داسیوں سے من بہلا رہا ہے..... سمجھ گئی میری بات یا کھل کر تیرے جیون کی ساری کتھنا ساڈالوں.....؟“

جمنانے میرے پیر پکڑ لئے۔ جھرنا پہلے ہی میری شعبدہ بازی سے متاثر ہو چکی تھی۔ مجھے کالی کے مندر میں سر چھپانے کا ٹھکانا مل گیا۔ دونوں ماں بیٹیوں نے یقین دلایا تھا کہ

میرے بارے میں زبان نہیں کھولیں گی۔ میں نے سکون کا سانس لیا..... پنڈت نول کشور کے سیوکوں نے پورا مندر کھنگال ڈالا۔ جمنانے گھر کی تلاشی نہیں لی گئی، میں محفوظ رہا۔ نول کشور، جمنانے کی جوانی سے کھیل چکا تھا، اب جھرنا کی کسنی میں نقب لگانے کی سوچ رہا تھا۔ اس کے دماغ کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ اس کا سب سے میزاٹمن اس کے سب سے بڑا اعتماد لوگوں کے گھر میں چھپا بیٹھا ہوگا۔

جھرنا البڑھی، کسن تھی، نادان تھی۔ ماں کو باتیں کرتا دیکھ کر اس کے ہونٹوں کی مسکرائشیں واپس لوٹ آئیں۔ وہ ہرنیوں کی مانند کلیں بھرنے لگی۔ کبھی بھاگ کر باہر جاتی، کبھی دوڑ کر اندر آتی۔ جو ہنگامے ہو رہے تھے اُن کا آنکھوں دیکھا حال بتانے لگتی۔ پنڈت نول کشور پر کیا قیامت گزر گئی، جھرنا کو اس کا مطلق اندازہ نہیں تھا۔ جمنانے کے چہرے پر البتہ تشویش کے گھنے بادل منڈلانے لگے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے جمنانے کو کریدنے کی خاطر انجان بن کر پوچھا۔ ”یہ جھرنا کیا خبریں سن رہی ہے؟ باہر کیا ہو رہا ہے.....؟“

”بھگوان ہی جانے۔“ وہ نقاہت سے بولی۔ ”بہت دنوں سے ہردوار کے آکاش پر کالے کالے بادل منڈلا رہے ہیں۔ پنڈت پجاری بڑے پروہت کے ساتھ بیٹھے صبر پکڑا کرتے رہتے ہیں، کسی کو ادھر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”نمیک ہے..... تم آرام کرو۔ میں اب چلتا ہوں۔“ میں نے جان بوجھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی رہنے کا حکم نہیں دیکھنا ہے۔ پنڈت نول کشور سے ملاقات بھی کرنی ہے۔“

”تم کہاں سے آئے ہو تمہارا ج.....؟“ جمنانے دبی زبان میں پوچھا۔

”ہمارے.....“ میں نے اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے بے پرواہی سے جواب دیا۔ ”دو تین دن مندر میں رہا، پھر واپس چلا جاؤں گا۔“

”بڑے پروہت سے تمہاری ملاقات پہلے سے ہے یا ابھی ہو گئے؟“

”تم کیوں پوچھ رہی ہو.....؟“ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جب میں غنودگی کی حالت میں تھی تو تم جھرنا سے باتیں کر رہے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ اگر کسی کے سامنے اس کی زبان تمہارے بارے میں کھل گئی تو بھونچال مچ جائے گا۔ وہ مجھے گھورنے لگی۔“ تم نے کہا تھا کہ بڑے پروہت کو بھی تمہارے بارے میں معلوم نہ

ابواب تم خود چل کر اس کے پاس جا رہے ہو۔“

ایک ایک لیمہ کو شپٹا گیا، پھر مسکرا کر بولا۔ ”تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔“

”پھر جیسے تم چاہو۔ لیکن میری مانگو تو اس سے بڑے پردہت سے نہ ملو تو اچھا ہو گا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“

”میں کوئی کارن تو نہیں تھی، تو اتنا جانتی ہوں کہ کالی اپنے سیوکوں سے ناراض ہو

گئی ہے۔“ اُس نے مضم لہجے میں کہا۔ ”کوئی چتا ضرور ہے جس نے بڑے پردہت کو بیا کل کر رکھا ہے۔ وہ اپنے لوگوں پر بھی شک کرنے لگا ہے۔ تم نئے آئے ہو، وہ تمہارے اوپر بھی شبہ کرے گا۔“

”تم۔۔۔۔۔“ میں نے جنما کی بات سن کر آنکھیں بند کر لیں، اسے متاثر کرنے کے لیے

میں کچھ دیر آنکھیں موندے رہا۔ اُس نے جو جملہ کہا تھا اس کے لیے مجھے شیوا کا چہرہ نظر آنے لگا۔ انکارانی نے بتایا تھا کہ نول کشور نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ تب خاندے کی کال کوٹھڑی میں قید کر دیا تھا۔ میں جنما کو اعتماد میں لے کر شیوا کا پتہ معلوم کر سکتا تھا۔

اگر شیوا کی نہ بھی ہوتی تو جنما اس کا نام سن کر ضرور چوکتی۔ وہ اگر نول کشور کی خاص پکار تھی تو پنڈت شیوا کے بارے میں بھی ضرور جانتی ہوگی۔ میں نے اُسے مرعوب کرنے کا خاطر صرف ”تم“ کہہ کر بات ادھوری چھوڑ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ یقیناً پوری طرح

میری طرف متوجہ ہوگی۔ میں نے کچھ توقف کے بعد دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ جنما مجھے ٹھنکی باندھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پہلو بدل کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میں سمجھ رہا ہوں تم کس کی بات کر رہی ہو۔ میں بھی اُسی کو کھوجنے آیا ہوں۔ نول کشور

نہیں جانتا، مجھے معلوم ہے کہ وہ نردوش ہے۔“ میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کا خطر گنبد آواز میں سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ”وہ نردوش نہ ہوتا تو کالی اپنے سیوکوں سے ناراض بھی نہ ہوتی، اس سے جو شور و غل ہو رہا ہے، وہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو مہاراج؟“ جنما نے کسمسا کر پوچھا۔

”وہی۔۔۔۔۔ جو پہلے بڑے پردہت کا خاص آدمی تھا۔“ میں نے شیوا کا نام لینے سے گرا کرتے ہوئے سرسراتی آواز میں کہا۔ ”اب بغیر کسی پاپ کے سزا بھوگ رہا ہے۔“

تیرے من کی دُبدھا سمجھ رہا ہوں۔ تو بھی اسی نیک منش کے لئے بیا کل ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“

”مہاراج۔۔۔۔۔“ اُس نے بڑی عقیدت سے میرے قدموں کو ہاتھ لگا کر چومتے ہوئے

دلی زبان میں کہا۔ ”جب تم دلوں کا مجید جاننے کی شق رکھتے ہو تو پھر بڑے پردہت سے ملنے کی بھول کیوں کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

”سر چھپانے، رات گزارنے کے لئے کوئی ٹھکانا تو ڈھونڈنا پڑے گا۔“ میں نے لوہا

گرم دیکھ کر ہلکی سی ضرب لگائی، مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔

”ایک بنی کروں مہاراج۔۔۔۔۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر مجھ التجا بن گئی۔ ”غریب پکارن کا یہ

ٹھکانا تم جیسے مہان دیوتا سان منش کو شوبھا تو نہیں دیتا۔ لیکن تم یہیں بسیرا کر لو تو زیادہ مناسب ہو گا۔ ہمارے بھائیہ بھی کھل جائیں گے۔“

”کسی کو بھٹک مل گئی تو وہ تیرے اور جھرنات کے ساتھ بھی کوئی اچھا سلوک نہیں کریں

گے۔“ میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

”تم اس کی چنات مت کرو، جھرنات بھی زبان بند رکھے گی۔ میں بھی کسی سے کچھ نہیں کہوں

گی۔“ اُس نے یقین دلایا۔

”ایک شرط پر۔۔۔۔۔“ میں نے اُس کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”میرے من

کے مجھے ایک کال کوٹھڑی چھجوا رہی ہے۔ مجھے دشوا ہے کہ اُسے وہیں قید کیا ہو گا۔

اُسے کھوجنے میں مجھے میری سہاٹا کرنی ہوگی۔ تیار ہے جان جو حکم میں ڈالنے کو۔۔۔۔۔؟“

”تم۔۔۔۔۔ تم پنڈت شیوا کی بات کر رہے ہوتا مہاراج؟“ جنما کی زبان پر شیوا کا نام آ

گیا۔ اُس نے اپنی مجبوری کا اظہار بھی کر دیا۔ ”میں تمہیں وہاں تک نہیں لے جا سکتی، لیکن

دور راستہ ضرور دکھا سکتی ہوں جو اس تہ خانے کو جاتا ہے، جہاں اُس مہان پنڈت کو زنجیروں

میں بکڑ کر رکھا گیا ہے۔“

میرے لئے جنما کا وجود کالی کے اس مندر میں جہاں ہر طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی، کسی

سایہ دار درخت سے کم نہیں تھا۔ میں نے اُسی کے کوارٹر کے ایک گوشے میں بڑا ڈال دیا۔

دوراتیں ایک دن سکون سے گزر گیا۔ انکا نے جھرنات کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ کسن

ہونے کے باوجود بڑی ذہین ثابت ہو رہی تھی۔ اُس کے کہیں آنے جانے پر کوئی روک

لوک نہیں تھی۔ نول کشور، جنما کے بعد جھرنات کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے سہانے سپنے

دیکھ رہا تھا۔ ایک دو بار اُس نے جتنا کو بھی اپنے ارادے سے آگاہ کیا تھا۔ جتنا ایک ماں بھی تھی۔ وہ نول کشور کی بات سن کر کانپ اٹھی تھی۔ اُس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی مندر کے اندر کھٹنے والی ہر کٹی پر پہلا حق بڑے پروہت کا ہوتا ہے، اس کے بعد دوسرے بھی اس کی مہکتے ہوئے حشمت بھر استفادہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مندروں میں یہی کچھ ہوتا ہے، چھوٹے بڑے۔ ایک رنگ میں رنگے ہوتے ہیں اس لئے ایک دوسرے پر انگلیاں بھی نہیں اٹھائی جاتیں۔ کالی کے چرنوں میں بھیٹ چڑھانے کے لئے بھی پجاریوں کے خون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بڑی ہولناک رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ پجاریوں اور دیوداسیوں کی تعداد کا حساب کتاب بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ تمام باتیں خود جتنا نے رو کر بتائی تھیں۔ میرے اوپر اُس کا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔

اس وقت بھی میں جتنا کے ساتھ بیٹھا حالات کی سن سن لینے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک پانچ چھ بے کئے پجاری ہاتھوں میں لٹھ لئے دندتاتے ہوئے اندر آئے۔ سید کی لائٹی میرے قریب ہی رکھی تھی۔ میں نے برق رفتاری سے اُسے اٹھا کر کھینچ لیا۔ اٹھنے لگی وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اُس کے حلق سے بڑی کر بناک چیخ کی آواز بلند ہوئی تھی۔ میں نے اُسے اُچھل کر پوزیشن تبدیل کی۔ جتنا بھاگ کر ایک طرف ہو گئی۔ ایک پجاری نے اُسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا، وہ چکرا کر منہ کے بل گری۔ میں نے پینٹر ابدل کر دوسرا وار کیا، ایک شخص اور ڈھیر ہو گیا۔ باقی پیچھے کھسکے گئے۔ میں نے لائٹی لہرا کر انہیں لگا کر۔

”پیچھے کیوں ہٹ رہے ہو حرام زادو..... مردنو، باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرو۔ اپنے بانی ساتھیوں کو بھی بلا لو۔ آج یہ فیصلہ بھی ہو جائے کہ کون بڑا ہے، کون چھوٹا۔“

”تم پوری طرح ہمارے زرنے میں پھنس چکے ہو۔“ اُن میں سے ایک غرایا۔ ”سید می طرح لکڑی پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ اسی میں تمہاری مکتی ہے۔“

”چنڈت نول کشور کے اشاروں پر ناچ رہے ہو کینو.....“ میں گرج کر بولا۔ ”تم اس منزل کا انجام بھی دیکھ چکے ہو جو تمہارے پروہت نے بڑے مان سے کھینچا تھا، کیا حاصل ہوا.....؟ آنکھیں کھولو، حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ خود عیش کر رہا ہے، تمہیں ایک ایک کر کے میرے انتقام کی آگ میں جھونک رہا ہے۔ چنڈت کالی داس کا انجام کیا ہوا..... اوم پرکاش بھی کام آ گیا۔ میں اب بھی تمہارے سامنے سینہ تانے کھڑا ہوں۔ اُس بھڑکے

سے کہو کہ اگر مرد ہے تو سامنے آئے۔ تم کیوں مفت میں جا رہی ہو کی طرح خود کو کٹوانے پر آمادہ ہو۔“ میں سید کی لائٹی لہراتا رہا، میرے حلق سے انکارے اُٹھتے رہے۔ میں نے کہا۔ ”وہ سامنے آنے سے ڈرتا ہے تو مجھے اُس کے پاس لے چلو۔ سن رہے ہو میری بات؟“

”تمہارا سے پورا ہو گیا فیمل احمد خاں۔“ انہوں نے سفاک لہجہ اختیار کیا۔ ”تم کالی کے پوتر مندر میں تمہارا پلید خون نہیں بہانا چاہتے۔ تم جو سنے دیکھ رہے ہو وہ پورے نہیں ہوں گے۔ ڈرگا کے علاوہ کالی کا آشرواد بھی ہمارے ساتھ ہے۔ تم بچ کر نہیں جاسکو گے۔“

میرے جنون میں اضافہ ہونے لگا۔ میں لائٹی لہراتا آگے بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹے ہٹے کوارٹر سے باہر آ گئے۔ میں سمجھا اُن کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔ وہ میرے خلاف ہال بن رہے تھے۔ انکارانی نے آخری وقت تک یہی سمجھا نے کی کوشش کی تھی کہ میں سوچا سمجھا کر قدم اٹھاؤں، جلد بازی کا مظاہرہ نہ کروں۔ خود کو حصار میں رکھوں، اس سے باہر نکلنے کی حماقت نہ کروں۔ میں جتنا اور جھرتا پر بھروسہ کر کے بے فکر ہو گیا تھا۔ یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ چنڈتوں کے جنتر منتر کے پیر بھی مجھے تلاش کر سکتے ہیں۔ پہلے بھی کئی موقعوں پر میری خوش فہمی مجھے بدترین حالات سے دوچار کر چکی تھی۔ ایک بار پھر میرے ستارے گردن میں آ گئے۔ میں جتنا کے کوارٹر سے باہر نکلا تو اُن کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ باہر اور اندر دونوں اُڑے کے دائیں بائیں لٹھ اٹھائے موجود تھے۔ کسی بزدل نے چھپ کر پشت سے بھر پور وار کیا۔ سید کی لائٹی پر میری گرفت کمزور پڑنے لگی۔ میرے سر پر کئی سورج طلوع ہو کر تیزی سے عروج پر پہنچے جلتے گئے..... میں سنبھل نہ سکا، وہ میرے سر پر جسم پر لٹھ برسا رہے تھے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ساری حسرتیں تڑپ کر رہ گئیں۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔

”مارڈ الو سالے مسلے کو..... قیہ بڑو..... کئی ملی جلی آوازیں میرے کانوں میں گونجیں۔ پھر ہر احساس تاریکی میں گم ہو کر رہ گیا۔“

میں کب تک بے ہوش رہا، کتنے عرصے بے خبری کی حالت سے دوچار رہا، انہوں نے میرے اوپر کیا کیا ستم ڈھائے، کیا کیا ظلم کئے، مجھے کچھ یاد نہیں۔ جب دوبارہ ہوش آیا تو میرا جڑو جڑو سورج کی طرح ڈھک رہا تھا۔ اذیتناک تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو یوں لگا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن

وہ خوب نہیں۔ حقیقت تھی۔ میں کالی کے قد آور بت کے سامنے بیٹ فٹ کے فاصلے پر ایک ستون سے بندھ چلا تھا۔ میرا جسم رسیوں سے نہ جکڑا ہوتا تو شاید میری ٹانگیں میرے وجود کا بوجھ برداشت نہ کر سکتیں۔ میرے دائیں بائیں پنڈت پجاری قطار بنائے کھڑے مجھے نفرت اور حقارت بھری نظروں سے گھور رہے تھے۔ کالی کے بت کے سیدھے ہاتھ پر ایک ہٹا کٹا دراز قد شخص ایک اور بیٹا پر بیٹھا مجھے بڑی کینہ توڑ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں پنڈت نول کشور کا نام گردش کرنے لگا۔ اُس کی خوفناک نظروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر میرے خون نے جوش مارا۔ میں نے منہ کے بتائے ہوئے عمل کو پختہ کی کوشش کی، میری زبان نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے عالم تصور میں انکارانی کو آواز دی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ مندر سے باہر رہ کر بھی مجھ سے دُور نہیں رہے گی، میں جہاں جاؤں گا اُس کے آس پاس کا کچھ حصہ اُسے نظر آتا رہے گا۔ جہرنا سے ملاقات کے بعد میں نے واضح طور پر اُس کی آواز بھی سنی تھی..... اُس نے کہا تھا کہ جہرنا میرے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ اس وقت کوئی میری بد نصیبی میں شریک ہونے کے لئے سامنے نہیں آیا۔ مجھے تنہا ہونے کا احساس ڈنک مارنے لگا۔

میں اپنی بے بسی پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ کلدیپ نے کہا تھا کہ سید کی لائچی کسی آخری موقع پر میرے کام آئے گی..... وہ بھی میرے ہاتھ سے کہیں نکل گئی تھی۔ انکارانی بھی کہیں دُور کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہوگی۔ دُرگانے کلدیپ اور پریم لال کو میرے راستے سے علیحدہ کر دیا تھا۔ کالی کی شکتی نے شاید انکارانی کی قوت پرواز بھی چھین لی ہوگی..... کس جہرنا کیا کر سکتی تھی؟ وہ تو خود عتاب کا نشانہ بن رہی ہوگی۔ مجھے جہنما کے گھر سے برآمد کرنے کے بعد اُنہوں نے جہنما کو ضرور مار ڈالا ہوگا۔ اُس کا جرم بے حد سنگین تھا، اُس غریب نے کالی کے مندر کے بڑے پروہت پنڈت نول کشور مہاراج کے مقابلے میں جیل احمد خاں کی مدد کی تھی۔ اُسے سنگین جرم کی سزا بھی بڑی سنگین ملی ہوگی۔ جہرنا شاید محفوظ ہو..... اُس کی کسن جوانی دیکھ کر میرے دشمنوں کو شاید اُس پر رحم آگیا ہو۔ گودے دار ہڈی دیکھ کر تو خارش زدہ کتابھی دُم ہلانے لگتا ہے۔ جہرنا تو جوانی کی سرحدوں پر دستک دے رہی تھی۔ ہو سکتا ہے نول کشور نے اُسے خود سزا دینے کی خاطر اپنے کسی کمرہ خاص میں بند کر

دیا ہو، بہت کچھ ممکن تھا۔

میرے ذہن میں گرم ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ میں نے کئی بار اپنی قوتوں کو آزمانا چاہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ شاید کالی کی مہمان شکتی نے مجھے پوری طرح بے بس کر دیا تھا، میری تمام قوتیں سلب کر لی گئی تھیں۔ میرے دل نے کہا۔

”جیل احمد خاں، اب اپنی شکست تسلیم کرلو۔ بہت کھیل کود چکے، ہر کہانی کا کوئی نہ کوئی انجام ضرور ہوتا ہے۔ تمہاری زندگی کی کہانی تو بڑی رنگین تھی۔ تم ہمیشہ سرکش گھوڑے کی مانند جھپٹاتے رہے، تم نے جو چاہا وہ ہوا۔ جو مانگا وہ ملا۔ انکارانی کے سر پر آنے سے پیشتر تم کچھ بھی نہ تھے، وہ مہربان ہوئی تو قارون کا خزانہ تمہارے ہاتھ آگیا، تم اپنی اوقات بھول گئے، ہواؤں میں پرواز کرنے لگے، دُور دُور کی سوچنے لگے۔ دولت، عزت، شہرت تمہیں سب کچھ ملا۔ جن مہ جبینوں کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے وہ بھی تمہاری آغوش میں چلنے پر مجبور ہو گئیں۔ زمرس کے بارے میں سوچو، مالارانی پر غور کرو، کلدیپ کے حسن کا اندازہ لگاؤ۔ کیا تم اُن کے قابل تھے؟..... نہیں، سب انکارانی کی مہربانی تھی، اُس کی پراسرار قوت تمہارے کام آتی رہی۔ تم رنگ رلیاں مناتے رہے۔ لندن میں بھی تم نے کھیل تماشے دکھائے، جہرنا کے گوشے گوشے میں تمہارے نام کی گونج کسی نہ کسی طور سنائی دیتی رہی۔ لیکن کب تک..... کبھی نہ کبھی تو تمہارے عروج کو زوال ہونا ہی تھا۔ ہر ذی روح کو موت کا ڈالٹہ پکھنا پڑتا ہے۔ کل تک تم دوسروں کی موت پر قہقہہ لگاتے تھے، فخر سے سینہ تان کر چلتے تھے، آج اپنی باری آئی تو بغلیں جھانکنے لگے..... ایسی بھی کیا کم ہمتی؟ مرد بنو..... مرد گردن اٹھا کر موت کا استقبال کرو۔ دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع دو.....“

”کیا سوچ رہے ہو جیل احمد خاں.....“ پنڈت نول کشور نے مجھے گھورتے ہوئے بڑے سرد لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تم تو سارے لوگوں کا طرح بڑا اُچھل کود کرنے کے عادی تھے۔ بڑا شور شرابا مچا رکھا تھا تم نے۔ جنگلی سوری طرح کی حیثیت کھلیاں کو روندتے پھر رہے تھے، کسی کومند میں لگام ڈالنے کی اجازت نہیں دیتے تھے..... آج ہم سادھے کھڑے مگر ٹکڑ کیا گھور رہے ہو؟ کیا سانپ سونگھ گیا؟ من ہی من میں ہمیں کشتے دیکھنے کے بارے میں کیا کیا سندرہ سننے دیکھ رہے ہو؟ کچھ ہمیں بھی سناؤ.....“

”کالی کے سامنے آتے ہی مینا مر گئی سالے کی۔“ ایک منہ زور پنڈت نے دل کی

کالی۔ ”کل تک بڑے اونچے سروں میں لمبی چوڑی باتیں کرتا تھا۔“

میں دسویں کے تھکنے میں جکڑا کھڑا تھا۔ وہ سب اپنی اپنی زبان میں زہر اُگل رہے تھے۔ میری قوت کوئی میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میرے لئے وہ لمحے بڑے اعصاب شکن تھے، مجھے بے بسی کی موت منظور نہیں تھی۔ میں نے بار بار پھڑپھڑانے کی کوشش کی، ہر بار بندشیں میرے گورنر میں ہی پھنس جاتیں تو میں اذیت سے بلبلا اٹھتا۔ وہ حق بجانب تھے۔ میں نے بھی اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی تھی۔ جو بھی سامنے آیا اُسے اپنے قدموں تلے روندنا چلا گیا، لیکن ایک نرکتی ضرور تھا، میں نے کسی کے ہاتھ پیروں کو جکڑ کر اُس کو اپنی مردانگی کا ثبوت نہیں دیا۔ مجھے ایک ایک کہانی یاد آ رہی تھی، میرے اندر طوفان کروٹیں بدلتا رہا، شعلے بھڑکتے رہے لیکن شاید وہ کالی کی قوتوں نے مل کر مجھے بے بس کر دیا تھا۔ کتوں کے غول میں عید منائی جا رہی تھی۔ پنڈت نول کشور دُور بیٹھا سر پھرے پجاریوں کو بھڑکا رہا تھا، وہ سب آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ بڑی مخالفت گالیاں بک رہے تھے۔ میری طرف منہ اٹھا اٹھا کر تھوک رہے تھے۔ اُن کے من میں ہوتا تو مجھ پر ہلا بول دیتے، میرے جسم کی تکیہ بوٹی کر ڈالتے۔ لیکن نول کشور نے اُنہیں روک دینے سے روک رکھا تھا، وہ مجھے آسان موت نہیں مارنا چاہتا تھا، سکا سکا کر، اذیتیں دے دے کر مارنا چاہتا تھا۔ اُس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔

”بڑی آنکھیں لال پیلی کر رہے ہو مہاراج.....“ نول کشور نے میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کی کوشش کی۔ ”کیا ہم سے تمہارے سوا گت میں کوئی بھول ہو گئی؟ تم تو بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے، بڑے بڑے جال بن رہے تھے، اب چپ کیوں ہو؟..... کوئی منتر پڑھ کر پھونک مارو، ہمیں جلا کر بھسم کر دو، دیوی دیوتاؤں کی شان میں برے شبد اپنی گندی زبان سے نکالو، تم یہی کیا کرتے تھے نا، اور..... وہ کہاں گئی؟ تمہاری بیر بہولی ڈیڑھ بالشت کی چھمیا۔ سنا ہے وہ بھی تمہارا ساتھ چھوڑ گئی۔ ایک بار اُسے پھر آواز دو، شاید اُس پودنی حرافہ کو تمہارے اوپر دیا آ جائے، تمہارا اُس کا تو برسوں کا گٹھ جوڑ تھا، اُسی کے کارن تم کچھ کے مگر مجھ کی طرح شکار کھیلنا کرتے تھے۔ پنڈت بدری نرائن یاد ہے تمہیں؟ تمہاری وہ رکھیل کلدیپ پہاڑ سے اُتر کر نیچے نہ آ جاتی تو مہاراج امر لال تمہارا وہ انجام کرتا کہ دنیا دیکھتی۔ بدری نرائن بھی تمہیں تڑپا تڑپا کر کتوں کی موت مارتا۔ تمہاری اس

خوبصورت رکھیل کے دن بھی پورے ہو چکے تھے۔ آخری سے میں وہ کالی کے چرنوں میں گر گئی۔ کالی نے دیا کھا کر اُس کی بھینٹ سو بیکار کر لی..... یاد ہے تمہیں.....؟“

کلدیپ کا نام لے کر اُس نے بھڑکتی چنگاری پٹرول کے کنویں میں ڈال دی تھی۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا، پٹلیاں حلقوں سے اُبل پڑنے کے لئے بے چین ہو گئیں۔ میری رگوں میں خون کی جگہ کن سمجھوڑے دوڑنے لگے۔ میں نے پھر پوری قوت صرف کر دی لیکن تڑپ کر رہ گیا۔

”سندھ تار یوں کو جال میں پھنسانا تجھے خوب آتا ہے۔“ نول کشور نے میری وحشت، میرے جنون کی بے بسی کا تماشا دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جنا بھی تیری باتوں میں آ گئی۔ اُسے بھی اپنے کئے کی سزا بھوگنی پڑے گی۔ ہم نے اس ویشیا کو کالی کے پوتر چرنوں میں بھینٹ چڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

میرا دل چاہا کہ حلق پھاڑ پھاڑ کر نول کشور کی ذہنی فلاحی پر ترقیہ لگانا شروع کر دوں۔ وہ جتنا کو ویشیا بھی کہہ رہا تھا اور اُسے کالی کے پوتر چرنوں میں قربان کرنے کی باتیں بھی کر رہا تھا۔ کل تک جس کی چھاتیوں کے درمیان منہ رگڑ کر رانی جاتی کہتا تھا، آج اُسے ویشیا کہہ رہا تھا۔

”مہاراج.....“ ایک پستہ قد پجاری نے قطار سے نکل کر پنڈت نول کشور کو مخاطب کیا۔ ”گرودیو تم.....؟“

نول کشور نے اجازت دے دی ٹھٹھنے پجاری نے سر جھکا کر ڈنڈوت کیا، پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ اُس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ وہ کسی منتر کا جاپ کر رہا تھا، سب کی نظریں ہم دونوں پر جمی تھیں۔ پستہ قد پجاری نے منتر پڑھ کر زوردار پھونک ماری، میرے چاروں طرف اُن کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اُس کی چشم میرے جسم کو جھلسانے لگی۔ اُس نے اُٹا ہاتھ اٹھا کر شعلے عتاب ہو گئے۔ میں نے ہلکون کا سانس لیا۔ لیکن میرا سکون زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ پجاری نے اچھلی کر سیدھا پاؤں زمین پر مارا، میرے کانوں میں کسی خوفناک درندے کی غراہٹ کی آواز ابھری..... میں نے پلٹ کر بائیں جانب دیکھا، وہ خرگوش اور بندر سے ملتا جلتا کوئی عجیب اٹھتا جانور تھا جو نیچے سکیڑے پیٹ زمین سے چپکائے مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس کی

آنکھیں کھول کر دیکھو، تم پہلے پنگے کھڑے ہو۔ اتنی جلدی کیسے مر سکتے ہو؟ ابھی تو تم کو بہت کچھ اور دیکھنا ہے۔۔۔۔۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ میری نگاہیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔۔۔ میں دم بخود رہ گیا۔ پریشان نظروں سے اپنا جسم ٹٹولنے لگا، میرے بدن کے کسی حصے پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ لہو کا ایک قطرہ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میرے زخموں کی جگہں چھوڑ کر گئی تھیں۔ ہر قدر پجاری میرے اور نول کشور کے بیچ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بحر و درمیان سے ہٹ گیا۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا کہ ایسا شعبہ میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد نول کشور کے حکم پر جہنا کو گھٹ کر سامنے لایا گیا۔ اُس کے منہ سے خون جاری تھا، آنکھوں سے موت کا بھیا تک احساس جھانک رہا تھا۔ اُس کے جسم پر لباس تام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ وہ کالا کی قد آور برقی کے سامنے مادر زاد برہنہ کھڑی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کچھ پنڈت پجاریوں کی زبان اس وقت بھی ہونٹوں پر لپٹا رہی تھی۔ وہ ہٹے کئے پجاریوں نے جہنا کو ہاتھ تھام کر جکڑ رکھا تھا، اُس غریب نے میری طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا غو غاں۔۔۔۔۔ اُن غاں کی آوازیں نکالنی شروع کیں تو میں ہل گیا۔ اُن کے لڑاٹھا۔۔۔۔۔ ظالموں نے اُن کی زبان کاٹ کر بوتلے سے محروم کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ مجھے اپنی بے گناہی کا یقین دلانا نہ چاہتی تھی۔ مجھے پہلے بھی یقین تھا کہ اُس نے یا جہنا نے میرے خلاف کبھی نہیں کی ہوگی۔ میں اس بد نصیب کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اہل موجود پنڈت پجاریوں کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے اُس کے جسم سے کھیل کھیلے ہوئے، بہتوں نے اُس کے تلوے چاٹ کر بوڑھی رگوں کے نیم گرم خون کو جھونٹی تلی دی ہوئی پھل تک اُس کے طلب گار بھی رہے ہوں گے، آج سب سے آنکھیں پھیر رکھی تھیں۔

پنڈت نول کشور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کالی کی مورتی کے سامنے کی بار جھک جھک کر ڈنڈوت کرتا رہا، پھر اُس نے بلند آواز میں کچھ اشلوک پڑھنے کے بعد اپنا شروع کیا۔

”ماتا۔۔۔۔۔ تو مہان ہے۔ تیری شکتی ایسے ہمارے، ہم تیرے پجاری تیرے باک سامان ہیں۔ ہم سے کوئی بھول چوک ہوئی ہو تو ہمیں شاکر دینا۔ ہم منش ہیں، اُن ہاتھ ہیں،

آنکھیں کھول کر دیکھو، تم پہلے پنگے کھڑے ہو۔ اتنی جلدی کیسے مر سکتے ہو؟ ابھی تو تم کو بہت کچھ اور دیکھنا ہے۔۔۔۔۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ میری نگاہیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔۔۔ میں دم بخود رہ گیا۔ پریشان نظروں سے اپنا جسم ٹٹولنے لگا، میرے بدن کے کسی حصے پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ لہو کا ایک قطرہ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میرے زخموں کی جگہں چھوڑ کر گئی تھیں۔ ہر قدر پجاری میرے اور نول کشور کے بیچ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بحر و درمیان سے ہٹ گیا۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا کہ ایسا شعبہ میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔

کچھ دیر بعد نول کشور کے حکم پر جہنا کو گھٹ کر سامنے لایا گیا۔ اُس کے منہ سے خون جاری تھا، آنکھوں سے موت کا بھیا تک احساس جھانک رہا تھا۔ اُس کے جسم پر لباس تام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ وہ کالا کی قد آور برقی کے سامنے مادر زاد برہنہ کھڑی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کچھ پنڈت پجاریوں کی زبان اس وقت بھی ہونٹوں پر لپٹا رہی تھی۔ وہ ہٹے کئے پجاریوں نے جہنا کو ہاتھ تھام کر جکڑ رکھا تھا، اُس غریب نے میری طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا غو غاں۔۔۔۔۔ اُن غاں کی آوازیں نکالنی شروع کیں تو میں ہل گیا۔ اُن کے لڑاٹھا۔۔۔۔۔ ظالموں نے اُن کی زبان کاٹ کر بوتلے سے محروم کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ مجھے اپنی بے گناہی کا یقین دلانا نہ چاہتی تھی۔ مجھے پہلے بھی یقین تھا کہ اُس نے یا جہنا نے میرے خلاف کبھی نہیں کی ہوگی۔ میں اس بد نصیب کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اہل موجود پنڈت پجاریوں کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے اُس کے جسم سے کھیل کھیلے ہوئے، بہتوں نے اُس کے تلوے چاٹ کر بوڑھی رگوں کے نیم گرم خون کو جھونٹی تلی دی ہوئی پھل تک اُس کے طلب گار بھی رہے ہوں گے، آج سب سے آنکھیں پھیر رکھی تھیں۔

پنڈت نول کشور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کالی کی مورتی کے سامنے کی بار جھک جھک کر ڈنڈوت کرتا رہا، پھر اُس نے بلند آواز میں کچھ اشلوک پڑھنے کے بعد اپنا شروع کیا۔

”ماتا۔۔۔۔۔ تو مہان ہے۔ تیری شکتی ایسے ہمارے، ہم تیرے پجاری تیرے باک سامان ہیں۔ ہم سے کوئی بھول چوک ہوئی ہو تو ہمیں شاکر دینا۔ ہم منش ہیں، اُن ہاتھ ہیں،

دھرتی کے چکر میں اُلجھ کر ہماری بدھی کام نہیں کرتی تو کبھی کبھی پاپ کر بیٹھتے ہیں۔ اس پاپ کا پاپا جسے بھی اپنا دھرم سمجھتے ہیں..... مانتا تو دیوی ہے، تو ہمارے من کے مجید بھاء جانتی ہے۔ ہم سب جی شرن میں ہیں، تیرا بکار نہ ہوتا تو ہم بھی دوسرے پاپوں کی طرح در بدر ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔ ہم تیرے بتائے ہوئے راستوں پر پگ دھرنے کے عادی ہیں۔ تیری سیوا کرنا ہمارا دھرم ہے تیرے چرنوں میں بھینٹ اور بلیدان پیش کرنا بھی ہمارا دھرم ہے۔ تجھے راضی کرنا، تجھے خوش رکھنا بھی ہمارا دھرم ہے۔ آج تیرا یہ سیوک پھر تیرے پوتر چرنوں میں ایک ایسی پالی پچارن کی بھینٹ چڑھا رہا ہے جس نے تجھ سے پریم کرنے والوں کے ساتھ دھوکا کیا۔ ہم بنتی کرتے ہیں راجا، ہمارا اس بھینٹ کو اپنے چرنوں میں سو بیکار کر لے۔“

نول کشور نے اپنی چرب زبانی ختم کی تو کالی کے پچاروں نے بچے بچے کار کے نعرے بلند کئے۔ پچاروں کی ایک ٹولی نے اندر آ کر بجھن گانا شروع کر دیا۔ جبرناکے کہیں نظر نہیں آئی۔ نہ جانے اُس کمسن کے ساتھ ان غلاموں نے کیا برتاؤ کیا ہو گا۔ مہمیرے فہمن میں جبرناکی معصومیت کلبار ہی تھی۔ نظریں جمنار پر تھیں جسے بھنگ یا پھر کوئی اور شے جو جبرناکوتی پلائی جا رہی تھی۔ کچھ دیر میں وہ نشے سے چکرانے لگی تو اُسے گھسیٹ کر کالی کے قدموں کے سامنے چپوترے پر چت لٹا دیا گیا۔ دو پجاری اور لپک کر سامنے آ گئے۔ چاروں نے مل کر اُس کے ایک ایک ہاتھ اور ایک ایک پاؤں کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ موت کا بھیانک تصور نشے پر غالب آتا تو جمناکا جسم کمان کی طرح اکڑنے لگتا، چاروں پجاری پھر طاقت کے استعمال سے اُسے سیدھا کر دیتے۔ میں اس ہولناک رسم کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔ پنڈت نول کشور قریب کھڑا تھا کہ اشاروں سے اپنے آدمیوں کو ہدایتیں دیتا رہا۔ ایک پجاری نے آگے بڑھ کر جمناکے سر کے بال کاٹ ڈالے۔ پھر دو پجاری بڑے بڑے چھرے لہراتے میدان میں کود پڑے۔ پچاروں کے بھجن گانے کی آواز بتدریج بلند ہونے لگی۔ چھرے لہراتے ہوئے پجاری اُچھلتے کودتے جمناکے قریب جاتے اور اُس کے جسم پر وار کر کے پھر رقص شروع کر دیتے۔ جمناکے حلق سے غوغا، غاں غاں کی کرہناک چیخیں بلند ہوتی رہیں..... اُس کا بدن لبو لہبان ہو رہا تھا۔ اُس کے جسم نے جھلکے کھانا شردنا کیا تو دونوں پجاری ایک دوسرے سے پشت ملا کر اُس کے خون آلود جسم پر بیٹھ گئے، اُنکا

کے اعضا جسم سے کاٹ کاٹ کر علیحدہ کرنے لگے..... میں نے آنکھیں بند کر لیں۔
پیاروں کے بچھن گانے کی آواز میں پجاریوں کا شور و غل بھی شامل ہو گیا۔ غالباً وہ
جینٹ کی بھیا تک اور ہولناک رسم کی ادائیگی کے بعد خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اُن کا شور
و غل ختم ہوا تو میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اُبکائیاں آنے لگیں..... میں اُس
منظر کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی تو پجاریوں نے تیز
دھار چیزوں سے مجھے ٹھونکنے مارنا شروع کر دیے۔ میں آنکھ کھلی رکھتے پر مجبور ہو گیا۔ وہ جتنا
کے ہاتھ پاؤں اور چھاتیاں جسم سے علیحدہ کرنے کے بعد اُس کے خون سے چلو بھر بھر کر
کالی کے جسم کو غسل دینے کی رسم پوری کر رہے تھے۔ میں نے ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔ رسم
ختم ہوئی تو جتنا کے جسم کے ٹکڑوں کو ٹھوکریں مار مار کر چبوترے سے ہٹا دیا گیا۔ پنڈت نول
کشور کی نظریں پھر میری جانب اُنھیں۔ ان میں فاتحانہ چمک تھی۔

”ہم نے جتنا کے جینٹ کی رسم بہت سادگی سے ادا کی ہی..... تم زراش مت ہونا۔“ اُس نے سرد آواز میں کہا۔ ”تمہارے ساتھ ہم پورا پورا نیا لے کریں گے، تم مہبان شکلیوں کے مالک ہو تو پھر تمہارے ساتھ جو سلوک ہوگا، دُھوم دھام سے ہی ہوگا۔ ہم تمہیں موقع دیں گے، تم اُس ڈیڑھ بالشت کی چھمیا کو بھی بلا لینا، وہ بھی تماشا دیکھ لے گی۔ اپنے دھرم کے دو چار بڑوں کو بھی بلا لینا، وہ اپنے دھرم کے انوسار تمہارا کرپا کرم بھی کر دیں گے۔“

”مہابااج.....“ ایک ادھیڑ عمر پجاری نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میں تو کہتا ہوں کہ آج ہی اس سلسلے کا بیجا کر دیا۔“

”ہاں مہاراج۔۔۔“ دوسرے نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”شیوا کی نیت کے کھوٹ کا امتحان بھی ہو جائے گا۔ اگر اُن نے اپنے ہاتھوں سے اس مسئلے کا سرکٹ کر دیوی کے چہلوں میں رکھ دیا تو اسے شہ کر دینا سمجھنا ہی کہتا ہے کہ وہ درویش ہی ہوگا۔“

کئی اور آوازیں بھی شیوا کے حق میں بلند ہوئیں۔ پنڈت نول کشور سب کی سنتا رہا۔
سب اپنی اپنی کہہ چکے تو اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”دھیرج سے کام لو..... ہم شیوا کا امتحان بھی اوش میں لے گئے۔ یہ ہے کا انتظار کرو۔ میں چندرا کو سندیس بھیجتا ہوں کہ پچھلی ہمارے جال میں پھنس گیا ہے اس کا بھی کچھ حساب کتاب نکلتا ہے، اُس کے من میں بھی سوہرگ باشی امرلال مہاراج کی چٹائی آگئی ابھی تک

شک رہی ہوگی۔ وہ آجائے گا تو مل بیٹھ کر آرام سے فیصلہ کریں گے۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ ابھی تو جمیل احمد خاں پہاڑ تلے آئے ہیں، یہ بڑی مہمان شکستوں کے مالک رہ چکے ہیں، ان کے لیے کبھی انکارانی براہمان ہوا کرتی تھی، ہمارے بڑے بڑے گمانی دھیانی بھی اُس نٹھٹے ملاک کو مارنے کے کارن جان گنوا چکے ہیں۔ وہ بھی بڑی حرافہ ہے، جس کے سر پر ہوتی ہے کیوں اسی کی بات سنتی ہے، دوسروں سے سارے پرانے رشتے ناتے، تمام بندھن توڑ لیتی ہے۔ منٹھ کے خون کا بھوجن کرتی ہے، سندر تاریوں کی رگوں میں دوڑتا ہوا جوان خون اُسے زیادہ بھاتا ہے۔ بڑے بڑے پنڈت پجاری اُس کے درشن کو ترستے ہیں، کئی اُس کی آشا میں آج بھی مندلوں میں دھونی رمائے بیٹھے سندر سندر سپنے دیکھ رہے ہوں گے، جاپ کرتے ہوں گے۔ وہ بڑی شکل سے کسی کے جال میں پھنسی ہے۔ لیکن یہ مسلا بڑا بھالیہ شالی (خوش قسمت) ہے۔ "لوں شاد نے میری جانب اشارہ کیا۔" قسمت کا بڑا دھنی ہے جو بیٹھے بٹھائے وہ چنچل گجریا اس کے سر پر بیٹھ گئی۔ یہ اپنی اوقات ہی بھول گیا، سب سے پنچہ لڑانے لگا۔ بڑے عیش کر لئے اس نے، بڑی رنگ رلیاں منا چکا، بہت دھوم دھڑکا کر لیا، اب پھنسا ہے ہمارے جال میں۔۔۔۔۔ چندرا کو تو بڑے دو، پھر ہم اُس سورتی اولاد کا کر یا کرم بھی دھوم دھام سے ہی کریں گے۔"

میں صرف سن سکتا تھا، کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ وہ میری کلدیپ کی شان میں گستاخانہ جملے بولتے رہے، میں آگ پر لوفتا رہا۔ وہ انکارانی کو بھی برا بھلا کہتے رہے، میں سنتا رہا۔ انہوں نے میری قسمت کا فیصلہ کرنے میں جلد بازی نہیں کی، انہیں اُس سپنولے چندرا کا انتظار تھا جس کے باپ کو میری کلدیپ نے بڑی عبرتاک سزا دی تھی۔ اُس نے پہل نہیں کی تھی۔ آخری وقت تک امر لال سے یہی درخواست کرتی رہی کہ وہ میرے اور بدری نرائن کے درمیان سے ہٹ جائے، ہمیں آپس میں منٹ لینے دے۔ اُس نے بھی ج میں نہ بولنے کا وعدہ کیا تھا، امر لال نے کلدیپ کی بات نہیں مانی۔ وہ بے قصور تھی، میری خاطر اُس نے پوری جوانی داؤ پر لگا دی۔ میری ہی خاطر اُس نے کالی کو اپنی زندگی کی بیعت دینے کا وچن دیا تھا، وہ جب تک زندہ رہی پریم لال کی کنیا میں بیٹھی دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتی رہی۔ آج انہی دیوی دیوتاؤں کے ماننے والے اس عظیم عورت کو گالیوں سے نواز رہے تھے۔ میرے ہاتھ کھلے ہوتے، میں آزاد ہوتا تو ان کو اتنی جرأت کبھی نہ ہوتی۔ میں ان

کی زبانیں گدی سے کھینچ کر بیروں سے روند ڈالتا۔ مر جاتا لیکن کلدیپ کی شان میں گستاخی برداشت نہ کرتا۔

پنڈت نول کشور بھری دھیان بکھیرتا رہا، مجھ پر طنز کرتا رہا، گھناؤنے الفاظ استعمال کرتا رہا۔ میں خاموش کھڑا سب کچھ سننے پر مجبور تھا۔ بازی یکلفت اتنی تیزی سے چلی تھی کہ میں بھی حیران رہ گیا۔ میں نے انکارانی کا منہ قبول کیا ہوتا، اپنے گرد حصار کھینچ لیا ہوتا، اس کے اندر پاؤں جمائے کھڑا رہتا تو شاید یہ لاکاؤ نہ پلٹتا، صورت مختلف ہوتی۔

میں خاموش کھڑا اپنے خیالات میں مستغرق تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک سید مجذوب کو بھی میرے بارے میں خبر نہیں ہوئی۔ خبر ہوتی تو وہ ضرور آتا۔ نہ آتا تو دُور بیٹھے بیٹھے ہی اشارہ کر دیتا، میری مشکل حل ہو جاتی۔ یہی ممکن تھا کہ دوسروں کی طرح سید نے بھی لاپس پھیر لی ہوں، میری طرف سے مایاں ہو گیا ہو۔ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ تھا، اُس کی رہائی بہت اوپر تک تھی۔ قدرت نے اُسے دونوں ہاتھوں سے نواز رکھا تھا، دونوں کے بید بھی جانتا ہوگا۔ شاید اُسے بھی میرے انہام کی خبر ہو گئی ہو، اُس نے سمجھ لیا ہو کہ توبہ کے ہواڑے میرے اوپر بند ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی کی مداخلت کام نہیں آتی، سب بے فائدہ جاتے ہیں۔ سید بھی بے بس ہو گیا ہوگا۔ اُس نے بارہا اشاروں کنایوں میں میری اصلاح کی کوشش کی تھی، میری بدفہمی کہ اُس کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اُسے کھل کر کہنے کا اختیار نہیں تھا، میں اس کی تہہ تک ڈبکی لگانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، بات کوئی چلی گئی، اب کچھتاؤں سے کچھ حاصل نہیں تھا، بربادی شاید میرا مقدر بن چکی تھی۔ کیا کیا شکوہ کرتا؟ کس منہ سے کیا کرتا؟ انسان جو بوتا ہے وہی اُسے کاٹنا بھی پڑتا ہے۔۔۔۔۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں یو یا تھا، ہواؤں کے دھڑلے تصورات کے محل تعمیر کرتا رہا، خود بھی بھٹکتا رہا، دوسروں کو بھی بھٹکا تا رہا۔ کبھی اپنے منہ کی بات توجہ ہی نہیں کی۔۔۔۔۔ پھر کس سے شکایت کرتا۔۔۔۔۔؟

پنڈت نول کشور دل کی بھڑاں نکال چکا تو اُس نے مجھ کی تہ خانے کی کال کوٹھڑی میں ڈال دیا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ میں راستوں کا اندازہ بھی نہیں لگا سکا۔ چار گئے ہوئے جسم کے ہٹے کٹے پجاریوں نے مجھے دھکے مار مار کر کال کوٹھڑی تک پہنچایا۔ مجھ کی ہونٹیں بدبودار زمین پر اونٹنا لانا کر میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔ بیروں

میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔ زنجیر کا دوسرا سر اسنگلاخ دیوار میں لگے مضبوط آہنی کندے میں ڈال کر وزنی تالے لگا دیے گئے۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ وہ جاتے جاتے کہہ گئے تھے کہ میں نے فرار کی کوشش کی تو میرا انجام اور بھیانک ہوگا۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا، بدبو اور تعفن کے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا، اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سمجھائی دیتا تھا، میرا ذہن پھرتا رہی میں ڈوبنے لگا۔

گھپ اندھیروں میں وقت کا احساس نہیں ہوتا، نظروں میں کانٹے سے چھینے لگتے ہیں، ذہن الجھنے لگتا ہے، حُسن کا احساس غائب ہو جاتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے وقت کی رفتار بگڑ گئی ہو، ذہن منجمد ہو گیا ہو۔ کچھ بھائی نہیں دیتا، موت کی خواہش ہوتی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ زندگی ایک نعمت ہے، انہیں پکڑ کر کسی اندھیری کوشمیری میں بند کر دو، روشنی کی کوئی کرن اُن کی آنکھوں تک نہ پہنچ سکے، کوئی بات کرنے والا نہ ہو، یہ خیال بھی لاحق ہو کہ باہر دشمن کی فوج موجود ہے، فرار کا کوئی راستہ نہ ہو، ہاتھ پیروں میں اتنی زنجیریں پڑی ہوں ہر طرف تعفن پھوٹ رہا ہو، پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ زندگی کو نعمت سمجھتی ہیں یہ موت کے لئے گڑگڑا کر دُعا مانگتے ہیں۔ میں درویشوں کی بات نہیں کر رہا، اُن برگرز اور بیرونیوں کی بات بھی نہیں کر رہا جو اللہ کو محبوب ہوتے ہیں۔ پیر و فقیر کی بات بھی اور ہوتی ہے، ان کا دل میں خدا کی یاد ہوتی ہے۔ جہاں خدا کی ذات مضمحل ہو، وہاں اندھیروں کا گزر بھی نہیں ہوتا، روشنی ہی روشنی ہوتی ہے، نور کی بارش ہوتی ہے، تجلیات کا ظہور ہوتا ہے، تنہائی احساس قریب نہیں پہنکتا، فرشتے آس پاس موجود ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے اندھیر بھی روشنی سے زیادہ منور ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے جیسوں کی بات کر رہا ہوں جو سوئی چپ سے بھی کراہ اُٹھتے ہیں۔

میں بے ہوش نہ ہو گیا ہوتا تو اذیت سے دوچار رہتا، بیہوشی بھی ایک نعمت ہے۔ انسان ہر فکر سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ شب و روز کے ہنگاموں سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا میرے ساتھ بھی یہی ہوا، زمین کی سِلن اور تعفن کے سبب میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں کہہ سکتا تھا کہ بیہوش رہا؟ مجھے اس کا مطلق کوئی اندازہ نہیں ہے۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ دوسری بار یہ غفلت اس وقت ٹوٹی جب کوئی میرا ہاتھ تھام کر زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ شاید میرے دشمنوں کو میری بیہوشی بھی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ مجھے بیدار رکھنا چاہتے تھے۔ میرے ذہن

طاری غنودگی چھیننے لگتی تو میں ہاتھ جھٹک کر پہلو بدل لیتا۔ سنگلاخ اور ناہموار زمین نے میرا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ میں بیہوش رہنا چاہتا تھا، اسی کیفیت میں رہنا چاہتا تھا۔ میں مر جاتا تو پنڈت نول کشور کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے، سارے دعوے دھڑے کے دھڑے رہ جاتے۔ چند راوا پس آ کر میری سر دلاش کو دیکھتا تو وہ بھی دل تھام کر رہ جاتا۔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک امر لال کا انتقام نہ لے لے گا، کسی عورت کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ اُس کی قسم پوری نہ ہوتی تو وہ پجاریوں اور دیوداسیوں کو دیکھ کر صرف غنڈی غنڈی سانس بھر سکتا تھا، اُن کے تصور سے کھیل سکتا تھا، اُن کے قریب نہیں جاسکتا تھا۔ اُن کے کنوارے بدن کی سوندھی سوندھی خوشبو سے ہمیشہ محروم ہی رہتا۔ دوسرے مونا میلا کرتے رہتے، وہ ولد الحرام دُور بیٹھا ندیوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہتا۔ بری موت بھی ایک زاویے سے اُن کی شکست ہوتی۔ شاید اسی لئے وہ مجھے ہوش میں لانا چاہتے تھے۔

ممکن ہے وہ میرا وہم رہا ہو، وہ دشمن کا آدمی نہ ہو کوئی حشرات الارض ہو، کوئی سانپ ہو جو میری خوشبو پا کر میری کلائی پر اپنی گرفت جمائے کی کوشش کر رہا ہو، میرے آس پاس منڈلا رہا ہو، خوشی سے پھن اُٹھائے ناچ رہا ہو۔ میں اُس کے لئے ”بڑا کھانا“ ثابت ہوتا۔ اُسے ہفتوں خوراک کی تلاش میں بھٹکانا پڑتا۔ مجھے سمجھنا لگنے میں اُسے دقت ضرور پیش آتی، میں اُس کے لئے بھی ”لوہے کا چنا“ ثابت ہوتا۔ لیکن وہ پھر بھی اپنی کوششوں سے باز نہ آتا۔ سانپ کی بجائے کوئی نیولا بھی ہو سکتا تھا، کوئی گھونس جو پتھروں کے اندر ہی اندر سرنگ ٹھونسنے کا کام اتنی مہارت اور چابکدستی سے کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ نول کشور کے گرگوں نے کوئی ایسا موذی جانور پال رکھا ہو جو قیدیوں کو سکون کی فیندہ نہ سونے دے۔ وہ میرا روندنا ہوا احساس بھی ہو سکتا تھا، نیند اور بے چینی کے درمیان کشمکش ہو تو حواس خود بخود طرح سے معطل نہیں ہوتے، کوئی ایک جس دوسری جس پر غالب آتی رہتی ہے۔ کبھی بھی باہر سے بھی یہ خیال گزرتا ہے جیسے کوئی شے جسم پر تنک رہی ہو، کوئی بدن کو چھو رہا ہو!

میں بھی ٹوٹتی ہوئی غنودگی کے عالم میں امکانات کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ لیکن ایک بار پھر جب کسی نے مدھم آواز میں میرا نام لے کر آواز میں سسپانے لگا۔ ”کون ہے؟“ میں نے جھلا کر پوچھا۔ ”کون ہے جو میرے سکون کو برباد کر رہا ہے؟“

”ایک نسوانی آواز میری قوتِ ساعت سے ٹکرائی۔“ دیر مت کرو، دیر ہوگئی تو تمہارا ساتھ میں بھی ماری جاؤں گی۔“

”کون؟“ میں نے اُس آواز کی بازگشت کو شناخت کرنے کی کوشش کی۔

”مم..... میں ہوں مہاراج جھرنہ۔ اُن خالوں نے میری ماں کو کالی کے چہنوں پر بھینٹ چڑھا دیا، وہ مجھے بھی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں اُن کے ہاتھ لگ گئی تو وہ دشت میرے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کریں گے۔“

خلاف توقع جھرنہ کی آواز سن کر میں چڑھ کر اٹھا..... پاؤں میں پڑی زنجیریں بھی جاگ اٹھیں۔

”آہستہ مہاراج..... آہستہ۔“ جھرنہ نے سرگوشی کیا۔ ”چار پانچ منٹ سے باہر بھی پہرہ دے رہے ہیں، انہیں خبر ہوگئی تو دروازہ کھول کر اندر آ جائیں گے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، ہاتھ بڑھا کر گھپ اندھیرے میں جھرنہ کے کسن جسم کے نقیب و فراز کو ٹٹولنے لگا۔ اس عمل میں کسی نفسانی خواہش کو دخل نہیں تھا، وہ میری میری تزئین سے بھی چھوٹی تھی، اُس کے بارے میں کوئی برا خیال دل میں نہیں لاسکتا تھا۔

محسوس کرنا چاہتا تھا کہ میں زندہ بھی ہوں یا مر چکا ہوں؟

”کیا کرتے ہو مہاراج.....؟“ جھرنہ نے پھر خطروں کا احساس دلایا۔ ”ہمارے ہاں سے بہت کم ہے۔“

”تم..... تم نول کشور کے آدمیوں سے بچ کر یہاں تک کیسے پہنچ گئیں؟“ میں نے نول

کر اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”جس راستے سے آئی ہو اُسی راستے سے واپس چلی جاؤ۔ ہو سکے تو ایک دو روز کسی محفوظ مقام پر چھپی بیٹھی رہو۔ ابھی پنڈت

پجاریوں کو تمہاری تلاش ہوگی۔ دو چار روز میں تھک کر بیٹھ جائیں تو کالی کے مندر سے لگے دُور چلی جانا۔ ہر دُور بھی تمہارے لئے محفوظ نہیں ہوگا۔ سمجھ رہی ہو میری گڑباز، میں تمہیں

سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں؟ جلدی سے واپس بھاگ جاؤ۔“

”تم غلط سمجھ رہے ہو مہاراج.....“ اُس نے بدستور مدھم آواز میں کہا۔ ”میں مندر

اندہر نہیں تھی۔ جب وہ تم پر لٹھ برسا رہے تھے اُس وقت میں مندر ہی میں تھی، وہ تمہیں لے چلے گئے تو میں کوائر میں گئی، وہاں میری ماں نیم بیہوش پڑی تھی۔ میں اُس سے لپٹ

میں نے اُس کو لگا جلا پلانے کی کوشش کی، اُس نے لنگا جلا بھی نہیں پیا، جب تک ہوش رہا وہ بار بار ایک ہی جملہ دہراتی رہی..... بھاگ جا جھرنہ، بھاگ جا..... مندر سے دُور چلی جا۔ کہیں چھپ کر بیٹھ جا۔ میرے بعد وہ تیرا بھی براہِ شر کریں گے۔“

”پھر..... پھر کیا ہوا.....؟“

”میں ماں کے کہنے پر سہم کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے لاٹھی بھی اٹھالی جسے تم نے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر کسی نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو اسی لاٹھی سے اس پاپی کا سر پھوڑ دوں گی۔ لیکن وہ سب تمہارے چکر میں لگے تھے۔ میں کسی نہ کسی طرح چھپتی چھپاتی مندر سے نکل گئی۔“

جھرنہ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ شاید دیوانی ہوگئی تھی۔ اُسے غالباً اپنی ماں کے ہولناک انجام کی تفصیل معلوم ہوگئی تھی۔ وہ تاب نہ لاسکی، پاگل ہوگئی۔ پاگل نہ ہوتی تو بیکی بیکی باتیں نہ کر رہی ہوتی..... وہ اگر مندر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی تو پھر اس نے دوبارہ اسی مقتل گاہ میں پلٹ کر آنے کی حماقت کیوں کی جہاں اُس کی بے قصور ماں کے برہنہ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے تھے.....؟

میں ماں ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ مندر سے نکلنے میں کامیاب ہوئی ہوگی۔ صرف پنڈت نول کشور ہی نہیں اور بھی سینکڑوں پنڈت پجاری اُس کی کسن جوانی پر دانت جمائے بیٹھے تھے، وہ بڑے پردہ کی وجہ سے خاموش تھے لیکن جب ہنگامہ ہو تو ہر طرف لوٹ مار شروع ہو جاتی ہے۔ جس کے ہاتھ جو لگتا ہے وہ اسے مالِ غنیمت سمجھ کر لے بھاگتا ہے۔ جھرنہ تو کھرا سونا تھی جس کی چمک دلت نے کالی کے مندر میں ہر طرف اپنے پرستاروں کی فصل اگا رکھی تھی، وہ جتنا کہ کہنے پر ضرور بھائی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اُس نے میری لاٹھی بھی اٹھالی ہو، لیکن وہ مندر سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ کالی نے کسی نے ہمت سے کام لے کر اسے راستے میں ہی دیوبچ لیا ہوگا، ہنگاموں سے فائدہ اٹھا کر اسے بھی ضرور لوٹا کھوٹا گیا ہوگا۔ دسترخوان بچھا ہو، دعوتِ عام ہو تو ندیدے ٹڈی دل کی طرح لوٹ پڑتے ہیں۔ جن کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں وہ بھی ”مالِ مفت دل بے رحم“ کے صدق دو چار لقمہ ضرور ہر مار کر لیتے ہیں۔ جھرنہ کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا۔ جہاں لنگر جاری ہو وہاں کون تکلف کرتا ہے؟ ”غریب کی جو رو سب کی بھابھی“ بننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جھرنہ حملہ

کے دہشت میں بہت سارے خطرات ابھرے ہوں گے۔ وہ میری مدد کی خاطر مختلف پہلوؤں پر غور کر رہی ہوگی۔ اُس کا بس نہیں چل رہا ہوگا، جھرتا کو مندر سے نکلتا دیکھ کر اُس کی آنکھیں چمک اٹھی ہوں گی۔ وہ کسی اور پر بھی اعتماد کر سکتی تھی، کسی پنڈت پجاری کو دوبارہ معمول بنا سکتی تھی۔ لیکن اُس نے جلد بازی کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ جھرتا اور جمن سے وہ میری باتیں سن چکی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جھرتا میرے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوگی۔ وہ آنے والے وقت کے بارے میں بھی صحیح اندازے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اُس نے کئی بار کہا تھا کہ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ کچھ مجبوریاں لاحق تھیں جو وہ زبان نہیں کھول سکتی تھی۔

بہر حال، انکارانی کو یقین رہا ہوگا کہ جھرتا دشمنوں کے ہاتھ نہیں آ سکے گی۔ وہ اُسی کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اور آخر کار اُس کی لازوال قوتوں نے جھرتا کو میرے پاس بھیج دیا۔ سب اُس کی براسر قوتوں کے سامنے اندھے ہو گئے، پریم لال نے انکارانی کو جو اضافی قوتیں دان کی تھیں وہ حیرت انگیز تھیں۔

پہلے مجھے شبہ تھا، جھرتا کی بات سن کر یقین آ گیا کہ میرے ہاتھ میں جو لائٹ تھی وہ میرے مجذوب ہی کا دیا ہوا تھک تھا۔ میں نے اُسے آزمانے کی خاطر زنجیر پر لٹکی سی ضرب لگائی، میرا دل خوشی سے اُچھل پڑا۔ زنجیر ٹوٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے، اس لئے لائٹ زنجیر تک لے جانے میں مجھے کچھ دشواری ضرور ہوئی۔ لیکن زنجیر کے ساتھ ساتھ میرے ہاتھ بھی بندشوں سے آزاد ہو گئے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری توانائی بھی آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میرا ہاتھ تمام لومہاراج.....“ جھرتا نے کہا۔ پھر خود ہی ہاتھ بڑھا کر میری کلائی تھا۔ لی۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے لائٹ اٹھا کر دروازے سے ٹکائی، ہلکا سا زور دیا تو وہ نوٹ کر پڑا۔ باہر روشنی ہو رہی تھی۔ چار بٹے کئے پجاری لٹھ لئے ایک تخت پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے، انہیں دروازہ ٹوٹنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ صرف اندھے نہیں ہوئے تھے، گھوٹے بہرے بھی ہو گئے تھے۔ جھرتا میرا ہاتھ تھا سے تیز قدم اٹھانے لگی۔ کئی پُر پیچ راستوں سے گزر کر ہم کھلے آسمان کے نیچے پہنچ گئے۔ ہر طرف پنڈت پجاری گھوم پھر رہے تھے۔ پجاریں اور دیوداسیاں بھی منگتی پھر رہی تھیں۔ کسی کی توجہ ہماری جانب مبذول نہیں ہوئی۔

میں انکارانی کی بے شمار حیرت انگیز قوتوں کا چسکا رو دیکھ چکا تھا۔ وہ نامکن کو ممکن بنا دینے کی ہادی تھی۔ جو کچھ اس وقت میرے ساتھ گزر رہی تھی، مجھے اس پر بھی کوئی تعجب نہیں ہوا۔ یہ ساری مخلوقات ایسی ہیں جو عام انسانوں کو نظر نہیں آتیں لیکن ان کے وجود سے انکار سمجھ لیا جاسکتا۔ بھوت پریت..... چڑیل اور مکمل پیروں کا تصور خیالی ہو سکتا ہے، کچھ لوگ نرم بھی کھاتے ہیں کہ ان کا واسطہ شیطانی بدروحوں سے پڑ چکا ہے۔ وہ بڑی عجیب و غریب اور مختلف شکلوں میں نظر آتی ہیں۔ جنات کے وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ مختلف اشکال میں سامنے آنے کی قوت رکھتے ہیں۔ قدرت نے انہیں ذہیل دے رکھی ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگوں کے نظریات اور عقائد بھی مختلف ہوتے ہیں۔ وہ بھی کچھ ایسا توں پر یقین رکھتے ہیں جنہیں انسانی ذہن قبول نہیں کرتا۔ آپ کس کس کو جھٹلاتے پھر گئے، کس کس بات کی نفی کریں گے؟..... میں اس بحث میں اُلجھتا نہیں چاہتا۔

ابلی کے مندر کی کھلی فضا میں آ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری توانائی سید کی کر لائی لائٹ سے بحال ہو چکی تھی، مجھے وہ ظلم یاد آئے جو مجھ پر ستون کے ساتھ رسیوں سے لٹکا کر ڈھائے گئے تھے۔ پنڈت نول کشور کی گندی زبان سے ادا ہونے والے جملے میرے دماغ میں گونجنے لگے۔ پنڈت پجاریوں کی خرمستیاں بچھو بن کر میرے جسم سے لپٹ لگ گئیں۔ ہمارا کام ایک انجام، اُس کی آخری لپکی مجھے آواز دینے لگی۔ وہ بدغیب مجھے پناہ دینے کے جرم میں ہادی لگئی۔ اُس وقت میں بے بس تھا۔ اب آزاد تھا۔ سید کی لائٹ بھی میرے ساتھ تھی۔ میں نے اپنا رخ پنڈت نول کشور کی پناہ گاہ کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ جھرتا نے میرا ارادہ بھانپ لیا۔ ہو سکتا ہے انکارانی نے اُس کے ساتھ ذہنی رابطہ برقرار رکھا ہو، اُسے میرے خطرناک ارادے سے باخبر کر دیا ہو۔

”کی اور دشمن جانے کی مت سوچو مہاراج.....“ جھرتا نے اپنی رفتار بدعا دی۔ ”سے پورا ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ ہم باہر نہیں نکل سکے تو دوبارہ دھڑلے جائیں گے۔“ ”جھرتا.....“ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔ ”تم جس بلا سے کٹ کٹ، ہمتی پناہ گاہ کی بات کر رہی تھیں، کیا اس وقت بھی وہ تمہیں نظر آ رہی ہے؟.....“ ”نہیں باتیں کرتے ہو.....؟“ اُس نے مجھے گھور کر کہا۔ ”وہ کالی کے مندر میں خود آ سکی تو کون کون مجبور کرتی؟.....؟“

”میں نے کہا تھا..... پہلے کچھ دیر سنا لو، پھر آرام سے باتیں بھی ہوتی رہیں گی.....“
اُس نے کھل کر میری بات کا جواب دینے سے گریز کیا۔

میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا، اسی وقت ایک گاڑی تیزی سے قریب آ کر رُکی۔
اسٹیرنگ سیٹ پر آنند بھون کا میٹر بھنڈاری نظر آ رہا تھا۔ اُس نے نیچے اتر کر میرے لئے
پچھلا دروازہ کھولا۔ میں جھرنات کا ہاتھ تھام کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ انکا میرے سر سے اتر
کر جھرنات کے سر پر چلی گئی۔

میرے ذہن میں انکارانی کے وہ آخری جملے گونجنے لگے جو اُس نے جھرنات کے بارے
میں کہے تھے.....!!



KHAN BOOKS

STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 5356532
PROP: ALI KHAN

میں لا جواب ہو گیا۔ میں نے مندر کی عمارت کی سمت دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔
”چند نول کشور، میں اس وقت تجھے چھوڑے جا رہا ہوں۔ تم نے اور تیرے حرام کے
جنے ساتھیوں نے میرے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے وہ میرے دل پر نقش ہے۔ تو بھی یاد رکھنا
..... میں پھر واپس آؤں گا۔ جب تک پانی پانی کا حساب چکنا نہ کر لوں، چین سے نہیں
بیٹھوں گا۔ چندرا کو سندھ کی گلی سے بھی بلوا لے۔ تم دونوں کی اچھی ایک ساتھ اٹھے گی تو
تمہارے ساتھیوں کو بھی دوبارہ ملے گا۔ جانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ چندرا سے
یہ بھی کہہ دینا کہ اُس کا باپ امزلال مر گیا ہے تو اُس کا غم نہ کرے۔ اُس کا ایک باپ میری
فکھل میں ابھی زندہ ہے۔ اُس کی چتا کو میں اپنے ہاتھوں جلتی ہوئی لکڑی دکھاؤں گا..... کچھ
رہا ہے میری بات کا مطلب.....؟“

میں دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔ جھرنات نے تیز تیز قدم اٹھانے کی بجائے دوڑنا شروع کر
دیا۔ میں بھی اُس کا ساتھ دینے لگا۔ شاید جادو کے پتارے کے ٹوٹنے کا وقت قریب آ رہا
تھا۔ ہم ہنسنا لگتے ہوئے کالی کے مندر کے پھاٹک سے باہر نکلے۔ انکارانی میرے سر پر آ
گئی۔ اُس کا چہرہ خوشی سے تھمرا ہوا تھا۔ وہ مجھے بولی والہانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
”انکارانی.....“ میں نے سر آہ بھر کر کہا۔ ”تمہارا بیدار احسان میں زندگی بھر.....“
”غیریت کی باتیں مت کرو جیل.....“ وہ چھٹک کر میرے شانے پر آ گئی۔ میرے
گال پر اپنی نرم نرم انگلیاں پھیر کر بولی۔ ”دوستوں حساب ہمیشہ دل میں ہوتا ہے..... دل
کی باتوں کو زبان تک نہیں لایا کرتے۔“

”اب کیا ارادہ ہے.....؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔
”جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔ لیکن کچھ دیر سنا لو، مجھے بھی کچھ سوچنے کی مہلت دو۔“
”رنا کا کیا بنے گا.....؟“ کہا نے پوچھا۔

یہ بے سہارا اب کہاں جاتے ہی جیل.....؟“ انکا کی غمور آنکھیں نمناک ہونے
لگیں۔ ”جہنم نے تمہارے ساتھ جو مہربانی کی تھی، ہمیں اُسے بھی نہیں بھولنا چاہئے۔ تم
پیشانی مت ہو۔ میں اسے فی الحال کسی محفوظ جگہ پہنچاؤں گی۔ تم اپنے جھیلوں سے فارغ
ہو لو تو پھر یہ تمہارے پاس واپس آ جائے گی۔“
”کیا مطلب.....؟“ میں نے چونک کر انکارانی کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”تم مجھے نالنے کی کوشش کر رہی ہو.....؟“ میں نے شکوہ کیا۔
 ”خدا کرنے کی عادت بدلنے کی کوشش کرو جیل.....“ اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”میں نے تم سے کہا تھا کہ مہان شکلیوں نے بہت سے پروے میری نظروں کے سامنے سے ہٹا رکھے ہیں۔ میں مستقبل میں جھانک سکتی ہوں لیکن زبان نہیں کھول سکتی۔ اسی لئے میں نے کالی کے مندر میں داخل ہوتے سے تم سے کہا تھا۔ میں صرف مشورہ دے سکتی ہوں۔ یاد ہے تمہیں.....؟“

”کیا کہا تم نے.....؟“ میں نے چونک کر اُسے تیز نظروں سے گورا۔ ”کیا تم جانتی تھیں کہ کالی کے مندر میں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟“
 ”ہاں.....“ اُس نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ ہونٹ چبانے ہوئے بولی۔ ”میں زبان کھول دیتی تو بھی وہی ہوتا جواب ہوا ہے۔ البتہ میں تم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتی۔ پھر شاید کبھی ہمارا ساتھ ممکن نہ ہوتا.....“

”میں سمجھا نہیں.....“ میں نے پہلو بدل کر اُسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔
 ”تمہیں یاد ہے جیل، میں نے تم سے کہا تھا کہ جب تک پریم لال مہاراج کی آتما میرے منہ سے دستبردار نہ ہو جائے، دھرتی کا کوئی دوسرا پنڈت یا پجاری مجھے کسی بھی شکلی یا جاپ منتروں کے زور سے اپنانے کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔“ اُس نے کسمسا کر جواب دیا۔
 ”اب اُسے آتما چلا لیا گیا ہے..... دھرتی سے اُس کی آتما کے تمام سمبندھ بھی ٹوٹ چکے ہیں۔“

”کیا مطلب.....؟“ اُنکا کے منہ کا مفہوم میرے اضطراب میں اضافہ کرنے لگا۔
 ”مجھے بتاؤ انکارانی۔ کیا پریم لال کے بعد اب کوئی اور پنڈت یا پجاری تمہیں حاصل کرنے کے لئے کہیں چوروں کی طرح چھپا بیٹھا جاپ کر رہا ہے.....؟“
 ”ابھی سے پریشان مت ہو.....“ اُس نے بڑی لگاؤ سے جواب دیا۔ ”پہلے پنڈت نول کشور اور چندرا کا حساب چکنا کرلو، پھر دیکھا جائے گا۔“

انکارانی نے کھل کر میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اُس نے وضاحت مناسب نہیں سمجھی تھی، لیکن میرے وجود میں بچھوؤں نے ڈنک مارنا شروع کر دیا، لوگوں میں سنسنائٹ

وقت کی طنائیں میرے ہاتھ میں اُس کے ایک بار پھر بام مچھلیوں کی طرح نکل گئیں۔ وہ میرے جال میں آگئے تھے، انکارانی نے کالی کے منہ میں میرا داخلہ ممکن بنا دیا تھا۔ میں صرف قدم جما کر ڈوری کھینچ لیتا..... ساری مچھلیاں پھنس جاتیں۔ وہ مگر مجھ بھی ہاتھ آ جاتا جو دلدل میں چھپا بیٹھا دوسروں کی جانوں کا زیاں کر رہا تھا۔ میں اُس کا کریا کرم کر کے ہاتھ جھاڑ لیتا۔ سپہ سالار مار دیا جائے تو فوری طور پر کمان سنبھالنے کے سبب پہلا ہی اختیار کرتے ہیں۔ کوئی مجھ سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہ کرتا۔ ایک چندرا لال رہ جاتا میرے ہی کھاتے میں۔ میں اُس کے پیچھے لگ جاتا۔ انکارانی نے کہا تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ رہتا ہے جو گویا ہے جہاں اُس کی نظریں نہیں پہنچ پازنی تھیں۔ کچھ دوسری قوتیں بھی چندرا کا ساتھ دے رہی تھیں۔ انکا کی دور بین نظروں کے سامنے زکاوٹیں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ اُس نے میرے استفسار پر یہی بتایا تھا۔

پنڈت نول کشور کو مارنے کا ایک سنہری موقع بھی ہاتھ آ کر نکل گیا۔ میں آنند بھون کے کمرے میں بیٹھا حالات پر غور کر رہا تھا جب انکارانی میرے سر پر آ گئی۔ مجھے جھرتا کے بارے میں اُس کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

”جھرتا اس وقت کہاں ہے.....؟“ میں نے سنبھل کر گفتگو کا آغاز کیا۔
 ”میں اُسے ایک انا تھ آشرم میں چھوڑ آئی ہوں۔ وہاں وہ دوسرے ہم عمر بچوں کے ساتھ رہے گی تو اُس کا دل بہلتا رہے گا۔“

”تم نے کہا تھا کہ میں جھیلوں سے نمٹ لوں تو وہ پھر میرے پاس آ جائے گی؟“
 ”جو بھوش میں لکھ دیا جائے اسے سے آنے سے پہلے کوئی نہیں جان سکتا۔“ انکا سنجیدگی سے بولی۔ ”انسان اگر آنے والے کل کے بارے میں سب کچھ جان لیتا تو پھر جھگڑا اس بات کا رہ جاتا؟ سارے ہنگامے، جھگڑے، فساد ختم ہو جاتے۔ ہر طرف امن و شانتی نظر

شریں ہو گئی۔ مجھے میری قوتیں واپس مل چکی تھیں، سید مجذوب کی لاشی بھی معجزاتی طور پر میرے پاس آگئی۔ اگر جمنہ کے بعد جھرتا بھی میرے دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتی تو اُس کا انجام بھی یہی ایک ہوتا۔ پھولوں کی مہک ختم ہو جائے، اُس کی پگھلیوں کا ٹھنڈا اثر ختم ہونے لگے، وہ مر جھڑک لگتیں تو پھر انہیں گلدانوں سے نکال کر کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے۔ کارے نکال کر کوڑے دان میں مل دیا جاتا ہے۔ میرے دشمن بھی جھرتا کا رس نکالنے میں بڑی عجلت سے کام لیتے (جھوک رہ جاتا تو وہ اُسے بھی کڑے کڑے کر کے کہیں گٹر میں ڈال دیتے، کسی اندھے کنوئیں میں پھینک دیتے، دریا برد کر دیتے۔ لیکن میری قسمت کی خوش نصیبی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ جھرتا بھی لاشی ہو گئی، سید کی متبرک لاشی بھی دوبارہ میرے ہاتھ آگئی۔ ننڈا اور کپالا کی قوتیں بھی میرے پاس آگئی۔ انکارانی نہ ہوتی تو طاقت کے توازن میں کوئی فرق بھی نہ پڑتا۔ مگر بات طاقت کی نہیں، محبت کی تھی، قرب کی تھی۔ ایک تعلق کی تھی جو چوتھائی صدی سے زیادہ پر محیط تھا۔ وہ میرے وجود کا ایک حصہ بن گئی تھی، میں اُس کی خاطر کئی بار جان کی بازی لگا چکا تھا۔ جب رفاقتوں میں ایک ہی جیسے خون کارنگ جھلکنے لگے تو سودو زیاں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ایک پسندیدہ گلاس بھی ہاتھ سے پھسل کر ٹوٹ جائے تو اس کی یاد ذہن میں مدتوں کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ انکارانی تو میری رگ رگ میں سا پچکی تھی، میری روح میں کھل گئی تھی۔ میں اُس کی جدائی کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

میں اُس سے بار بار اصرار کرتا رہا کہ وہ مجھے اُس پنڈت یا پجاری کا نام بتا دے۔ وہ بہانے تراشتی رہی۔ میں رُوٹھ گیا تو بڑی حسرت سے بولی۔ ”جیل..... تم مجھ سے ناراض مت ہوا کرو۔ ہنتے بولتے رہا کرو۔ تم اُداس ہوتے ہو، خفا ہو جاتے ہو تو مجھے اپنی زندگی بھی پھینکی پھینکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ تم جذبیوں اور احساس کی بات کرتے ہو، میں ان خوبصورت لفظوں کے معنی نہیں سمجھتی۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اب میرے تمہارے درمیان کوئی اور آیا تو بات میری برداشت سے بھی باہر ہو جائے گی۔ طاقت کا توازن بگڑ جائے تو کبھی کبھی خیف دشمن بھی اپنے سے جری حریف پر موت بن کر جھپٹ پڑتا ہے۔ اُسے اپنے انجام کی نہیں، اپنی بقا کی فکر جنون کی حدوں سے گزر جانے پر اُکسا دیتی ہے۔ سمجھ رہے ہو تمہاری انکارانی تم سے کیا درخواست کر رہی ہے.....“

”انکا.....“ میں اُس کے پیار کی تپش، اُس کے خلوص کی گہرائی سے کھینچنے لگا۔ ”اب صرف تم ہی تو رہ گئی ہو جس کی باتیں میرے کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ کبھی کبھی حالات مجھے بارود کی طرح چنگاری دکھا دیتے ہیں، میں اپنے ہوش و حواس کو بیٹھتا ہوں۔ تمہیں بھی اپنے زہریلے جملوں سے ڈکھ پہنچانے لگتا ہوں۔ لیکن جو اپنے ہوں، اُنہی پر مان بھی ہوتا ہے، شکوہ شکایت بھی اُنہی سے کی جاتی ہے۔ غیر آنسو پونچھنے کی کوشش کہاں کرتے ہیں؟ بھرتی آگ کو اور ہوا دیتے ہیں۔ تم مجھے معاف کر دیا کرو۔ زنگس، انکارانی، کلدیپ سب ہی ساتھ چھوڑ گئے۔ قسمت کی بد نصیبی دیکھو، میں لندن سے واپس کے بعد ابھی تک اپنی تربیت سے بھی نہیں مل سکا۔ اب اگر تم بھی.....“

”ماپوسی کی باتیں مت کرو جیل۔“ اُس نے بڑے پیار سے کہا۔ ”ہمت سے کام لو۔ سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔“

”نہ ہوں تب بھی پنڈت نول کشور کو زندہ چھوڑ کر ہر دور سے واپس نہیں جاؤں گا۔ میرے ذہن میں پھر میرے دشمن دشمنوں میں پڑے کیڑوں کی طررا بلبلائے لگے۔“

”تم سے جانے کی بات کون کر رہا ہے.....؟“

”چندرا کا کوئی سراغ ملا.....؟“ میں نے دلی زبان میں سوال کیا۔

”نہیں ملا تو اب مل جائے گا.....“ وہ خلاء میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

”میں سمجھتی ہوں..... اب کیا فرق پڑ گیا.....؟“

”اب اندھیروں کے چھینے کا وقت قریب آ رہا ہے۔“ اُس نے بدستور خلاء میں گھورتے ہوئے یقین سے کہا۔ ”کچھ دن اور اٹھارہ گھنٹے، چندرا زیادہ دیر تک میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا.....“

”ایک بات پوچھوں..... بتاؤ گی؟“ میں نے اُس سے رازداری سے مخاطب کیا۔

”کیا جاننا چاہتے ہو.....؟“ وہ میری جانب متوجہ ہو گئی۔

”جو تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کر رہا ہے اُس کا چاہا کب شروع ہوا؟ کتنے دن باقی

رہ گئے ہیں؟“ میں محسوس لہجے میں بولا۔ ”تربیتی اور دوسرے چاندلوں نے تمہیں مجھ سے

بار بار چھیننے کی کوشش کی، وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ لیکن اُس وقت بات اور تھی۔ اب میں

خالی ہاتھ نہیں ہوں، میرے ترکش میں بھی کئی تیر موجود ہیں، تم واقف ہو، میں نہیں پہچانے

کی خاطر آخری دم تک اُن کی باتیں پڑ پکڑ کر منزل سے باہر کھینچتا رہوں گا۔ آسانی سے ہلے۔ حکم نہیں کروں گا، انہیں بھی دانتوں پسینہ آجائے گا۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو، تم مجھے اندھیرے میں نہیں رکھو گی۔“

”جیل.....“ ایسی باتیں مت کرو۔“ اُس کے جذبات میں بھی طوفان اُٹھنے لگا۔ میرے بالوں میں لپٹ کر چلنے لگی۔ کچھ توقف کے بعد اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کی نیل کنول آنکھوں میں گلابی دھندلے تیر رہے تھے۔ میری نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بیٹھنے لہجے میں بولی۔ ”کاش میں مکمل عورت ہوتی تو اس وقت تمہیں اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیتی، دل بھر کر تمہیں پیار کرتی، دل کی دھڑکوں میں چھپا لیتی، تمہیں اپنا سینہ چیر کر دکھاتی کہ اس میں صرف تم ہی تم ہو، کوئی اور نہیں ہے۔ ایسی ہی پیار محبتیں مٹھی باتیں کرتے رہا کرو۔ میں نے شروع شروع میں بس یوں ہی تمہارے سر کا انتخاب کیا تھا تم نے رام دیال کی ماں کی بات نہیں مانی، پنڈتوں نے اُس سے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ تم اگر چاہتے تو ایک چھوٹے سے جاپ کے ذریعے بھی مجھے حاصل کر سکتے تھے، تم نے انکار کر دیا۔ مجھے تمہاری بات اچھی لگی۔ چھوٹے موٹے پرندے بھی سردی، گرمی اور برسات سے بچنے کی خاطر ہلکے گھونسل بنا لیتے ہیں، میں نے تمہارے خوبصورت بالوں میں بیرا کر لیا۔ میں تمہیں آزاد چاہتی تھی۔ تمہیں اپنے دفتر کا وہ مونا کرچین آفیسر یاد ہے جس نے دیر سے دفتر پہنچنے پر دفتر میں بلا کر تمہاری بے عزتی کی تھی۔ تم نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تو کسی بد کے ہوئے سائڈ کی طرح منہ سے جھاگ اُڑانے لگا۔ آہستہ سے آگے کرنا..... نو ماپھی..... ہم ٹم کو ابھی ڈس مس کرنا..... اپنا پکار لو اور گٹ آؤٹ ہو جاؤ..... ہم کچھ نہیں سننا مانگنا..... تم خاموش ہو کر جانے لگے۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ مجھے اُس وقت انسانی خون کی فوری ضرورت تھی۔ بس..... مجھے اُس کا تمہاری بے عزتی کرنا برا لگا تھا..... میں نے تمہارے ہاتھوں اُس کو موت کے گھاٹ اُترادیا۔ پھر بات بڑھتی چلی گئی۔ اور آج..... یوں لگ رہا ہے کہ اگر میری زندگی میں نہ آتے تو میرا ڈیڑھ بالشت کا وجود بھی ادھورا ہی رہ جاتا۔ شاید میں.....“

انکارانی اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔ اُس کے شرماتے لہجے پر اچانک ایک ساہ کپکانے لگا۔ وہ ہم کر تیزی سے میرے سر سے اُتر گئی۔ میں مضطرب ہو گیا۔ میں اُس سے اچانک چلے جانے کے بارے میں غور کرنا چاہتا تھا جب ایک مانوس آواز میرے کانوں

میں گونجی..... میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا، سید ایک کرسی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ گنجان داڑھی کے اُلھے ہوئے بالوں میں خوراک کے ذرات اٹکے ہوئے تھے۔ وہ بار بار ”ہو حق..... ہو حق..... حق اللہ“ کے نعرے لگا رہا تھا۔ میں اُسے عاجزانہ نظروں سے گھورنے لگا۔

”ایسے مت دیکھا کر..... دیدے پھٹ جائیں گے.....“ اُس نے رازداری سے کہا۔ ”وقت گزرتا جا رہا ہے سید۔“ میں نے التجا کی۔ ”رستی تھام کر لنگ جا..... ڈگڈگی، بھانا شروع کر دے.....“ وہ اپنے انداز میں بولنے لگا، پھر نظریں چکا کر کہا۔ ”چلی گئی..... پھر بھاگ گئی۔“ ”وہ بھاگی نہیں.....“ میں نے سنجیدگی سے اُسے یقین دلایا۔ ”اُس نے تمہارا احترام کیا ہے۔“

جواب میں سید نے ایک غضبناک قہقہہ لگایا۔ پھر سر کھجانے لگا۔ ”وہ میرے ہاتھ آ کر نکل گیا.....“ میں نے کہا۔ ”میں مر جاؤں گا لیکن اُس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔“

”کس کی بات کر رہا ہے مخلوط الحواس؟..... بے دُم کے بندر؟“ سید کی آنکھیں پٹپٹانے لگیں۔ ”وہی جو مندر میں چھپا بیٹھا ہے..... دوسرا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔“ میں نے آواز میں رقت پیدا کی۔ ”میں ہنسا کر دو..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُن دونوں کو ختم کرنے کے بعد خاموشی اختیار کر لوں گا۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ایک بار پہلے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے زبردستی مجھے باتیں پکڑ کر پھر میدان میں کھینچ لیا۔“

”آبادی چھوڑ کر جنگل کی طرف بھاگنے والے کسی اونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ جا.....“ سید کے لہجے میں درہنگی اُتر گئی۔ ”ڈال ڈال پات پات چلنا بند کر دے۔“ ”تمہاری بہم باتیں مجھے دیوانہ کر دیں گی۔“ میں نے لہجہ لگا کر ”جو کچھ کہتا ہے صرف ایک بار مکمل کرو واضح الفاظ میں کہہ دو۔ تمہاری پیچیدہ باتیں میرے سر سے گزر جاتی ہیں۔“ ”سر میں کٹکھی کیا کر.....“ سید دیدے بچانے لگا۔ ”کدو کا تیل چھوڑ دے۔“ ”مم..... میں اپنی جان دے دوں گا۔“ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میرا خون تمہارے نام

”لکھا جائے گا۔“

سید اچیل کرسی سے اٹھ گیا۔ دیوانوں کی طرح مجھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”میل کے دہانے پر کھڑے ہو کر دے..... چھوٹے بوکھلا کر باہر نکل آئیں گے..... پھر.....
پھر تو تالی بجانا..... تھر کنٹرا شروع کر دے“

”تمہیں خدا کا واسطہ سید..... میں نے ہاتھ جوڑ لئے۔“ صرف ایک بار میری کھائی
تھام کر سیدھا راستہ دکھا دو..... میں دوبارہ پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھوں گا..... میری بات کا
یقین کرو۔“

”گھنگھور گھٹائیں..... کالی بدربیا..... برم جھم.....“ سید اچھے آپ سے ہم کلام نظر آرہا تھا۔ پھر یکنخت وہ جھمکے لگانے لگا۔ ”آرہا ہے..... آرہا ہے.....“ نشہ چھا رہا ہے۔“

میں تیزی سے لپکا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ سید سے لپٹ جاؤں گا اُس کے چہرہ پر
لوں گا۔ شاید اُس کو مجھ پر رحم آجائے۔ مجھے یقین تھا کہ جس دن وہ مجھ پر مہربان ہوگا
میرے سارے دل در دُور ہو جائیں گے۔ ساری مشکلات دُور ہو جائیں گی۔ وہ مجھ کو بچ
خدانے اُس کو اپنی نگاہِ کرم سے نوازا دیا تھا۔ اُس کا ایک بار ہاتھ آجانا شرط تھا، پھر میں اُسے
آسانی سے نہ چھوڑتا۔ یا وہ میری درخواست قبول کر لیتا یا میں اُس کے قدموں میں سر نکرا
نکرا کر جان دے دیتا۔

سید میرا ارادہ بھانپ گیا..... قبل اس کے کہ میں قریب جاتا، وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تڑپا رہ گیا۔ وہ پھر اپنی بولی بول کر چلا گیا۔ میں ڈور کا سراٹھلاش کرنے میں اُلجھنے لگا۔ اُس کے اشارے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ وہ حکم خداوندی کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے پردے چاک کرنے کی جسارت اُس میں بھی نہیں تھی۔ وہ بار بار میرے سامنے آ جاتا تھا، پھر پلک جھپکتے میں نظروں سے غائب ہو جاتا تھا۔ اُس کی آمد و رفت بلا سبب نہیں تھی۔ اُسے مجھ سے لگاؤ نہ ہوتا تو وہ یونہی اپنا وقت کبھی برباد نہ کرتا۔ اُس نے محض تفریحاً اپنی لالچی میرے حوالے نہیں کی تھی، وہ مجھے سہارا دینا چاہتا تھا۔ وہ کچھ کر رہا تھا اس میں مشیتِ ایزدی کو بھی دخل تھا۔ اُس کے شب و روز کی ایک ایک مصروفیت، اُس کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، اُس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ، ایک ایک

زیر، زبر، پیش سب خالق حقیقی کے تابع تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو نگاہوں سے اوجھل ہونے کی قوت پر قادر نہ ہوتا۔ کوئی نہ کوئی راز تھا..... کوئی پردہ تھا جو میرے اور اُس کے درمیان حائل تھا۔ وہی ایک کل جو میرے ہاتھ نہیں آ رہی تھی، وہی ساری مشکلات کی کلید تھی۔ وہ میرے ہاتھ آ جاتی تو سارے پردے سرک جاتے، راستہ صاف نظر آنے لگتا۔ کوئی روک ٹوک باقی نہ رہتی۔ سید کی آمد سے پیشتر میرے قلب پر جو انحلال طاری تھا، جو بے کیفی مسلط تھی وہ کائی کی طرح پھٹ کر صاف ہو گئی۔ اُس کی باتیں میری سمجھ میں نہ آ سکیں، یہ دیگر بات ہے لیکن اُس کی آمد کا معجزہ تھا جس سے میرے قلب کی کیفیت حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو گئی تھی۔ میرا ذہن اُس کی باتوں کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ صرف ایک اشارہ کچھ کچھ واضح ہو رہا تھا۔ سید نے کہا تھا کہ ”پل کے دہانے پر کھانڈ بُرک دے، چوہے بولکھا کر باہر نکل آئیں گے.....“ میرے دماغ میں پنڈت نول کشور کا تصور رہ رہ کر ابھر رہا تھا۔ وہ میری نفرت کا سبب بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس جملے سے نول کشور کی ذات کا بھی کوئی نہ کوئی دخل ضرور ہوگا..... ”کھانڈ بُرک دے“ کا مطلب واضح ہو جاتا تو تمام مشکل سامان ہو جاتی۔ سید کا اشارہ یقیناً کسی ایسی شے کی طرف تھا جسے دیکھ کر یا محسوس کر کے پنڈت نول کشور کی کھوپڑی پلٹ جاتی۔ وہ بلبلا کر منڈل اور مندر سے نکل کر باہر آ جاتا۔ میرا اس کا قصہ تمام کر دیتا۔ پھر خوشی سے ”تالی بجانا اور تھر کرنا شروع کر دیتا۔“

[illegible]

کس۔ کبھی وہ میری توجہ بنانے کی خاطر، مجھے ذہنی طور پر کمزور کرنے کے لئے تزمین کو اغواء کر لیتے، کبھی پچا جان کی لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے۔ میں دیوانہ ہو جاتا۔ وہ دور بیٹھے تھپتھپاتے رہتے رہتے.....!!

اس وقت بھی مجھے انکارانی کی نظروں سے اُبلتے آنسوؤں میں اپنے کسی عزیز کی لاش جبرتی نظر آ رہی تھی۔ میرا ذہن تزمین کی طرف گیا، میں لرزنے لگا۔ ساری جان سے کانپ اٹھا۔ نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا..... وہ دوبار تزمین کو ہدف بنا چکے تھے، میں طاقت کے بل پر اپنی جیتی جاگتی گڑیا کو واپس لے آیا، وہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس بار شاید انہوں نے تزمین کو..... میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ میرے وجود کے اندر طوفان مچنے لگے۔ میں نے دل ہی دل میں دشمنوں کو لاکارا۔

”حرام زادو..... کینو..... سور کے بچو..... خبردار، کوئی ایسا قدم مت اٹھانا جو میرے ماضی کے زخموں کو دوبارہ تازہ کر دے۔ جو کھرٹھ جھی ہے، اس میں برسوں لگے ہیں۔ تم نے اسے اٹھاڑنے کی کوشش کی تو پھر کچھ باقی نہیں بچے گا۔ شاید میں بھی اپنے جنون، اپنی وحشتوں، اپنی بے رحمی، اپنے پاگل پن کا شکار ہو جاؤں۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو، جہاں میرے بچے ہوں، ارادوں میں کوئی کھوٹ نہ ہو، وہاں قسمت بھی ساتھ دیتی ہے، خدا کی قسم میں تم کو ہلاک کر دوں گا۔ میری آواز غور سے سنو، اب کوئی حماقت نہ کرنا..... جھگڑا میرا تمہارا ہے۔ میرے دل کے درمیان کسی اور کو شامل کرنے کی غلطی مت کر بیٹھنا۔ میری گڑیا، میرے کسی اور عزیز دار نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم نے مجھے اپنے جال میں پھانس لیا تھا، میں تمہارا، تمہاری تعداد ادا کرتے ہوئے تمہیں دُرگا، کالی اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی خدمت میں بھیج دیتا ہوں۔ لیکن تم مجھ سے خوفزدہ بھی تھے۔ تمہیں ڈر نہ لاحق ہوتا تو مجھے تمہارے خلاف کارروائی میں باندھ کر کبھی نہ رکھتے۔ ایک ایک کر کے ہلاک کر کے کھال پر آتے تو میں بتاتا کہ جیل میں سے نکرا کر تم نے اپنی موت کو لاکارا ہے۔ تم بزدل تھے، بزدل ہو۔ مرد ہوتے تو تمہاری طرح مقابلہ کرتے۔ میں نے پھر بھی کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں کی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ تم اپنے دیکھتے گئے، میں پھر تمہاری نظروں میں دھول جھونک کر باہر آ گیا۔ میرے دروازے پر میری آبادی زیادہ ہے، کئی چھوٹے چھوٹے مندر اور بھی ہوں گے۔ میں چاہتا تو تمہاری آبادی میں آگ لگا دیتا، اُنہیں جلا کر راکھ کر دیتا۔ اُن میں کچھ تمہارے اپنے بھی ضرور

”کھاٹڈ بُر کئے“ کا وہ پہلا اشارہ تھا جس کا مفہوم تلاش کرتے ہوئے میرے دل کی عجیب سی کیفیت ہوئی تھی۔ وہ کیفیت سکون قلب کی تھی۔ میرے ذہن اور دل کی دھڑکنوں میں ایک ہم آہنگی تھی جو اس بات کی تائید کر رہی تھی کہ سید مجذوب کا وہ اشارہ میرے دشمن پنڈت سے تول کشور ہی کی جانب تھا..... بات صرف ”کھاٹڈ“ کے اشارے کے حل کی تلاش میں آئی تھی۔ میں اسی حل کے ذریعے دل و دماغ کی انتہائی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ انکارانی میرے سر پر واپس آ گئی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اُس کا چہرہ بڑا سوگوار نظر آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگی بھیگی، سرخ سرخ نظر آ رہی تھیں۔ وہ سرخی کسی گہرے زخم کی پیداوار لگ رہی تھی۔ سید کے جانے کے بعد انکارانی واپس میں دیر کر دی تھی۔ وہ کہاں گئی تھی؟ اُس نے کیا دیکھا تھا؟ کیا خبر سن لی تھی جس نے اُس کے چہرے کو اس قدر اُداس کر دیا تھا؟ وہ مجھ سے نگاہیں ملانے ہوئے بھی کتر آ رہی تھی۔..... ان آنسوؤں کو بھی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی جو اُس کی پلکوں کی لوٹ سے طوفان طر ح اُبل پڑنے کو ٹھانیں مار رہے تھے۔ کیوں؟ آخر کیوں.....؟ وہ یقیناً کوئی اہم بات تھی جس نے انکارانی کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ”کیا بات ہے.....؟ تم اتنی اُجڑی اُجڑی، اتنی اُداس اور ٹمگن کیوں نظر آ رہی ہو؟ کیا خبر سن لی؟ کون مر گیا.....؟“

”جیل.....“ اُس کی آواز بھرا کر رہ گئی۔ آنسوؤں کا بندوٹ گیا۔ وہ سسکیاں بھر گئی۔ میرے دل میں دوسرے سر اُبھارنے لگے۔ میں انکارانی کی کیفیت اور اپنے دل دھڑکنوں میں کوئی ربط تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اتنی سوگوار زندگی میں پہنچ گئی تھی۔ میرے اندر طوفان سر اُبھارنے لگا۔ میرا ماضی میری نگاہوں کے سامنے گیا۔ میرے دشمنوں نے میرے ساتھ ہمیشہ کم ظرفی کا ثبوت دیا تھا، وہ مجھ سے اپنی کمزوری کا بدلہ میرے خونی رشتوں سے لیا کرتے تھے۔ مجھے ایک محاذ پر مصروف کر کے وہ میری طرف میری دنیا اُجاڑ دیتے تھے۔ اُنہوں نے نرگس کو مار دیا تھا، انکا نے مجھے بعد میں دی۔ مالا رانی بھی ہاتھ سے نکل گئی، میری طاقت اور انکا کی لازوال تو تھیں کسی کا

بعد اس کی بات کی تصدیق کی تھی۔ شاید وہ اس اشارے کا مفہوم سمجھ گئی تھی، لیکن مجھ سے کچھ کہے بغیر وہ جگت میں کہاں چلی گئی تھی؟

میں اس کی واپس کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اس کے دل میں جھرتا کی محبت اچانک دیوانگی کی حد تک کس طرح پیدا ہوئی؟ وہ اس طرح رورہی تھی جیسے اس کا اپنا کوئی عزیز مر گیا ہو، جیسے وہ مجھ کو پہلے سے جانتی ہو، کوئی قریبی رشتہ رہا ہو۔ کوئی ایسا رشتہ جو اس نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا ہو۔ کوئی اور بات بھی ممکن ہو سکتی تھی۔ جھرتا کسکن تھی، خوبصورت تھی، نوجوان تھی، ہرئی کی جگہ کوئی تھی، ممکن ہے انکارانی کو اس کی وہی ادا بھی گئی ہو۔۔۔۔۔ ایک اور قیاس میرے ذہن میں گمانے لگا، جھرتا کے گورے بدن سے خون چھلکا تھا، اس کے گدرائے ہوئے گال فندھارانی بنا کر طرح سرخ سرخ نظر آتے تھے۔ شاید انکارانی کو اس کا گاڑھا گاڑھا خون پسند آ گیا ہو، کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی جو اس نے جھرتا کو توجہ کے قابل سمجھا تھا، اسے اپنے ساتھ آئندہ بھونکے آئی تھی۔ میرے استفسار پر اسے اتنا تھ آ شرم چھوڑ آئی۔ لیکن اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جس سے سارے جھیلوں سے فارغ ہو جاؤں گا تو جھرتا دوبارہ میرے پاس واپس آ جائے گی۔

میں اپنے خیالات میں مستغرق تھا کہ بھنڈاری دروازے پر دستک دینے کے بعد اندر داخل ہوا۔ وہ کچھ الجھا الجھا نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں کچھ بدلی بدلی نظر آ رہی تھیں۔

”مہاراج۔۔۔۔۔“ گفتگو کی ابتدا اس نے دبی زبان میں کی۔ ”تم کالی کے مندر گئے تھے۔ کر آئے پوچھا۔۔۔۔۔؟“

میں بھنڈاری کی بات سن کر چوکا۔ اس نے مندر اور پوچھا کا ذکر بلاوجہ نہیں چھیڑا ہوگا۔ میں نے سوچا۔۔۔۔۔ وہ مجھ سے کیا معلوم کرتا چاہتا تھا؟۔۔۔۔۔ کیا اسے مندر میں ہونے والے ہنگامے کی اطلاع مل گئی تھی؟ کسی نے میری اصلیت کی خبری کر دی تھی؟۔۔۔۔۔ میں سنبل کر بیٹھ گیا۔ کوئی نہ کوئی فتنہ پھر سر اٹھانے والا تھا۔ بھنڈاری جو آئندہ بھون میں میرے قیام کے دوران میرے آگے پیچھے بچا چار رہا تھا، اب کچھ بدلا بدل نظر آ رہا تھا۔

”نوجو مندر میں جاتے ہیں وہ صرف پوچھا کے ارادے سے نہیں جاتے، اور بھی بہت سارے کارن ہوتے ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہارے وہاں جانے کا کیا کارن تھا۔۔۔۔۔؟“

”تو کیوں معلوم کر رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ میں جھلا گیا۔ میری پیشانی پر آڑی ترچھی سلوٹیں ابھرنے لگیں۔ ”تیرے پیٹ میں کیوں مروڑ ہو رہا ہے؟“

”کالی کا ایک پجاری ابھی ادھر آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ مندر میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔“

بھنڈاری میرے تیور دیکھ کر کچھ نرم پڑا۔

”کیا کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔؟“ میں نے بدستور درشت لہجے میں دریافت کیا۔

”وہ کہہ رہا تھا مندر کا بڑا پروہت بڑے غصے میں ہے، کوئی مسلا وہاں بھیجیں بدل کر پہنچ گیا تھا۔ پجاریوں کو اس پر شبہ ہوا تو اسے پکڑ لیا گیا۔ پنڈت نول کشور مہاراج نے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر تہہ خانے میں ڈلوادیا تھا۔ مہاراج نے مندر کے دوسرے کرتاؤں دھرتاؤں سے ان کی رائے پوچھی تو سب کا ایک ہی خیال تھا، اس مسئلے کو پورن ماشی کی رات دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ پرنٹو وہ مسلا رسی ترا کر بھاگ نکلا۔ پجاریوں نے ایک ایک کونا چھان مارا لیکن اس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔۔۔۔۔ کالی کو خوش کرنے کی خاطر بڑے پروہت کو اپنی خاص پجاریوں کی بھینٹ دینی پڑی۔ مہاراج کے خاص کھوجی ہردوار میں پورن طرف پھیل گئے ہیں۔ گھر گھر کی تلاشی ہو رہی ہے۔“

میں نے اس کا ز اور مراقبے کا مختصر عمل کر کے آنکھیں موند لیں۔ اندھیرے چھٹنے شروع ہوئے تو میں نے مختلف سمتوں میں نظریں دوڑائیں۔ باہر کاؤنٹر کے قریب ایک ہٹا کٹا پجاری کھڑا تھا۔ اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ شاید وہ نول کشور ہی کا کھوجی تھا جو آئندہ بھون میں ٹھہرے ہوئے مسانروں کے سلسلے میں معلوم کرنے آیا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر بھنڈاری کے دل میں جھانکا، وہ بھی اندر سے بے چین نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کی بے چینی کا اندازہ بھی اس کی سوجھ بوجھ سے ملے ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر بھنڈاری کو تیر نظروں سے گھورا۔ میری بدلی ہوئی نظریں دیکھ کر وہ کسمسانے لگا۔

”مورکھ۔۔۔۔۔ آنکھ کے اندھے، تو میرے مندر جانے کا کارن پوچھ رہا تھا نا۔۔۔۔۔؟“

”نہیں مہاراج۔۔۔۔۔ نہیں۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم سمجھ رہے ہو۔“ بھنڈاری شپٹا گیا۔

”میرا نام جاننا چاہتا ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے سید کی لالچی اٹھائی تو اس کے چہرے کا رنگ قسطنطنیہ ہوئے لگا۔

”بات تمہاری نہیں ہے مہاراج۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں تم سے کیول بہتج کرتے آچکا ہوں۔ تم بڑے پروہت کی سہانچا کرو۔ اُس مسئلے کا کھوج لگا دو جس نے کالی کے مندر کی پوترتا کو بے بنیاد کرنے سے گندا کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”وہ بھی یہی نہیں کہنے آیا ہے یا اُس کے من میں کچھ اور کلہا رہا ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے سرسراہٹ آواز میں سوال کیا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم کس کی بات کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

”وہی۔۔۔۔۔ گھٹے ہوئے سروالا مسٹنڈ اچھاری جھوٹا تیری راہ دیکھ رہا ہے۔“

”مہاراج۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تمہاری شکتی اپرم پار۔۔۔۔۔“ وہ بھی غصیت سے میرے پاؤں چھوئے۔

”اُس نے آگے بڑھا۔ میں نے پیر ایک طرف کر کے اُسے تھارہ سے دھکا مارا۔“

”دُور ہٹ لٹھ۔۔۔۔۔ مجھے تیرے شر سے بھی کسی بستوئی (پچھلی) کی رائد آ رہی ہے۔“

”تمہیں کیا ہو رہا ہے مہاراج۔۔۔۔۔؟“ اُس نے وضاحت کرنی چاہی، میں نے گڑبگڑ کر کہا۔

”جب کوئی سندری اپنے اُجلے شریر کا مول بھاؤ کرنا شروع کر دے تو اُس کے من سے بستوئی ہی کی باس آتی ہے۔۔۔۔۔ میں اُس کی بات کر رہا ہوں جو تیرے کمرے میں چادر میں بدن چھپائے تیری راہ تک رہی ہے۔۔۔۔۔ اور کچھ سنے گا۔۔۔۔۔؟“

”بھنڈاری نے ہی ہی ہی کر کے ہتھی نکالی، جانے کے ارادے سے پلٹا تو میں نے گرج کر کہا۔

”چلا کدھر پانی۔۔۔۔۔ اُس مسٹنڈے کو بھی بلا لے جو کھوجی بن کر گندی ہوریوں میں جھانکتا پھر رہا ہے۔ میں اُس حرامی کی دبدھا بھی دُور کر دوں گا۔“

”مجھے شام کرو مہاراج۔“ بھنڈاری میرے رعب میں آکر کپکپانے لگا۔ ”وہ جو باہر کھاڑ ہے، میری بات کا دوش اس کر لے گا۔ تم آرام کرو۔“

”جاتے جاتے ایک بات اور سن لے۔۔۔۔۔“ میں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک کاری ضرب اور لگائی۔ ”پنڈت نول کشور سے کہلوادے کہ چندرا کو ادھر ہی بلوالے۔ چندرا آگیا تو وہ مسلا بھی سامنے آجائے گا۔۔۔۔۔ سنا تو نے، میں کیا کام کی بات بتا رہا ہوں؟“

”میں تمہارا سندیس بڑے پروہت تک اوش پہنچا دوں گا۔“

”اُس سندری کو بھی نودو گیارہ کر دے۔“ میں نے اُسے دہلانے کی خاطر سنجیدگی سے کہا۔ ”تیری گھر والی کو بھنک مل گئی تو تیرے بارہ بچے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔“

”بھنڈاری سر پر پاؤں رکھ کر نکل بھاگا۔ میں اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس سرزنش ہو جانے کے بعد اب وہ کسی کو میرے کمرے کے اُس پاس پھٹکنے کی اجازت بھی نہیں دے گا۔ خود بھی میرے پاس آنے سے گریز کرے گا۔ میں نے اُس کی عیاشی کا بھانڈا جو پھوڑ دیا تھا۔۔۔۔۔!“

رات زیادہ گزر گیا تو میری اُلجھن انکارانی کے سلسلے میں بڑھنے لگی۔ اُس نے سید کے اشارے کو سمجھ لیا تھا، پھر انتظار کرنے کا کہہ کر چلی گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ میں اُس کا انتظار کروں، وہ جلدی واپس آئے گی۔ لیکن دو گھنٹے گزر چکے تھے وہ واپس نہیں آئی۔ میں اُسے کمرے میں ٹھیلنے لگا۔ وحشت بڑھنے لگی تو میں کمرے سے نکل کر باہر آ گیا۔ سید بھنڈاری کی لالچی میرے ساتھ ساتھ تھی۔

ایک میرے ذہن میں ایک کیڑا کلہا لایا۔۔۔۔۔ بھنڈاری نے کہا تھا کہ نول کشور کے ہر دروازے کے کونے کھدروں میں میری تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں ابھی تک اُن کھدروں میں بچھو بن کر ڈنک مار رہا تھا۔ میں اُن کے اس جال کو توڑ کر نکل بھاگا تھا جسے میں بڑی مضبوطی سے تیار کیا تھا۔ تہ خانے کا ٹوٹا ہوا دروازہ اُنہیں نظر آیا ہوگا تو اُن کے ہاتھ پائیوں کی بھی تمامت آگئی ہوگی جو کالی کے چرنوں کے چڑھاؤں کا مال کھا کھا کر مارتے پھر رہے تھے، اُنہیں میری نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔ ”میں اُن کی نھروں کے سامنے سے کس طرح نکل گیا؟“ اُس خیال نے مندر کے بڑوں کی کھوپڑیوں میں شکوک و شبہات پیدا کئے ہوں گے۔ جتنا کہ بھنڈاری بھی شاید کالی کے چرنوں میں بھینٹ چھانے کی تیاری ہو رہی ہوگی، وہ سب مل جل کر چلا رہے ہوں گے، اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی خاطر بڑی بڑی قسمیں کھا رہے ہوں گے، تڑپ رہے ہوں گے، ہاتھ پاؤں ہل رہے ہوں گے۔ جتنا بھی اسی طرح تڑپتی تھی، چلی تھی، کھنکھناتی تھی، خالوں نے اُس کی زبان کاٹ دی تھی۔ اُس کی زبان سلامت ہوتی تو اُن کے ہاتھ پاؤں کے ہم بھی اُس کی زبان پر ضرور آجاتے جنہوں نے اُسے مال غنیمت سمجھ کر پامال کرنے میں کمی نہ کی تھی۔ نول کشور کے مستفید ہو جانے کے بعد اُس کے حاشیہ برداروں نے بھی اُٹھ پھوڑی تھی۔ نول کشور کے مستفید ہو جانے کے بعد اُس کے حاشیہ برداروں نے بھی

جہاں کی جوانی سے اپنا اپنا لگان وصول کیا ہوگا، جہاں کی زبان کھل جاتی تو وہ سب نکلے ہو جاتے۔ مندر کی بات باہر آ جاتی۔ جہرنا کو بھی خبر مل جاتی کہ مندر کی مقدس گھنٹیوں کی جھنکاروں میں کیا گل کھلائے جاتے ہیں۔ دیو داسیوں کو شادیاں کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، وہ صرف کالی کی خدمت کے لئے وقف کر دی جاتی ہیں، انہیں بڑا قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ اُن کا یہ بھرم بھی کسی پرکھت یا بڑے پنڈت کے ہاتھوں چکنا چور ہو جاتا ہے۔ عقاب کے خو غوار بچوں میں چھٹا ہوا شکار صرف پھڑ پھڑا سکتا ہے، پھر اُس کی توت مدافعت جواب دے جاتی ہے۔ کالی بھی کیا کر سکتی ہے؟ اُس کے شہنام کی آڑ میں جو کھیل تماشے ہوتے ہیں، ان کی گونج دُور دُور تک سنائی دیتی ہے۔ وہ خود نہیں سن سکتی..... جو سنتے ہیں وہ بھی دم سادھ کے بیٹھ جاتے ہیں۔

جہاں کی آواز حلق سے نکل کر چاروں طرف گونجتی تو جہرنا بھی دم سادھ ہونے کے سوا اور کیا کرتی؟ اُس کی کمسنی یکھنت سن بلوغت کا راز پالیتی۔ وہ سبھی کچھ رہنے لگتی۔ پنڈت پجاریوں سے بچ بچ کر چلتی، بار بار راستہ کترانے کی کوشش کرتی۔ لیکن ایک دن وہ بھی کسی نہ کسی موڑ پر دبوچ جاتی..... پھر دو ہی راستے باقی رہ جاتے۔ یا وہ اسی رنگ میں رہے جاتی یا کالی کے قد آور بت سے سر ٹکرا کر مر جاتی..... اچھا ہوا جو وہ درندگی کا شکار ہونے سے پہلے مر گئی۔ انکا بلا وجہ اُس کا سوگ منار ہی تھی۔

میں نے جہرنا کو ذہن سے جھٹک دیا، پھر اُن کھوجیوں کے بارے میں غور کرنے لگا جو بھوکے گدھ کی طرح میری تلاش میں ہر طرف منڈلاتے پھر رہے تھے۔ میں اُن کے لئے ”کھانڈ“ سے کم نہیں تھا۔ میں باہر نکل کر اُن کے سامنے آ جاتا تو سب ”چیونٹوں“ کی طرح میرے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ وہ مجھے تر مال سمجھ کر ہڑپ کرنے کی خاطر لپکتے، میں اُن کے لئے ”لوہے کا چنا“ ثابت ہوتا۔ سید کی لائیں گھماتا تو سب تتر بتر ہو جاتے۔ کئی مارے جاتے، کئی زخمی ہو کر دوبارہ ”بلوں“ میں مھنے کی کوشش کرتے۔ نول کشور کو بھی ضرور خبر پہنچتی..... شاید وہ بھی اپنی چندال چو کڑی کے ساتھ بوکھلا کر مندر سے باہر آ جاتا۔ میں فر بن کر اُس پر ٹوٹا۔ اُسے بتاتا کہ ہاتھی کے ہودے یا مچان پر بیٹھ کر جنگل کے بادشاہ کو شکار کر لینا بہادری نہیں ہوتی، یہ بڑے آدمیوں کے چونچلے ہوتے ہیں جو شیر کی کھال میں بکس بھرا کر اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بناتے ہیں۔ مُردہ شیر کی کھوپڑی پر پاؤں رکھ کر، منہ مٹی

مچا رہا کر تصویریں اُتر وانا بڑے فخر کی بات سمجھتے ہیں، اس طرح سینہ تانے نظر آتے ہیں جیسے شیران کی بندوق کی گولی سے نہیں، ان کے رعب و دبدبے سے دہشت کھا کر جان سے گزر گیا ہو..... مردانگی تو تب ہے کہ شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے لٹکا کر جائے، پھر اُس پر گولی داغی جائے۔ پنڈت نول کشور کا واسطہ ابھی تک کسی شیر سے نہیں پڑا تھا۔ وہ پالتو ہرنیوں اور مرغایوں کو نشانہ بنانے کا عادی تھا۔ شیر کو سامنے دیکھ لیتا تو دم بخود رہ جاتا۔ اُس کے دیدے پھٹ جاتے، سانپ سونگھ جاتا، کھڑے کھڑے دھوئی میں پھلھلانے لگتا۔ میں کچھ سوچ کر عقبی راستے سے گزر کر آئند بھون سے باہر آ گیا۔ میں نے اپنے ارد گرد ایک مضبوط حصار قائم کر کے قدم آگے بڑھانے شروع کر دیے۔ شکار یوں کی تعداد زیادہ ہو تو شیر بھی بلی بن کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ نول کشور مجھے گیدڑ ہی سمجھ کر اپنی کچھار سے نکل کر باہر آ جائے۔ میں اُس کے خون کے چھینٹوں سے اپنے انتقام کی آگ بجھا کر ”تالی بجاؤں، تھرکنا شروع کر دوں“..... غالباً سید بھدوب کے مبہم اشارے کا مطلب بھی یہی تھا۔

میں سینہ تانے قدم بڑھاتا رہا۔ میرا رخ کالی کے مندر کی جانب تھا..... ذہن انکارانی کے بارے میں اُلجھ رہا تھا جو ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ آئند بھون، آبادی سے ہٹ کر واضح تھا۔ میں اطراف میں نظر دوڑاتا اپنی منزل کی سمت گامزن تھا۔ میرے ذہن میں شیوا کا تصور بھی اُبھر رہا تھا۔ اُس غریب کو بلا وجہ میرے نام پر سزا دی گئی تھی۔ جہاں سے ملاقات کے دوران میں نے سوچا تھا کہ کالی کے مندر کے تہہ خانوں میں بنی کال کوٹڑیوں میں اُسے بھی ضرور تلاش کروں گا۔ کو بہادر تھا، موت سے نہیں ڈرتا تھا، اپنے ساتھیوں سے بھی مخلص تھا۔ غدار ہوتا تو میرا ہاتھ تمام کر اُن کے بارے میں سب کچھ بتا دیتا۔ چندرا کی گمشدگی کا راز بھی اُنکے دیتا، میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا۔ مندر نہ ہوتا تو زندگی بچ جانے کے بعد کسی اور سمت نکل جاتا۔ کالی کے مندر میں واپسی کی حاکمیت کبھی نہ کرتا..... نول کشور اور اُس کے گرگوں نے باریکیوں میں جانے کی زحمت نہیں کی ہوگی، جلد بامری میں ایک فیصلہ کر بیٹھے۔ میں اُن کی غلطی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ شیوا کی رہائی میرے ہاتھوں میں آتی تو او میرا مہنو ابن جاتا۔

مجھے شیوا کے حوالے سے آئند لال یاد آ گیا۔ وہ بھی بڑا معاملہ فہم، بڑا اندر اور ”دلیور

پچھتہ تھا۔ اُس وقت جب میں عدالت کے روبرو کھڑا کسی فیصلے کا منتظر تھا، بڑے بڑے
پجاریوں کے کٹہرے میں آکر میرے خلاف گواہیاں دی تھیں، مجھ پر سنگین الزامات کی
فہرست بڑی طویل تھی، بدری نرائن کے سوا اُس کے تمام پہلے عدالت میں موجود تھے، وہ
بد بخت تربیتی داس بھی کھڑا ہوا جسے میں بڑی اذیت ناک سزائیں دے چکا تھا۔ سب
بدری نرائن کے اشارے پر چڑھ کر مجھ کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھ پر مالا کو اغواء کرنے اور قتل
کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ نرگس کی موت کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ میں بل کھا کر رہ گیا۔
انکا بھی تملنا اٹھی تھی، میں ایک اشارہ کرنا وہ سب کو تھکنے کا ناچ بچانا شروع کر دیتی، انصاف
کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج بھی تنکا ہو کر تاپنے لگتا۔ میں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔
جب سارے بیانات ختم ہو گئے تو جج نے میری طرف سخت نظروں سے گھورا۔ میرے
دشمنوں نے میرے خلاف زہر اُگلنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ جج میرے
خلاف فیصلے دینے کے لئے اپنے ذہن کو پوری طرح آمادہ کر چکا تھا۔ خود میری طویل
خاموشی بھی عدالت کے لئے ایک ثبوت بن گئی تھی۔ سرکاری وکیل بھی اپنی کامیابی کے لحاظ
میں بڑا پر امید نظر آ رہا تھا جب آئندہ لال نے اُس کی وساطت سے خود کو کٹہرے میں لایا
کیا۔ پنڈت پجاری اُسے بہت مانتے تھے، خود انکارانی نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ وہ کی
شاستروں کا ماہر اور ہندو دھرم کے بڑے عالموں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ کٹہرے میں آکر
کھڑا ہوا تو میرے دشمنوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ آئندہ لال کو میرے تابوت کی آخری
کیل سمجھ رہے تھے۔ اُس نے بولنا شروع کیا تو سب خاموش ہو گئے۔ سب کی نظریں اُس
پر جمی تھیں، وہ جج سے کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ ”میرا نام آئندہ لال ہے۔ میں دھرم کا سیوک ہوں۔
میں نے دیوی دیوتاؤں کی بڑی کٹھن تپتیا کے بعد وہ مقام حاصل کیا ہے جو بہت کم لوگ کر
پاتے ہیں۔ میں نے سارا جیون شاستروں کے پتوں کے سچ گزارا ہے، ویدوں میں جان
کھپائی ہے۔ دیوی دیوتاؤں نے میرا مان بڑھایا ہے، میں اُن ہی کی سونگد کھا کر کہتا ہوں کہ
جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا اور کچھ نہیں کہوں گا۔“ پھر اُس نے عدالت سے ہاتھ
باندھ کر درخواست کی کہ مجھے باعزت طور پر رہا کر دیا جائے۔ مجھے زد و دوش اور بے قصور قرار
دیا جائے تو عدالت میں کھلبلی مچ گئی۔ پنڈت پجاریوں کے چہرے لٹک گئے۔ وکیل سرکہ
کی آنکھیں بھی حیرت سے پٹنی کی پٹنی رہ گئیں۔ جیوری کے ممبران بھی اپنی اپنی نشستوں

پہلو بد لئے گئے۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ آئندہ لال میری حمایت بھی کر سکتا تھا۔۔۔۔۔!!
آئندہ لال نے بھری عدالت میں اپنی مہمان شناسی کے کرشمے پیش کئے تو پنڈت پجاریوں
کی زبانیں اُس کے خلاف بھی زہر اُگلنے لگی تھیں۔ شیوا کی طرح آئندہ لال پر بھی شبہ کیا گیا
کہ وہ مجھ سے مل گیا ہے۔ ایک پولیس افسر نے اُسے دھکا دے کر باہر لٹانے کی کوشش کی،
آئندہ لال کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اُس نے کچھ پڑھ کر پھونکا، انسپکٹر کڑے کھڑے چکرا
کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں ابل کر حلقوں سے باہر آ گئیں۔ اُس کا چہرہ سیاہ ہو
گیا، ناک سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اُسے نہ روکا ہوتا تو شاید وہ
ایک ایک کر کے سب کو ٹھکانے لگا دیتا۔ کھیل اُسی روز ختم ہو جاتا۔ کوئی دوبارہ میرے
مقابلے پر آنے کی جرأت نہ کرتا۔۔۔۔۔ آئندہ لال نے میرے اشارے پر اپنا ہاتھ روک لیا۔
پولیس اُسے گرفتار کر کے لے گئی۔ وہ غریب آخری وقت تک زبان بند کئے رہا، پھر ایک
طویل عرصے بعد انکارانی نے مجھے اطلاع دی کہ امر لال نے مجھے رکن الدین کی حویلی سے
باہر نکالنے کی خاطر آئندہ لال کو ٹھکانے لگا دیا۔۔۔۔۔ بڑے کم ظرف لوگ تھے، بڑے کمینہ
خصلت تھے، چھپ کر پشت سے چھرا گھونپنے کے عادی تھے۔

آئندہ لال کو میری غفلت نے شکار کر دیا لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ شیوا کو بچانے کی
ہر ممکن کوشش کروں گا۔ اس کا جرم میں صرف اتنا تھا کہ اُس نے میرا پیغام نول کشور تک
پہنچانے کی غلطی کی تھی۔۔۔۔۔ وہ میرا سفیر تھا، میرا قاصد تھا، میرا اپنی تھا۔ پھر میں اُسے دشمنوں
کی قید میں کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔۔۔۔۔!!

میرے دل و دماغ میں نفرت کی چنگاریاں جھج رہی تھیں۔ میرے دشمنوں نے میرے
ساتھ ہمیشہ کمینگی کا ثبوت پیش کیا تھا، وہ کبھی سامنے سے نہیں آتے تھے، مجھے چاروں
اطراف سے گھیرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دشمن ہر حال دشمن ہوتا ہے، اُس سے کسی رحم کی
توقع نہیں کرنی چاہئے۔ محبت اور جنگ میں سب پھنسا جاتا ہے۔ کبھی حریف کے حساس
اور دفاعی ٹھکانوں پر گولہ باری کی جاتی ہے، کبھی اُس کی توجہ ہٹانے کی خاطر شرعی علاقوں پر
بھی ایک دو بم پکا دیئے جاتے ہیں۔ ایسا دشمن کی توجہ ہٹانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ بین
الاقوامی تنظیمیں اور ادارے احتجاج کرتے ہیں لیکن سنتا کون ہے؟ جس کا بھی اُس کی
بیمیں۔۔۔۔۔ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ طاقت ور اپنے کمزور دشمن پر بلا وجہ بھی اپنی برتری قائم

کے کسی خطر کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا رہتا ہے۔ یہ کوئی منطق نہیں ہے، نہ کوئی فلسفہ ہے، نہ جنگی قوانین میں ایسی کوئی شق موجود ہے۔ لیکن دنیا اسی ریت پر چل نکلی ہے۔ پولیس اصل مجرم پر ہاتھ دانت سے قاصر رہتی ہے تو مجرم کے بے گناہہ رشتہ داروں کو اٹھا لیتی ہے، اُس کے بیوی بچوں کو لالچ کر دیا جاتا ہے۔ مجرم چاروٹا چار سائے آجاتا ہے۔ ایسا کرنا بھی جرم ہے، شرافت کے منافی ہے۔ لیکن جب قانون خود قانون کی خلاف ورزی کرے تو انصاف کس سے طلب کیا جائے.....؟

انکارانی نے واپسی میں دیر کر دی تھی، چنانچہ اس کی نیت صاف تھی لیکن اُس نے سامنے آ کر میرے تجسس کو اُبھار دیا تھا۔ میں آنند بھون کے دروازے میں بیٹھ کر انتظار نہیں کر سکتا تھا، باہر نکل آیا۔ میرے قدم تیزی سے دشمن کے ٹھکانے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ میں کیل کانٹے سے پوری طرح لیس تھا۔ سید کی متبرک لاشی میرے لپٹ سے بڑا ہتھیار تھی۔ میں آبادی کے علاقے میں داخل ہوا تو گھٹے ہوئے سراور لہی جی چوٹی والے پنڈت پجاریوں کی نظریں میری سمت اٹھنے لگیں۔ میں سینہ تانے آگے بڑھتا رہا۔ مندر کی چھری ہوئی لہریں سیلاب کی صورت اختیار کرتی ہیں تو اندھی ہو جاتی ہیں، بہری ہو جاتی ہیں۔ انہیں لوگوں کی آہ و بکا کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ وہ بے بسائے مکانوں کو مینوں سمیت خس و خاشاک کی طرح اپنی لپیٹ میں بہا لے جاتی ہیں۔ میں بھی پھرے ہوئے طوفان کی طرح کالی کے مندر کی جانب قدم بڑھا رہا تھا جب وہی پستہ قد پجاری میرے سامنے آ گیا جو مندر کے اندر مجھے شعبدے بازی دکھا رہا تھا۔ اُس وقت میرے ہاتھ پر بندھے تھے، کالی نے میری قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ میں کوئی جوابی کارروائی نہ کر سکا۔ وہ نول کشور کی اجازت لے کر بلاوجہ میدان میں کود پڑا۔

کالی کا مندر مجھ سے صرف سو گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا جب ٹھکنے پجاری کی موت اُسے میرے سامنے لے آئی۔ میں نے کترا کر نکل جانا چاہا لیکن وہ ٹھمنڈی تھا، میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”تم.....“ اُس نے مجھے حقارت سے گھوڑا۔ ”تم وہی ہوتا جسے بڑے پردہت کے تم شہہ خانے میں بند کیا گیا تھا؟“

”میری نظریں بھی اگر دھوکہ نہیں کھا رہیں تو تم بھی وہی مداری ہو جو کالی کے قہر

بت کے سامنے اُچھل کود کر رہے تھے۔“ میں نے اُس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا وہ عجیب الخلق جانور مجھے پسند آیا تھا۔ تمہاری شکل بھی بالکل اُسی جیسی لگتی ہے۔“

میرا جواب اُسے پسند نہیں آیا۔ اُس کے ہونٹوں نے بدبدانا شروع کیا۔ میں قدم جما کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی رگوں میں جوان خون گردش کر رہا تھا، اُس نے جلد بازی میں یہ بھی نہیں سوچا کہ میں مندر کے تہہ خانے سے کس طرح آزاد ہو گیا؟ دوبارہ میرے قدم مندر کی جانب کیوں اٹھ رہے تھے؟ تاہم توڑ حملے شروع کر دیئے۔ اُسی جانور نے پھر نمودار ہو کر میری طرف زقند لگائی لیکن حصار سے نکلایا تو جل کر راکھ ہو گیا۔ ایک ایک کر کے اُس نے تمام حربے آزما ڈالے۔ پھر مجھے ایسی نظروں سے گھورنے لگا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔

”کیا دیکھ رہا ہے رے.....؟“ میں نے اُس کی جوابی پرتس کھا کر کہا۔ ”کچھ دیر پہلے تو بڑا زور لگا رہا تھا۔ پٹارے میں کچھ اور باقی رہ گیا ہو تو اُسے بھی ٹال لے۔ اس کے بعد دُم دبا کر خاموشی سے چلا جا، ابھی تیرے کھیلنے کودنے کے دن ہیں مورکھ، کسی سے پنچہ لڑانے سے پہلے ایک نظر اپنے قد پر بھی ڈال لیا کر..... میری فصیح بھول مت جانا، تیرے بھلے کو کہہ رہا ہوں.....“ میں نے اُسے دھتکارا۔ ”جا..... اب نظریں نیچی کر کے چلا جا۔ زیادہ شخصوں کی بازی اچھی نہیں لگتی۔“

”تم نے منڈل کھینچ رکھا ہے۔“ وہ تمللانے لگا۔ ”منڈل سے باہر نکل کر بات کرو۔“

”جب تو بالکل کتے کی طرح اُچھل کود کر رہا تھا، منہ اٹھا اٹھا کر بھونک رہا تھا اُس وقت کیا میں تیری بہن کے ساتھ کچھ بچولی کھیل رہا تھا؟“ میرا خون جوش مارنے لگا۔ ”کالی نے باندھ نہ رکھا ہوتا تو مجھے اسی وقت تیری ماں کے پیٹ میں واپس پہنچا دیتا، تو دوبارہ جنم لیتا تو وہ تیرے کانوں میں سکھ پھونکنے سے مشت مرتجے یہ ضرور سمجھتی کہ پھر کبھی جمیل احمد خاں سے آنکھیں ملا کر اونچی آواز میں بات کرنے کی طاقت نہ کرنا۔ سن رہا ہے مورکھ، میں تجھے کیا اپڈیش کر رہا ہوں.....؟“

وہ پھر پاگل ہو گیا۔ جنوں اور دیوانگی کے عالم میں انسان کو موت اور زندگی کا احساس نہیں رہتا، وہ نتائج پر غور نہیں کرتا۔ وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ بائیس طول پکڑنے کی۔ دوسرے راگبیر بھی قماشہ دیکھنے کوڑک گئے۔ مندر سے بہت سارے چکات پجاری بھی نکل کر باہر آ گئے۔ میرے گرد بھیڑ جمع ہو گئی۔ میں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ

اسے میری کمزوری سمجھ کر پے در پے وار کر رہا تھا۔ میں سید کی لاشی تھا مے کھڑا رہا۔ اُس نے منڈی کے باہر نکلنے والی بات کہہ کر مجھے غصہ دلا دیا تھا، میں چاہتا تو صرف پلکوں کو اشارہ کرتا، وہ پلک جھپکنے میں زمین پر گر کر لوٹنے لگتا۔ میرا اُس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، لیکن ہر بات کی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ وہ حد سے تجاوز کرنے لگا تو میں نے سید کی لاشی اٹھا کر زمین پر ماری، وہ اُچھل کر ہوا میں معلق ہو گیا، اُس کے پیر زمین سے ایک فٹ اُوپر تھے، وہ ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اُس کی لاشی دینی تھی۔

”اب کیا وجہ ہے مورکھ.....؟“ میں نے تھوڑے درشت آواز میں پوچھا۔ ”کھوٹی پر لٹکا رہے گا یا نیچے آنے کا کوئی اوپائے کرے گا؟“

”تم.....“ وہ پھر مجھے آنکھیں دکھانے لگا۔ ”تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو جمیل احمد خاں، تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ جان لو گے کہ تم میری لاشی بھی لرز اُٹھے گی۔“

”نہیں دیپک، نہیں.....“ مجمع میں سے ایک پجاری چیخ اُٹھا۔ ”اسی پلے سے اپنا پرچہ مت کرانا۔ زبان کو تالا لگا لے، میں جا کر مہاراج کو خبر کرتا ہوں۔“

میرے کانوں میں سننا ہٹ شروع ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ پستہ قد نو جوان کا نام دیپک تھا لیکن پجاری نے اُسے اپنا تعارف کرانے سے کیوں منع کیا تھا؟ مہاراج کا اشارہ یقیناً پنڈت نول کشور کی طرف تھا..... پجاری، نول کشور سے کیا کہنے جا رہا تھا؟ میرے ذہن میں وسوسے جاگنے لگے۔ میں نے پجاری کو مندر کی طرف بے تحاشہ بھاگتے دیکھا۔ میں انگلی اٹھا کر اُس کی سمت اشارہ کرتا، وہ جل کر راکھ ہو جاتا۔ لیکن مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں دیپک کو گھورنے لگا جو پاگلوں کی طرح ہوا میں اس طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص زندگی بچانے کی خاطر موت کے ساتھ جدوجہد کر رہا ہو.....

”تو چپ کیوں ہو گیا.....؟“ میں نے اُسے لٹکا رہا۔ ”اپنے بارے میں کیا بتانے جا رہا تھا؟ جو کچھ من میں ہے، اُگل دے۔ میں بھی تو سنوں کہ کس راون یا ہنومان کے کھونٹے اُچھل رہا ہے۔ اُس سینا کا نام بھی بتا دے جس نے تجھے جنم دیا تھا؟“

”اس کی باتوں میں مت آنا دیپک۔“ میری پشت سے کسی دوسرے پجاری نے ہانک لگائی تو میرا تجسس بڑھنے لگا۔ کالی کے مندر کے اندر بڑے بڑے جفاواری پنڈت اور پجاری بھی موجود تھے، لیکن دیپک کے سوا کسی کو میرے سامنے اُچھل کود کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

کسی نے کوشش بھی نہیں کی۔ دیپک نو جوان ہونے کے باوجود میدان میں آ گیا تھا۔ نول کشور نے بھی اُس کی بات رد نہیں کی تھی..... کون تھا وہ؟ پنڈت پجاری اُسے زبان بند رکھنے کی تاکید کیوں کر رہے تھے..... کیا راز تھا؟ کیا کہانی تھی جو مجھ سے چھپائی جا رہی تھی.....؟“

میں نے دیپک کو تیز نظروں سے گھورا۔ میرے لب و لہجے میں سفاکی آ گئی۔

”اپنی زبان کھول دے مورکھ۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تو میری آتما کو لرزانے کی بات کر رہا تھا۔ پھر تجھے سانپ کیوں سمجھ گیا؟ میری آگیا کا پالن کر۔ مجھے بتا دے کہ تو کون ہے؟ نہیں بتائے گا تو میں تجھے پتھر کا کرڈوں گا، تیری گندنی آتما بھی اس پتھر کے اندر موجود ہوگی۔ وہ تجھے احساس دلاتی رہے گی کہ اگر تو نے میرا کہا مان لیا ہوتا تو تیرا ہم پتھر کا نہ بنتا..... ایک بات اور بھی سن لے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں بھی تیرے شریر کے کڑے ٹکڑے کرڈوں۔“

میں نے غضبناک انداز میں اُٹا ہاتھ فضا میں بلند کیا، اسی لمحے میرے سر پر انکارانی کی آمد کا دھماکا ہوا۔ اُس کی مانوس آواز میرے کانوں میں سرسراتی ہوئی اُبھری۔

”جلد بازی مت کرنا جمیل، اگر دیپک مر گیا تو کھیل بگڑ جائے گا۔“

”تم کہاں چلے گئی تھیں.....؟“ میں نے ہاتھ روک کر پوچھا۔ ”تم نے کہا تھا کہ سید نے مانڈا برکنے والی بات ٹھیک ہی کہی تھی۔ تم نے مجھے انتظار کرنے کو کہا تھا، جلدی واپس آنے کا یقین دلایا تھا.....؟“

”میں اُلجھ گئی تھی۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔“ اٹکا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں واپس آ جاتی تو یہ مندر میں چلا جاتا۔ سارا کھیل بگڑ جاتا۔ میں اُس سے غافل بھی نہیں تھی۔ آند بھون سے نہیں یہاں تک لانے میں بھی میری ہی کوششوں کا دخل ہے۔ مجھے مجبوراً اس بار راستہ اختیار کرنا پڑا۔“

”تم مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو؟“ میں نے بڑی عجلت سے کہا۔ ”میں تم سے لکڑی کی بات کر رہا ہوں.....“

”وہ کھانڈ پکی ہے جمیل، جسے تم نے ہوا میں معلق کر رکھا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔

”یہ دیپک پنڈت نول کشور کا منہ بولا بیٹا ہے۔ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے۔“

دے۔ اپنے کسی گرد کو یاد کر۔ کب تک الگٹی پر گندے لنگوٹ کی طرح جھولتا رہے گا۔
”کچھ دیر اور چپک لو جیل احمد خاں۔“ وہ جھلا کر بولا۔ ”تمہاری موت سر پر منڈلا رہی ہے۔ تمہارا انجام بڑا بھیا تک ہوگا۔ تم چاروں اور سے گھر چکے ہو۔ اس بار تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں ملے گا، میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے.....“

دیکھ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا، میں نے اپنی قوتیں آنکھوں میں کیا کر کے پٹلیوں کو گردش دی، وہ زمین پر گر کر قلا بازیاں کھانے لگا۔ اُس کے حلق سے کرینا کچھیں ابھرنے لگیں۔ دو پجاریوں نے آگے بڑھنے کی جسارت کی، میں نے انہیں شعلہ بارنگا ہوں سے دیکھا، ایک کے پٹروں میں آگ لگ گئی۔ دوسرا پکڑا کر زمین پر لوٹنے لگا..... مجمع دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سب کی سٹی گم ہو گئی۔

”کسی اور نے ماں کا دودھ پیا ہے تو وہ بھی سامنے آجائے۔“ میں گرجنے لگا۔ ”معرکہ کھلے میدان میں ہوگا تو سب کو آئے دال کا بھاء معلوم ہو جائے گا۔ جو مندر میں چھپا بیٹھا ہے اُسے بھی باہر نکلنے کو کہو۔ اُسے بتاؤ، کہ فیصلے کا دن آگیا ہے۔ اُس نے آنے میں دیر کر لی تو میں دیکھ کو کتے کی موت ماروں گا۔ تم میں کوئی مرد ہو تو پہلے دھماکے آجائے۔“

ایک ہٹا کن پجاری اُچھل کر سامنے آگیا۔ اُس کے تیور خطرناک نظر آرہے تھے۔ اُس نے ہاتھ پٹھ کر پھونک ماری، زمین سے کوزیا لے سانپ اُٹلے گئے۔ میں حصار میں تھا، سانپ میرا پچھلے پاؤں کاڑھتے تھے۔ اس قسم کے کھیل تماشے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں نے سیدھا ہاتھ فضا میں بلند کر کے زور سے جھٹکا، سانپ کے مقابلے پر نیولوں کی فوج نمودار ہوئی۔ پجاری نے دھماکا دیا، سیاہ ذرات کی آندھی چلنے لگی، سانپ اور نیولے غائب ہو گئے۔ حصار کے چاروں طرف دھواں کی پھیلنے لگی۔ میں نے بند کی لاشی گھما دی، تار کی پلک جھپکتے میں چھٹ گئی۔ پجاری نے فی اوردہا کہے، میں توڑ کرتا رہا۔ پھر میرے مبر کا پٹا نہ لبریز ہو گیا۔ میں نے سیدھا پاؤں زمین پر مارا، پجاری جہاں کھڑا تھا وہاں کی زمین شق ہو گئی۔ پجاری نظروں سے غائب ہو گیا، زمین دوبارہ برابر ہو گئی۔ سب کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ سارے نامرد بن گئے، کسی نے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کی۔ میں سنا پلٹ کر دیکھ کی طرف دیکھا، اُس کی نگاہوں سے بھی خوف جھانک رہا تھا۔ اچانک اوجھٹنے لگا۔

”اُنکا نے اپنی بات جاری رکھی۔“ اُس مرد قلندر کا اشارہ اسی کی طرف تھا۔ یہ مندر میں گھسا بیٹھا تھا۔ مجھے اسے باہر لانے کی خاطر بھی ایک پجاری کو اپنے تابع کرنا پڑا۔ پڑت نول کشور تمہارے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ اُس نے اُن چار پجاریوں کو بھی مردانہ جوتہ پھاڑی گرائی پر مامور تھے۔ دیکھ بھی تمللا رہا تھا۔ میں نے پجاری کے ذریعے اُسے تمہاری اطلاع بھجوائی تو بھاگ کر مندر سے باہر آگیا۔ پنڈت پجاری اسی لئے دیکھ کو منہ بند رکھنے کی تاکید کر رہے ہیں۔ خود بھی مقابلے پر آنے سے گریز کر رہے ہیں۔

”پھنس گئی گوٹ حرامزادوں کی۔“ میرا دل خوش ہے اُچھٹنے لگا۔ ”آگ اپنے گھر میں لگے تو شعلوں کی تپش کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ کل تک وہ میری دیکھتی رہی تو ہاتھ ڈال کر قہقہے لگا رہے تھے، آج میری باری ہے..... اب مزہ آئے گا کیلئے۔“

”میں تمہیں پھر دُور اندیشی سے کام لینے کا مشورہ دوں گی۔“
”بس کرو انکارانی..... بس کرو۔“ میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”میرے شعلے نے ہمیشہ شب خون مار کر مجھے بدحواس کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج میرے ہاتھ پٹی دار ہیں۔ سنہری موقع لگا ہے..... تم جھرتا کو کیوں بھول رہی ہو.....؟ لگے ہاتھوں اُس کا حساب چکنا ہو جائے گا۔“

”میں دیکھ کے سر پر واپس جا رہی ہوں۔ تم سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا.....“
انکا جتنی جلدی میں آئی تھی، اتنی ہی غلٹ میں واپس چلی گئی۔ میں نے نظریں گھما کر مٹی کی طرف دیکھا، مجھے ہنسی آگئی۔ وہ تعداد میں مجھ سے کہیں زیادہ تھے لیکن اُن کے چہروں کی خوف مسلط تھا۔ خوف کی وجہ پنڈت نول کشور کی کمزوری تھی جو میرے ہاتھ آگئی تھی۔ اُن کی نگاہوں میں میرے لئے نفرت ہی نفرت بھری تھی لیکن وہ قدم آگے بڑھانے کی غلطی نہیں کر رہے تھے۔ دیکھ میرے ہاتھوں ”خرچ ہو جاتا“ تو انہیں بھی نول کشور کے سامنے جواب دینا پڑتا۔ میں نے مجمع سے نظر ہٹا کر دیکھ کی جانب دیکھا، اُس کی حالت بڑی مضحکہ خیز نظر آ رہی تھی۔

”چپ کیوں ہے بالک.....؟“ میں نے چٹکی بھری۔ ”اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر دیکھنا شاید کوئی جنتر منتر باقی رہ گیا ہو، اُسے بھی آزما لے۔ بدھی نول..... کسی بڑے کو“

”تم سب کا زہر ہو، بزدل ہو، ڈرپوک ہو۔ گرد و لو کو بلاؤ، اُس سے جا کر کہو کہ میں بارہا ہوں۔ اُنہی کے اتنی دیر کر دی تو یہ مسئلہ مجھے بھی نہیں بخشنے گا۔“

میں سمجھ گیا کہ انکارانی نے اس کو ہشکارا ہوگا۔ میری طرح اُسے بھی پنڈت نول کشور کا انتظار بے چین کر رہا ہوگا۔

”دکس کو آواز دے رہا ہے یا کس؟“ میں نے اُس کا مذاق اُڑایا۔ ”اب تیری سہانیا کو کوئی نہیں آئے گا۔ تو اب میری میز میز میں ہے۔ میں تجھے اپنا سیوک بنا کر اپنے ساتھ لے چلوں گا، اسی میں تیری کتھی ہے۔ تیرے بھوکے پیٹ میں بھی یہی لکھا ہے کہ سارا جیون میرے چپوں میں گزار ہے گا۔“

”تم کوئی سپنا دیکھ رہے ہو جلیل احمد خاں.....“ انکارانی نے شاہجی سے پھر آزاد چھوڑ دیا تھا۔ وہ تیزی سے اُٹھتا ہوا بولا۔ ”تم چپوں کی بات کر رہے ہو، میں تمہارے منہ پر تھوکتا بھی گوارا نہیں کروں گا۔“

”پھر بھونکنا شروع کر دیا.....؟“ میں نے اُسے غضبناک نظروں سے گھورا۔ ”تم اُننگی میز میز کر کے بھی دیکھ لو..... اپنے ارادوں میں پھسل نہیں ہو سکو گے۔“

میں نے جواب دینے کی بجائے اُننگی میز میز کر لی، اُس کے جسم پر نظر آنے والا لباس غائب ہو گیا۔ سب ششدر رہ گئے۔ دیکھ جلدی سے گھٹنے جوڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ مٹا نے اُسے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی، پانچوں اُنگیوں کو باری باری آگے پیچھے ہلانا شروع کر دیا۔ وہ ہندیانی انداز میں چلانے لگا۔ آگے پیچھے جھکولے کھانے لگا۔ کچھ پجاری تیزی سے مندر کی طرف دوڑے، لیکن پھر رُک گئے۔ انکارانی کی سرگوشی میرے کانوں میں گونجی۔

”مبارک ہو جلیل..... چپو نے بوکھلا کر بل سے باہر آ رہے ہیں۔“

میں نے مندر کی سمت دیکھا، پنڈت نول کشور اپنی چنڈال چوڑی کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتا میری طرف آ رہا تھا۔ اُس کے تیور اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، میری آنکھوں میں خون اُترنے لگا۔

”تم نول کشور کو زیادہ ڈھیل مت دینا۔“ انکارانی نے کہا۔ ”جو کچھ کرتا ہو، جلدی کر گزرتا۔“

”اب۔“ آج بہت عرصے بعد ایک دشمن سامنے آ رہا ہے۔ تم جلدی کی بات کر رہی ہو؟ مجھے برسوں کا حساب کتاب چکانا ہے، کچھ وقت تو لگے گا۔“

میں انکارانی سے ہمکلام تھا، دیکھ کو موقع مل گیا۔ اُس نے اُنھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ میں نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا، وہ پھر لباس میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کا حلقہ بنا کر زور سے اپنے سینے پر مارا، دیکھ لڑکھڑا کر زمین پر گرا پھر اس طرح میری طرف لڑھکنے لگا جیسے اُسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری پیش آرہی ہو۔ اُس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ پنڈت نول کشور کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی۔ دیکھ میرے دھار سے ٹکرا کر ڈکٹو میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا۔

”بہت اُچھل کود کر چکا حرام کے ختم، اب خاموشی سے اُنھ کر اکڑوں بیٹھ جا، سر گھٹنوں کے درمیان کر لے، آنکھیں موند لے، جو کچھ ہوگا تجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔“ تیرا گرو دیا آ رہا ہے، اب اُس کی باری ہے۔“ میں نے کسی زہنی سانپ کی طرح پھنکار کر بڑے سناک لہجے میں کہا۔ ”چتا مت کر، میں پہلے تیرے گرد کا کر یا کرم کر لوں، پھر تجھے بھی اسی کے پس پیچ ڈوں گا۔“ خبردار جو ہمارے پیچ ٹانگ پھسانے کی کوشش کی.....“

میں بھلے لب و لہجے میں ایسی گھن گرج تھی کہ دیکھ نے قہقہہ میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے نظریں اُنھ کر سامنے کی طرف دیکھا۔ میرا اور پنڈت نول کشور کے درمیان فاصلہ بڑی تیزی سے گھٹ رہا تھا..... اُس کے گرگوں کے تیور بھی خطرناک نظر آ رہے تھے۔ مجھ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ مارنے کا فیصلہ کر کے کالی کے مندر سے باہر آ گیا تھا۔ میں نے سینہ کی لاشی پر گرفت مضبوط کر لی۔ انکارانی میرے سر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

میری نگاہیں پنڈت نول کشور اور اُن کے ساتھیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سارے کے سارے دس فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رُک گئے۔ میں نے اُن کو گرد کھڑے ہوئے پنڈت پجاری بھی ان کے ساتھ شامل ہونے لگے۔ ان کی پیشانیوں پر اُنہوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ اُن کے تیوروں میں غضب کا سمندر چٹکھاڑ رہا تھا، اُنہوں نے اپنے جسموں پر بھجوت ملا ہوا تھا، عجیب مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے۔ سب ہی کی نگاہوں میں شعلوں کا قہقہہ جاری تھا۔ نول کشور کی پیشانی بڑی کشادہ تھی لیکن وہ فراخ دل نہیں تھا، بڑا کینہ پرور تھا۔ اُسے نہ ہوتا تو بڑی نرائن کی چتا کی چنگاریوں کو کبھی نہ کریدتا۔ وہ مر چکا تھا، میری کلدیپ بھی اس جنگ

میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی، حساب برابر ہو گیا تھا لیکن نول کشور نے تعصب کو ہوا دی تھی۔ نظروں کے بیچ بوئے تھے اور اب اس کی کھڑی فصل لئے میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے وہم میں سیاست شامل کر دی۔ اب لیڈری چکانے کی خاطر باہر آ گیا تھا۔ دیکھ کر میرے قبضے میں آتا تو شاید اب بھی وہ کسی پجارن کے لپٹنے میں چھپا بیٹھا ہوتا، دوسروں کو بلا وجہ نفرت کی بھی میں ٹھوکتا رہتا.....!

اس کی پیشانی پر مجھے شیطانی قوتوں کا جال نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے گیان دھیان میں بڑی آنکھ بیٹھ لگائی ہوگی۔ اس کی نظریں میرے چہرے سے گزر کر دیکھ پر نگ گئیں جو بے بسی سے دم سادھے میرے قدموں میں پڑا تھا۔ اس نے میری طاقت کا اندازہ لگانے کے بعد کسی خاموش رہنا مناسب سمجھا ہوگا۔ ورنہ پہلے بڑی اچھل کود کر رہا تھا۔

”اتنی دُور کیوں نرک گئے نول کشور.....؟“ میں نے سرد آواز میں اسے مخاطب کیا۔
”مجھ پر دیا آ رہی ہے مورکھ.....“ اس نے مجھے خوفناک نظروں سے گھورا۔ اس کے ساتھی کسمسانے لگے۔

”میں دیا کا مطلب سمجھتا ہوں پنڈت مہاراج۔“ میں زہر خند سے بولا۔ ”نہ سمجھتا۔“
دیکھ میرے چہروں میں نہ پڑا ہوتا، اس سے نرک کی سیر کر رہا ہوتا۔
”بڑبڑولے..... بہت زبان چل گئی ہے تیری۔“ اس نے منھیاں بھیجنے لیں۔ ”اس کے بل پر اکڑ رہا ہے جو تیرے سر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہے۔“

”انکارانی کی بات مت کرو نول کشور، اُسے میں نے خاموش رہنے کو کہا ہے۔ ورنہ سب کے لئے وہی کافی ہوتی۔“
جواب میں اس نے فلک شکاف تہقہ لگایا، مجھے باور کرانا چاہا کہ وہ انکارانی سے خوف نہیں ہے۔

”تو اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مورکھ، یہ بڑی ہرجائی ہے۔ کسی ایک کی ہمت نہیں رہتی۔ ایک دن تجھے میری بات اوش یاد آئے گی۔ پرنتو اس سے تجھے سنیلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ میری مان تو اُس کا پیچھا چھوڑ دے، بھگا دے اُسے۔“ وہ تیز آواز میں بولا۔
”اپنی شہتی پر بھروسہ کر۔ گجریوں، بگریوں سے من بہلانا چھوڑ دے۔“

”جیل.....“ انکا تملانے لگی۔ ”یہ حرام زادہ بکواس کر رہا ہے۔ مجھے اجازت دو، میں اس بھاڑ کو دو منٹ میں سیدھا کر دوں گی۔“

”نہیں انکارانی، فی الحال اطمینان سے بیٹھی رہو۔ تمہاری ضرورت پیش آئی تو میں تکلف سے کام نہیں لوں گا۔“

انکا نے ہونٹ بھیجنے لئے۔ اس کی سرخ سرخ نگاہیں نول کشور پر جمی ہوئی تھیں، اُن سے نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”کیا کھس پھس کر رہا تھا اُس ڈیڑھ بالشت کی چھیا سے؟“ دو حقارت سے ہنسا۔ ”ہوا بھر رہی ہوگی تجھے؟..... کیوں؟“

”نہیں.....“ میں نے اُسی کی زبان میں جواب دیا۔ ”مجھے بتا رہی تھی کہ دیکھ کی پیدائش کا اصل راز کیا ہے۔“

نول کشور دیکھ کا نام سن کر تملانے لگا۔ اُس کے تیور بد لئے لگے۔

”زبان کو لگام دے پاپی.....“ وہ غرایا۔ ”میں کالی کے مندر میں بیٹھا تھا تو اس کا کارن کچھ اور تھا۔ تو کچھ اور سمجھ بیٹھا۔ تو جانتا ہے کہ ہم نے بدری نرائن مہاراج کی چتا کی راکھ

منجھل کر رکھی ہے۔ تجھے ٹھکانے لگالیں تو پھر اسے بھی کسی اونٹنے استھان پر بکھیر دیں۔“

”تم اندھے ہو نول کشور.....“ میں گرجنے لگا۔ ”تمہارے ساتھی بھی اندھے ہیں۔ بائیں ہیں جو تمہاری چٹائی پر باتوں میں آ گئے۔ انہیں خبر ہوتی کہ بدری نرائن کتنا بڑا پاپی، کتنا مکار، کس قدر دعا باز تھا تو یہ تمہارے جھنڈے تلے سر جوڑ کر کبھی کھڑے نہ ہوتے۔“

”چپ ہو جا مسلے.....“ نول کشور کے لئے ہاتھ پر کھڑا ہوا ایک ہٹا کنا پجاری خم ٹھوٹک کر سامنے آ گیا۔ ”اپنی گندی زبان سے اس بڑی مہاراج کے لئے ایک شبد بھی اور کہا

زخمی کھات کھڑی کر دوں گا۔“

”مہاراشوں کے ساتھ مخڑی کر رہا ہے دشت.....“ میں نے پجاری کو غضبناک نظروں سے دیکھا۔ ”بڑوں کی باتوں میں دخل اندازی کرتا ہے۔ دیوی کے چہرے کا کھا کر

بل پر تھوڑی چربی چڑھ گئی تو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ مکتی چاہتا ہے تو سر جھکا کر وہاں چلا جا۔“

ان کا ہا ہے راند کے سائے، نظریں جھکا لے، واپس مندر میں جا کر کسی پجارن کے ساتھ

نول کشور کی تیوری کے بل اور گہرے پڑ گئے۔ سادھو کی بات سن کر دوسرے پنڈت پاریوں کی نظریں بھی اُس کی جانب اٹھنے لگیں۔ نول کشور تن کر کھڑا ہو گیا.....
”دیکھ کو ہٹا دے راستے سے۔ پھر میں بتاتا ہوں تجھے کہ کتنے بیسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔“

میں نے ٹھوکر ماری، دیکھ بلبلا تا ہوا دور جا پڑا۔ میں نے سید کی لاشی کو مضبوطی سے فام لیا۔ دوسری طرف نول کشور نے پلٹ کر کالی کے مندر کے بڑے گنبد کی طرف دیکھا، کی بار جھک جھک کر ڈنڈوت کیا۔ پھر اُس نے میری طرف دیکھا، اُس کی نگاہوں میں فطرت بھڑک رہے تھے۔ غصے کی شدت سے اُس کے بدن پر کچلی طاری ہو گئی۔ اُس نے اپنے جنت منتر آزمانے شروع کر دیے۔ میں سینہ تانے کھڑا رہا۔ انکارانی اٹھ کر میرے سر پہننے لگی۔ اُس کے چہرے پر بنجیدگی مسلط تھی۔ نول کشور حملے کرتا رہا۔ وہی کھیل تماشے، وہی شعبدے بازی، وہی تانک جو میں پہلے کئی موقعوں پر دیکھ چکا تھا..... رونما ہوتے رہے۔ کبھی وہ زمین سے چنگی بھر کر میری طرف اچھالتا، کبھی سینے کے بال توڑنے لگتا، کبھی نول کشور دینا شروع کر دیتا، کبھی ہاتھ پاؤں کو اٹھا اٹھا کر جھٹکنے لگتا۔

میں دیر گزشتہ کوئی کو منافقت سے کم نہیں سمجھتا۔ میں اقرار کروں گا کہ پنڈت نول کشور سے کالی کے مندر میں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ میں بدری نرائن کی طاقت سے بھی واقف تھا۔ میں نے دوسرے سینکڑوں پجاریوں کے دم خم بھی دیکھے تھے، اُن کے چسکاروں سے بھی واسطہ پڑ چکا تھا، احرار لال اور پریتم لال کی بات اور تھی لیکن پنڈت نول کشور مجھے سادھو جگدیو کی فکر کا نظر آ رہا تھا۔ انکارانی نے مجھے جگدیو کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ سولہ ہاشی پریتم لال کے دوستوں میں سے تھا۔ اُس کو ماورائی قوتوں کے حصول کا جنون تھا۔ وہ تمام زندگی جگہوں اور پہاڑوں کی خاک چھانک رہا تھا، جہاں بھی کچھ ملتا اٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال لیتا۔ ایک بار وہ اپنی عظیم طاقت کے حاملہ بیسی غلطی سے پریتم لال سے بھی کھرا گیا تھا۔ پھر اُس نے اپنی شکست بھی بڑی مردانگی سے قبول کر لی اور بچے دل سے ہمیشہ کے لئے پریتم لال کا ہاتھ تھام لیا۔ جب تک زندہ رہا، تن من چھن سے پریتم لال کا سیوک بن کر اُس کی خدمت کرتا رہا، اُسی کے گن گاتا رہا۔
پنڈت نول کشور کے اندر مجھے دوسرا سادھو جگدیو نظر آ رہا تھا۔ دیکھ کی وجہ سے وہ پاگل

”میرا ہاتھ اٹھ گیا تو بھاگے راستہ میں گئے۔“
پجاری کے ہونٹ ہلنے شروع ہو گئے۔ میں اختصار سے کام لوں گا، میں نے اُسے ڈھیل نہیں دی۔ ایک ہی وار میں جہنم رسید کر دیا۔ اُس کے دوسرے ساتھی نول کشور کی جانب دیکھنے لگے۔

”اپرا دھی.....“ نول کشور کے تئیر بدلنے لگے۔ ”تو شرافت سے میری بات نہیں سمجھے گا۔ تیرے لئے کوئی اوپائے کرنا ہو گا۔“
”اوپائے تو تم کر چکے تھے نول کشور میں تیرے کیا نکلا؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
”میں تمہاری کالی کی تمام شکلیوں کو نچا دکھا کر باہر نکلا، اب تم سب ٹاپے رہ گئے۔ اب تم کو بھی باہر آنا پڑا، دیکھ کے لئے۔“
”اُسے چھوڑ دے۔“ نول کشور نے جھلا کر جواب دیا۔ ”بالکل میرا ہاتھ اٹھانا مہا پرشوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔“

”چھوڑ دوں گا.....“ میں نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ ”سنا ہے تو دیکھ کو موت باہر نکلتا ہے۔ اصلیت کیا ہے.....؟“
پنڈت نول کشور چپ اٹھا، پیچ و تاب کھانے لگا۔ اُس کے چہرے پر ماورائی قوتوں کا جال پھیلنے لگا۔

”جمیل.....“ انکارانی پہلو بدل کر بولی۔ ”تم وقت برباد کر رہے ہو۔ کھیل جلدی سے نمٹا کر یہاں سے نکل چلو۔“

”تم نے جواب نہیں دیا مہاراج۔“ میں نے نول کشور پر طنز کے تئیر برسانے شروع کئے۔ ”آج تو اپنی اُس رکھیل کا شبہ نام بتا دو جس نے تمہاری اس پاپ کی نشانی کو جہنم دیا تھا۔ وہ زندہ ہے یا تم نے اپنا پاپ چھپانے کے کارن اُسے بھی جہنم کی طرح زبان کاٹ کر گوشتی کر دیا؟“

”مہاراج.....“ ایک سادھو نے مجمع سے نکل کر نول کشور سے کہا۔ ”یہ پاپی مسلا جو میں میں آئے ہو بے چلا جا رہا ہے۔ تم کالی کے مندر کے بڑے پروہت ہو، مہا پرش ہو۔ تمہاری شہتی اپرم پار ہے پھر اسے جلا کر بھسم کیوں نہیں کر دیتے؟ اس دشت کی زبان کاٹ کر پھینک دو۔ پورا ہرودا تمہارے ساتھ ہے..... کس بات کا وچار کر رہے ہو؟“

میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ اچانک چار چھ بٹے کئے پجاری شیوا کو گھسیٹتے ہوئے سامنے لے آئے۔ میں نے شیوا کو دیکھا تو میری آنکھیں چمکے لگیں..... میں نے چیخ کر کہا۔ ”نول کشور، ابھی تک تم جنت منتر کے کھیل تماٹھے دکھا رہے ہو، میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی اختیار کئے کھڑا ہوں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ تم اپنی ترکش کا آخری تیر استعمال کر دیا میں جوانی حملہ شروع کروں..... تمہارے گندے بوجھ سے دھرتی کو چھڑکا رادلاؤں، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میری بات دھیان سے سن لو“ میری آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ”تم نے پنڈت شیوا پر جو الزام لگایا ہے اس میں کوئی صداقت، کوئی سچائی نہیں ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں نے شیوا کی زندگی صرف اس لئے بخش دی تھی کہ میں اُس کے ذریعہ انہیں اپنا پیغام پہنچانا چاہتا تھا۔ شیوا نے آخری وقت یہی کہا تھا کہ وہ ڈر کر بھاگے گا نہیں، میں اُسے مار دوں..... سن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟ تم شیوا کی طرف سے اپنا من ماف کر لو، میں اُس کی خاطر تمہیں ایک آخری موقع اور دینے کو تیار ہوں۔“

”تم..... تم یہ کیا حماقت کی باتیں کر رہے ہو جیل.....؟“ انکارانی جھلا کر بولی۔ ”نول کشور کو ختم کر دو..... مار ڈالو، میری بات مان لو۔ کھیل ختم کرنے کی کوشش کرو۔“

”تم اس وقت درمیان میں اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش مت کرو۔“ میں نے انکا دل سے کہا۔ ”ایک بار تمہارے دل میں بھی گرہ لگی تھی کہ میں نے شیوا کو زندہ کیوں چھوڑ دیا.....؟ یاد ہے..... آج میں اس گانٹھ کو بھی کھولنا چاہتا ہوں۔“

”بات کو سمجھنی کا کوشش کرو جیل.....“ اُس نے متوحش نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”نول کشور جو آخری داؤ استعمال کر کے بے ہنگم رہا ہے وہ تمہاری توقعات سے زیادہ خطرناک ہے۔ اُسے موقع مت دو۔ میرے دل میں تمہاری طرف سے اب کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ لیکن چاہوں بھی تو تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں سوچ سکتی۔“

انکارانی کا آخری جملہ میرے لئے توجہ طلب تھا۔ اس سے پیشتر اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں اُس کی مجبوری کا سبب جاننا چاہتا تھا میری توجہ بٹ گئی۔ پنڈت نول کشور کو شاید اسی موقع کی تلاش تھی۔ وہ اپنا وار کر گیا۔ اُس نے مجھ کی جلدی ہوئی چٹیا کو پوری فٹ سے جھٹکا دیا، کئی بال ٹوٹ کر اُس کے ہاتھ میں آ گئے۔ اُس نے بالوں پر جلدی جلدی کچھ پڑھ کر میری طرف اُچھال دیا..... فضا میں بجلیاں کڑکنے لگیں۔ ایسی آوازیں گونجنے

سنائی دیا۔ شاید میری کہانی پچھلے دور کی تھی۔ میں وہ جوش میں تھا، ہوش سے کام نہیں لے رہا تھا۔ کسی کا پیچہ بھڑکتی آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ میرا حصار کئی بار اُس کے حملوں سے ٹوٹنے ٹوٹنے رہ گیا، کئی بار مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی گتے کے بڑے ڈبے میں بند ہوں، کوئی جیڑی شخصیت کا مالک مجھے ابھر ابھر آٹ پلٹ رہا ہے..... اُسے صرف میری انہی قوتوں کا اندازہ تھا جو مجھے پریتالال، آندلال اور جلدیو کے ذریعے ملی تھیں۔ کل دیپ کی آتما میرے کام آتی رہی تھی۔ گنگو کے دوران اُس نے مجھے سب کچھ بتا کر حیران کر دیا تھا۔ لیکن دوسرے پجاریوں کی طرح وہ بھی ہندا کی بخش ہوئی قوتوں اور تہت میں گزاری ہوئی میری زندگی کے سنہرے باب کے حلقے بے خبر تھا۔ سید کی لائیں کے بارے میں بھی اُن کے فرشتوں کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ میرے پاس یہی دو حربے تھے جو انہیں زیر کر دیتے تھے۔

پنڈت نول کشور متواتر حملے کرتا رہا۔ پھر اُس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر اپنی چٹیا کو منٹھی میں جکڑا تو انکارانی نے تیزی سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”سنبھلنا جیل..... اب یہ وہ داؤ آزمانے جا رہا ہے جو اس سے پیشتر کسی پنڈت پجاری نے نہیں آزمایا۔ میری مانو تو اسے ڈھیل مت دو، جتنی جلدی ممکن ہو اس کا کھیل ختم کر دو۔“

”تم پریشان مت ہو..... تماٹھے دیکھتی رہو۔“

”یہی تمہاری غلطی ہے۔“ وہ تھملانے لگی۔ ”تم میری بات نہیں مانتے، اپنی من مانی کرتے ہو۔“

میں نے جواب نہیں دیا، میری نگاہیں نول کشور پر جمی تھیں جو اپنی چٹیا تھامے کھڑا مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہے نول کشور.....“ میں اُسے بھڑکانے کی خاطر زہر خند سے بولا۔ ”تم اب اپنا آخری داؤ استعمال کرنے کی سوچ رہے ہو، تمہیں یہ دو چار بھی بیا کل کر رہا ہوگا کہ اگر تمہارا داؤ کام نہ آیا تو کیا ہوگا..... کیوں؟ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”من میں کچھ اور گند بھرا ہو تو وہ بھی نکال دے۔“ نول کشور زخمی شیر کی طرح دھاڑا۔ ”پاپی، دشت، من کی ساری آشنائیں پوری کر لے، اس کے بعد سے تیرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

لگیں جسے ہزاروں پدرویں چھی رہی ہوں۔

مجھے اپنے جسم پر کھینچ دینے کا احساس ہوا۔ میں نے جسم پر نظر ڈالی تو ششدر رہ گیا۔ میں ننگا کھڑا تھا۔ میرے جسم پر سیاہ سیاہ آبلے نظر آرہے تھے۔ میں نے جو حصار قائم کیا تھا وہ ٹوٹ چکا تھا۔ پنڈت پجاریوں کے چہرے خوشی سے تھمتھانے لگے۔ سید کی لاشی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے قدموں میں گر گئی تھی۔ میں اُسے اٹھانے کے ارادے سے جھکا، نول کشور کو ایک موقع اور مل گیا۔ اُس نے برق رفتاری سے گلے میں پڑا ہوا ضیو اُتار کر میری طرف اُچھالا، میں رسیوں میں جکڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل نہیں رہا۔ انکارانی میرے سر سے اُتر گئی۔ میں سید کی لاشی پر کھنکھناتے منہ گرا۔ جب اچانک کوئی افتاد خلاف توقع آپڑے تو ایک لمحے کو انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ اُس کے ہاتھ پیر بھول جاتے ہیں، کچھ بھائی نہیں دیتا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ سب کچھ میری توقع کے خلاف ہوا تھا۔ بازی ایک دم سے پلٹی تھی۔ انکارانی نے کہا بھی تھا کہ نول کشور وہ آخری حربہ استعمال کرنے کی سوچ رہا تھا جو اس سے پیشتر کسی پنڈت پجاری نے نہیں کیا تھا۔ انسان ہمیشہ غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے۔ مجھے بھی کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ہو گئی تھی، نول کشور کو موقع مل گیا۔ اُس نے تازہ توڑ حملے شروع کر دیے۔ لیکن اُس نے ابھی تک میرے قریب آنے کی ہمت نہیں کی۔ اُس کی دیکھا دیکھی اُس کے چیلے بھی دُور ہی دُور کھڑے تھے۔ پھر ایک پنڈت نے جو نول کشور کے سیدھے ہاتھ پر کھڑا تھا چیخ کر شیوا سے کہا۔

”تیرے امتحان کا سہ آگیا شیوا..... آگے بڑھ کر اس مسئلے کا قصہ پاک کر دے، ہم تجھے شام کر دیں گے، تجھے پھر وہی مان ملے گا جو تو نے کھودیا تھا۔“

پنڈت نے دھوتی کے اندر چھپا ہوا شکاری چاقو نکال کر شیوا کی طرف اُچھالا۔ شیوا چاقو پر گرفت جما کر بجلی کی سرعت کے ساتھ میرے قریب آگیا۔ بوکھلاہٹ میں، میں کوئی جوابی کارروائی کرنا بھی بھول گیا..... شیوا کی آنکھوں میں خون اُبل رہا تھا۔ وہ اُچھل کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ لات مار کر اُس نے مجھے چت کیا۔ اُس کا سیدھا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ موت کا تصور پلکوں کے نیچے اندھیرا بن کر لہرا نے لگا..... میرے ہاتھ کی رسیاں کٹ گئیں۔ میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ شاید میں پھر کسی خوش فہمی کا شکار ہو رہا تھا جب شیوا میرے جسم سے لپٹ گیا۔ اُس نے دوسروں کو بھی

تازہ دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ میرا گنا گھونٹ کر مارنا چاہتا ہے۔ اُس کی آواز سرسراتی ہوئی میرے کانوں میں گونجی۔

”تم نے میرا جیون مجھے دان کر دیا تھا۔ میں تمہارے دان کئے ہوئے جیون سے تمہارا ہی خون نہیں کر سکتا تھا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام، میں نے اپنا دھرم اِپدیش بھیادیا۔ کر تو یہ پورا کر دیا.....“

میں نے ہاتھ آزاد ہوتے ہی سید کی لاشی پکڑ لی۔ ارٹکار اور مراقبے کا عمل کرتا ہوا تیزی سے اٹھا، حصار کھینچنے میں بھی بڑی عجلت سے کام لیا۔ نول کشور اور اُس کے ساتھی حیرت زدہ رہ گئے۔ اُن کی تہر آلود نظریں موقع کی نزاکت بھانپ کر شیوا کی جانب اٹھنے لگیں۔ میں نے بند کی لاشی اٹھا کر اُس کا رخ پنڈت نول کشور کی سمت کر دیا۔ وہ فضا میں اُچھل کر زمین پر جاؤں شانے چت گرا۔ میں نے اس پجاری کی سمت دیکھا جس نے شیوا کو شکاری چاقو دے کر میری طرف بھیجا تھا۔ میں نے اُٹنا ہاتھ اُس کی طرف کر کے اُٹھکیاں جھٹک دیں۔ وہ بھی زمین پر گر کر ترپنے لگا۔ پھر اُس کا جسم اڑ گیا۔ میں نے اپنے جسم کے آبلوں پر بھونک ماری، ساری سوزش ختم ہو گئی۔ تمام چھالے اور داغ دھبے دُور ہو گئے۔ میں لپک کر اُٹھ کر اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ اُس کے ساتھ کھڑے ہوئے پجاری میری وحشت دیکھ کر کان کی طرح پھٹ گئے۔ بہت ساروں نے دھوتیاں سنبھال کر مندر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

پنڈت نول کشور میرے جسم کا توڑ کر کے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سید کی لاشی اُس کے سر پر ماری۔ اُس کی ٹلو پٹی دو جھون میں منقسم ہو گئی..... مجھے نکل کر باہر آگیا۔ وہ ماسی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر کھنکھاتا رہا..... جھوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ پنڈت پجاری کالی کے مندر کی طرف بے تحاشہ بھاگنے لگے۔ وہاں پر تماشائی بین بھی تتر بتر ہو گئے۔ دیکھنے والے نے گج جان بچانے کی خاطر دوڑ لگا دی۔ میں اُسے بھی پنڈت نول کشور کے ساتھ ہی جہنم کے سز پر روانہ کرنا چاہتا تھا۔ شیوا نے اس کی سفارش کی تو میں نے اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے گرا لیا۔ میدان میں صرف شیوا رہ گیا۔ میں قدم اٹھاتا اُس کے قریب چلا گیا۔

”شیوا.....“ میں نے اُسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ ”میں تمہارا احسان کی نہیں.....“

”اگر کس بات کا.....؟“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”میں نے حساب برابر کر دیا۔“

”میرے ساتھ چلو شیوا.....“ میں نے اُسے دعوت دی۔ ”میں تمہارے اوپر آنکھ بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہوں۔ ہم ایک اور ایک مل کر گیارہ بن جائیں گے۔“

”نہیں مہاراج.....“ میں نے مہاراج کہہ کر میری برتری تسلیم کر لی۔ میری دعوت ٹھکرا کر بولا۔ ”میں کالی کا سیوا ہوں..... میں نے کالی کے چرنوں میں جنم لیا تھا، میرا انت بھی دیوی کے چرنوں میں ہی ہوگا..... تم جانتے ہو۔“

میں شیوا کو سمجھانا چاہتا تھا کہ پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی تیز آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ ڈر کر بھاگ گئے تھے۔ سب اُن کی مخبری پر شاید پولیس نے مجھے گھیرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ دو تین لاشوں کی موجودگی میں مجھے قاتل ثابت کرنا اُن کے لئے زیادہ دشوار نہ ہوتا..... شیوا بھی فکر مند نظر آئے گا۔ میں فرار کا کوئی راستہ تلاش کرنے کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ انکارانی میرے سر پر واہل آئی..... میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”اب کیا ہوگا انکارانی.....؟ وہ پھر میرا وقت برباد کریں گے۔ چندرا کو غور کر لے۔“

موقع مل جائے گا۔“

انکارانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اپنے پنجے اتنی شدت سے میرے سر میں چھبوائے کہ میں سنبھل نہ سکا۔ میری نظروں کے نیچے گھپ اندھیروں کے بادل تیرنے لگے.....!!



میرے ذہن پر طاری دُھند آہستہ آہستہ چھٹ رہی تھی۔ ایک ہلکی سی ملکیتی چادر جیسی ہر کی اب بھی درمیان میں حائل تھی۔ اس تاریکی کے اُس پار میرا ماضی دفن تھا۔ میری کتاب زندگی کے اوراق جا بجا بکھرے پڑے تھے، ان پر حالات اور گزرتے وقت کی گرد جم چکی تھی۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ پڑھنے والے میری داستان کا کیا اثر قبول کریں گے؟ جس کے دل پر گزرتی ہے، تکلیف کی شدت کا اندازہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ تنقید کرنا، ہال کی کھال نکالنا بڑا آسان کام ہے۔ اپنی کرنی انسان کو سوئی جیسی لگتی ہے۔ کوئی دوسرا وہی غلطی کرے تو شہتیر بن جاتی ہے۔ میں شکوہ نہیں کر رہا، مجھے شکوہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ روزِ محشر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو جائے گا۔ سب کے افعال پر اسے اُن کے اپنے اپنے ہاتھوں میں ہوں گے۔ وہاں تنقید کرنے کی اجازت نہیں ہو گی، جسم کا ایک ایک عضو گواہی دے گا، انکار کرنے کی جسارت کسی ہائی کے لال میں نہیں ہو گی، سب دم سادھے کھڑے ہوں گے، اپنی اپنی فکروں سے اتنی مہلت ہی نہیں ملے گی کہ دھروں کی طرف دیکھ سکیں، دھروں میں کیڑے نکال سکیں..... یہ گل افشائیاں، یہ چھیڑ چھاں، ایک دوسرے پر کچڑ اچھالنا، اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنا، دوسروں کی خامیوں کا دُھورا پیشنا، محفلوں میں بیٹھ کر ڈیلیں مارنا، اپنی امارت کا اظہار کرنا، غیروں پر پھبتیاں کرنا، جیلے بازی کرنا، طاقت کے بل پر اُچھل کودنا..... یہ سب کچھ یہیں، اس دنیا میں رہ جائے گا۔ وہاں دوسروں کی عزت پر شب خون مارنے کی اجازت نہیں ہوگی، کسی کی بہو بیٹیل کے سر سے دوپٹہ کھینچنے کی مجال نہیں ہوگی، دھن دولت کسی کام میں آئے گی۔ قانون کی فریاد فروخت کا کاروبار نہیں چلے گا۔ دنیا دکھاوے کو اشک شونی سرخ، دھجک اور ناکلف رہانے کے مواقع نہیں ملیں گے۔ ”بغل میں چھری اور لب پر رام رام“ کی لڑی کہانیاں دھڑکی کی دھڑکی رہ جائیں گی۔ سارے کچے چٹھے مثل آئینہ روشن ہوں گے، ساری قلعی اُتر

جائے گی، غلظت اور پاؤڈر..... سارا میک اپ دھل جائے گا۔ اصلیت کھل کر سامنے آ جائے گی۔ روزِ عجب کی تمام تفصیل، ساری روداد سامنے ہوگی۔ انجام کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا، وکیلوں کے وکلاء کے چکر نہیں کاٹنے ہوں گے، منصف کے قلم پر ”نا قابلِ فروخت“ لکھا نظر آ جائے گا۔ ایک منصف ہوگا، اُس کا ایک ہی فیصلہ ہوگا۔ اس پر عملدرآمد میں پلک جھپکنے کی تاخیر بھی نہیں ہوگی۔

وہاں پنڈت امر لال، بدری نرائن، برکات شاہ، سید مجذوب، میں اور آپ سب ایک قطار میں، ایک ہی صف میں سر جھکائے با ادب کھڑے ہوں گے۔ نہ انکارانی کا زور چلے گا، نہ پریم لال اور سادھو جگدیو کے جنتر منتر کام آئیں گے۔ نہ لال اور کپالا بھی سرنگوں ہوں گے۔ کچھ چہرے مثل آفتاب چمک رہے ہوں گے، کچھ بے گنہگاروں کے باوجود اُس کے قہر سے لرزیدہ ہوں گے، کانپ رہے ہوں گے۔ وہاں ماضی، حال اور مستقبل کا کھیل ختم ہو جائے گا۔ سارے سودے، سارا کاروبار ہاتھ کے ہاتھ ہوگا، نقد کام ہوگا۔ کسی ہاتھ سے اس ہاتھ لے.....! ”میاں کی جوتی میاں کے سر“ کی مثال کا اصل مطلب واضح ہو جائے گا۔ احتجاج کی گنجائش نہیں ہوگی۔ سارے شور و شرابے، ساری اُچھل کود، نام و نمود کچھ بھڑیاں صرف زمین پر اپنی چھب دکھا سکتی ہیں، آسمانوں پر اُس کا نظام بڑا صاف و شفاف ہوگا۔ کسی پرندے کو پر مارنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ محض نام کے ساتھ پیر زادہ، عادل زادہ یا امیر زادہ لگا لینے سے کام نہیں چلے گا..... اُلٹے سیدھے بیان داغنے کی مہلت نہیں ہوگی۔ جو بویا ہے وہی کاٹنا پڑے گا۔ پیر پندہروں کے متبرک اسمائے گرامی.....

اولیاء، انبیاء..... اور خدا کے برگزیدہ بندوں کے ناموں سے ملتے جلتے ناموں کو جنت کی سند نہیں حاصل ہوتی۔ لوگوں نے دستور بنالیا ہے کہ بچوں کا نام رکھتے وقت بڑی بڑی کتابوں کو کھنگالا جاتا ہے، جو نام فہرست میں شامل کئے جاتے ہیں، صرف ان کے صوتی حسن کا خیال ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے، اس کی عظمت اور احترام کو بالائے طاق رکھ کر ان ناموں کے جز یا اجزاء کو کلی پسندوں کی طرح نومولود کے نام کے ساتھ تھی کر دیا جاتا ہے۔ ان باتوں سے بخشش نہیں ہوتی۔ سب دل کے بہلاوے ہیں، دھکوسلے بازی ہے، بس ایک بات سن لو، گرہ سے باندھ لو..... ”سب ٹھانڈھ پڑا رہ جائے گا جب لاو چلے گا بھاریار“ میں کوئی لاطینی زبان نہیں بول رہا، فلسفہ نہیں بگھار رہا جو بات سمجھ میں نہ آ سکے۔ جان

بوجھ کر انجان بننا اور بات ہے، مجھے کسی اور کی نہیں اپنی قبر میں جانا ہے۔ میری سرگزشت بھی میرے پیش نظر ہے۔ میری کہانی بڑی رنگین ہے لیکن اس کے نانچ رنگین نہیں، سنگین ہوں گے۔ میں نے کبھی اپنی پارسائی کا دعویٰ نہیں کیا، میں نہیں جانتا کہ میری داستان پڑھنے والے اس کا کیا تاثر قبول کریں گے۔ لیکن ایک حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوگا، میں نے ایک عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ نامساعد حالات میں زندگی بسر کی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اس جہنم میں چھلانگ نہیں لگائی تھی، انکارانی میرے سر پر خود سے آئی تھی، اس میں میری مرضی، میری خواہش کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ بے پناہ ہراس راقوتوں کی مالک تھی، اُس کے بچے جب جلد میں چھپتے ہیں تو میرا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے، ذہن ماؤف ہو تو انسان صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کر سکتا۔ طاقت کا تصور، دوسروں پر برتری کا احساس، دولت، عزت اور شہرت کا نشہ یہ سب باتیں انسان کو بہکا دیتی ہیں، اندھا کر دیتی ہیں۔ میں نے شروع میں ضرور کترانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ”خون کا مزہ“ منہ کوگ جانے کے بعد میں بھی بہک گیا، اندھا ہو گیا، درندہ بن گیا..... میں نے اپنی داستان کا کوئی حصہ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ جو واقعات رونما ہوئے، جس تواتر سے پیش آتے رہے اسی ترتیب سے بیان کیا۔ کاست قلم بند کرتا رہا۔ میں نے جو صدمے برداشت کئے، جن اذیتوں سے گزرا، جن عبرت انگیز اور ناقابل یقین واقعات اور مشاہدات سے میرا واسطہ پڑا ہے اسے انسان کا ذہن قبول نہیں کرتا۔ کبھی کبھی خود مجھے بھی ایسا شبہ ہوتا ہے جیسے جو کچھ میں نے دیکھا، جو میرے اوپر گزری وہ سب میرا وہم تھا..... خواب رہا ہوگا.....!

میرے پاس انکارانی کی عجیب و غریب قوت تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کم اور انکارانی کی آنکھوں سے زیادہ دنیا کے عجیب و غریب مذاذ دیکھے۔ اُسی کی نظروں سے انسان کو اندر سے کھگانے کی کوشش کی۔ میری یہ داستان جب آخری موڑ پر پہنچے گی تو شاید آپ مجھ سے بہتر کوئی نتیجہ اخذ کر سکیں، میں نے کیا کھویا؟ کیا پایا؟ کیا گنوا دیا؟ کیا حاصل کیا.....؟ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پنڈت پجاریوں کی دشمنی نے ہندوستان کی زمین کے چپے چپے پر میرے دشمن پیدا کر دیئے تھے، مجھے کہیں قدم جمانے، کہیں چھپنا، کوئی سستانے کی مہلت نہیں تھی۔ میں کسی ستارے کی طرح روز و شب گردش میں رہتا تھا۔ چمکی کا ناگنگل لینے کے بعد شکاری کے دم و کرم پر ہوتی ہے۔ خشکی پر آنے سے جیشتر اپنا پورا زور لگاتی ہے،

تڑپتی ہے۔ پھر پڑاتی ہے۔ میری کیفیت بھی اسی سے ملتی جلتی تھی۔ میں بے دست و پا ہو جاتا تو میرے دامن کے کلیجوں میں غنڈک پڑ جاتی۔ میں ذرا آسودہ حال ہوتا تو دو پھر میرے گرد اپنا گھیراؤ شروع کر دیتے۔ مجھے اپنے بچاؤ کے لئے پھر ہاتھ پھیر چلانے پڑتے۔ تالی ایک ہاتھ سے تھپکے بجاکرتی۔ کون ہاتھ قصور وار ہوتا ہے کون بے قصور؟ یہ جھگڑا ازل سے چل رہا ہے، ابد تک چلا رہے گا۔ سیاہ و سفید کا فیصلہ زمین پر نہیں آسمان پر ہوگا۔ اپنے منہ میاں مٹھوین کر اترانے کے لئے سکون نہیں ملتا۔ ایسا کرنے والے خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں.....!!

میں اُس وقت بھی بڑا بے سکون تھا جب ملکی باریک چوہ کی تاریکی بھی رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ میرا ذہن پوری طرح کام کرنے لگا۔ میں حیرت کے اس آہام و کمرے کو دیکھنے لگا جہاں ایک درمیانے درجے کے آدمی کی ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ مجھے یاد آیا، میں نے ہر دور میں کالی کے بڑے مندر کے سامنے اپنے ایک دشمن پنڈت کو کھانا پیش کیا۔ مندر کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ دو تین پنڈت پجاری اور بھی بلا وجہ ہمارے درمیان آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ مجھے اُن کی موت کا کوئی غم نہیں تھا۔ نول کشور کی موت میرے لئے باعث مسرت تھی۔ میں اُس کی لاش پر چتا کی آگ تک پہنچنے سے پہلے اپنی کامیابی کا جشن منانا چاہتا تھا۔ سید نے بھی اشارے کنایوں میں تالی بجانے اور تھرکنے کا ذکر کیا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ مگر میری یہی خواہش تھی کہ دو چار ٹھیکے ضرور لگا لوں۔ مگر اس کی فرصت نہیں ملی..... نول کشور کی موت کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا، وہ کالی کے بڑے مندر کا پروہت تھا، اُس کی موت کی خبر جنگ کی آگ کی طرح پھیلی ہوگی۔ پنڈت پجاری مندر کے تہہ خانوں میں چھپ کر بیٹھ گئے ہوں گے۔ اُن کے دل تا دیر سینوں میں دھڑکتے رہے ہوں گے..... کسی نے پولیس کو نوٹ پر اطلاع دی ہوگی کہ ایک مسلمان نے ایک ہندو پنڈت کو مار ڈالا۔ ہر طرف تہلکہ مچا ہوگا، قانون کے محافظوں کے ذہن بھی تعصب کا شکار ہو گئے ہوں گے۔ اسی تعصب کی آڑ میں بے گناہ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگانے کا سنہری موقع بھی بلوائیوں کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ انتہا پسند اپنی اکثریت کی بنیاد پر کمر کس کر مردانگی دکھانے کی خاطر میدان میں نکل آتے ہیں، دُکانیں لوٹی جاتی ہیں، عصمتیں روندی جاتی ہیں، معصوم اور نو جوان لڑکیوں کو سر بازار نگا کر دیا جاتا ہے، ان کے ہاتھ پشت پر ہاتھ

دیئے جاتے ہیں۔ وہ اجتماعی زیادتی کا برملا مظاہرہ کرتے ہیں، اپنی بہادری پر شیطانی تعصب بلند کرتے ہیں۔ بوڑھے اور ضعیف لوگوں کا بھی قتل عام شروع ہو جاتا ہے، شیر خوار بچوں کے حلق میں چھرے گھونپ دیئے جاتے ہیں، حکومت کے ماتھے پر بھی مل آ جاتا ہے۔ پڑھے لکھے سیاستدان بھی بیان داغنے وقت مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، تعصب کا الزام بیٹھ اقلیت پر ہی لگایا جاتا ہے، اکثریت کے خلاف زبان کھولنے والے مافیا کے دہشت گردوں کے ہاتھوں مار دیئے جاتے ہیں۔ جان بوجھ کر کون اپنی موت کو دعوت دیتا ہے.....؟ میرے ذہن میں آمدنی چل رہی تھی، مجھے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ میں نے دیکھ کو مندر کی جانب جان بچا کر بھاگتے دیکھ کر اپنا ہاتھ اٹھایا تھا، شیوانے اُس کی زندگی کی سفارش نہ کی ہوئی تو وہ بھی کام آ گیا ہوتا..... میں نے شیوانے کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی تھی، اُس نے کسی ہنگامہ کے بغیر بڑی جواہر دی سے میری پیشکش رد کر دی۔ اُس نے کالی کے قدموں میں آنکھیں کھولی تھیں، اُس کے چہرے میں مرنے کا خواہش مند تھا۔ میں اُسے قاتل کرنا چاہتا تھا کہ وہ غلطی پر ہے، کالی کا مندر اُس کے لئے قاتل گاہ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ مندر کے لوگ گواہ بن چکے تھے کہ پنڈت نول کشور کے قتل کی ذمہ داری شیوا پر بھی عائد تھی۔ اُس نے مجھے مار دیا ہوتا تو کہانی وہیں ختم ہو جاتی۔ پنڈت پجاری اُسے کا ندھوں پر اٹھا بیٹھے، چوکی کی شکل میں گلی کوچوں میں چکراتے پھرتے، شیوا کے نام کی ”جے جے کا“ گونج رہی ہوتی۔ وہ نول کشور کا نائب بھی مقرر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن شیوانے ایسا نہیں کیا، وہ مرد تھا، اُس کی گلیوں میں دُشمنوں کا خون نہیں، کسی خاندانی باپ کا خون گردش کر رہا تھا۔ میں نے اُس پر جو احسان کیا تھا شیوانے اس کا حساب برابر کر دیا۔ میرے ہاتھ کی بندش کا نئے وقت اُس کا دل ضرور دھڑکا ہوگا، اُسے علم رہا ہوگا کہ وہ اپنی موت کے بدلے اپنے پر خود اپنے خون سے اگلوٹھا لگا رہا ہے۔ میں اُس کے قدم نہیں ڈمگائے، وہ موت سے نہیں ڈرا..... بازی میرے حق میں چلتی گئی، نول کشور کا ماتھ گیا، اُس کی موت اذیتناک ہوئی تھی..... اور شیوا اسی کالی کے مندر میں واپس جانے کی بات کر رہا تھا جہاں ہر کوئی اُس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوگا..... میں اُسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ غلط فیصلہ کر رہا ہے لیکن مجھے اس کی مہلت نہیں ملی۔ پولیس کی سائرن بجاتی گاڑیاں گردش میں آئیں۔ میں جانے لگا۔ اُن کے رینگے ہاتھوں پکڑ لیا جاتا تو شاید شیوا کی گواہی بھی میرے کسی کام نہ آتی،

دین کے مزاروں پر حاضری کی سعادت حاصل کر لیتا۔ بہی واپسی ممکن ہو جاتی تو تزئین کو ہی دیکھ لیتا۔ ایک وہی تو تھی جو میری زندگی کا سب سے قیمتی اور اصول نگیز تھی۔ اشرفی بیگم سے اُسے چھیننے کی خاطر کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ میری اور میری کلدیپ کی مشترکہ منظور نظر تھی۔ اُس کو دیکھ کر زنگس کی یاد آ جاتی تھی..... تزئین کو یاد کر کے میں بے چین ہونے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انکارانی نے اتنی لمبی چھلانگ کیوں لگائی تھی؟

”کس غور و فکر میں جتلا ہیں محترم.....؟“ رکن الدین نے میری مسہری کے قریب آ کر بڑی محبت سے دریافت کیا۔

”میں یہاں کب آیا تھا.....؟“ میں نے رکن الدین کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کل رات ہی کی بات ہے جب آپ نے اس حقیر کی حویلی کو دوبارہ عزت بخشی.....“ رکن الدین کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”طلعت نے دروازے پر جا کر آپ کا نام دریافت کیا، پھر وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اُس نے آپ کی آمد کی اطلاع دی تو مجھے یقین نہیں آیا۔ آپ کی طبیعت اُس وقت ٹھیک نہیں تھی، تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ میں نے گھر کے اندر داخل ہو کر منع کر دیا کہ کوئی آپ کو پریشان نہ کرے۔ آپ بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہو گئے تھے، ہم نے آپ کو دیکھا مگر نامناسب نہیں سمجھا.....“

”مجھے کچھ خبر نہیں.....“ میں نے طویل سانس لے کر جواب دیا۔

”اتنے دنوں کہاں رہے.....؟“

”پاؤں میں چکر ہو تو انسان ایک جگہ سے جک سکتا۔ میں بھی گولوں کی طرح گردش کرتا رہا۔“

”پچھلی بار سہراب اور پریم آئے تھے تو ان دنوں بانی خیر علی تھی کہ کوئی میم آپ کو اپنے ساتھ لندن لے گئی تھی۔“ رکن الدین نے دبی زبان میں پوچھا۔

”ہاں.....“ میں نے بھی آواز میں اقرار کر لیا۔ ”ہندوستان.....“

”واپسی کب ہوئی.....؟“ رکن الدین نے استفسار کیا۔

”اب تو ٹھیک سے یہ بھی نہیں یاد رہا.....“ میرے لہجے میں کرب بھی شامل ہو گیا۔

”آپ نے اچھا کیا جو غریب خانے کا رخ کیا۔“ رکن الدین نے بڑے خلوص سے

ہزاروں چشم و دید گواہ میرے خلاف زہر آگھنے کو آمادہ ہو جاتے۔ اُن کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی وہی کرتا۔ لیکن انکارانی نے میرے سر پر واپس آ کر اپنے تیز پنچے میرے سر میں چھبھو دیئے۔ میرے ہاتھ گھب اندھیرا پھیل گیا۔ میری بجائے پولیس کے ہرکاروں نے شیوا کو حراست میں لے لیا، اُس پر ظلم توڑ رہے ہوں گے اور..... میں ایک آرام دہ کمرے کے بستر پر پڑا چھت کو دیکھ رہا تھا جب ایک مردانہ آواز میرے کانوں میں گونجی۔

”اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟“ میں نے پلٹ کر دیکھا، میری آنکھیں نمٹناک ہوئے لگیں..... میں رکن الدین کی حویلی میں تھا۔ ایک مدت کے بعد رکن الدین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی پیرائے سالی کے باوجود مجھ سے بڑی عزت و احترام سے مخاطب ہوا تھا۔ اُس کی حویلی سے میری زندگی کی بہت ساری خوشگوار یادیں وابستہ تھیں، رکن الدین نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ اپنی حویلی کے دروازے میرے اوپر کھول دیئے تھے۔ یہیں پہلی بار میری اور سید مجذوب کی ملاقات بھی ہوئی تھی جس نے میری زندگی میں مظلوم پیدا کر دیا تھا۔ اور بھی بے شمار یادیں تھیں جو میرے دل میں کروٹیں بدل رہی تھیں۔

کلدیپ کے مرنے کے بعد مجھے زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔ جین لندن سے نہ آ جاتی تو میں بہی کے کسی فٹ پاتھ پر ہی کھٹکھٹا دم توڑ دیتا۔ جین نے جھولی پھیلا کر مجھ سے اپنے لئے میری زندگی کی بھیک مانگی، میں انکار نہ کر سکا۔ ہندوستان سے رخصت ہونے وقت میں نے ایک تزئین کے سوا سب کی یادوں کو کھرچ کر ذہن سے نکال دیا تھا۔ انکارانی کو بھی ساتھ نہیں لے گیا تھا، اُس وقت میرا خیال تھا کہ دوبارہ کبھی ہندوستان کے جنم میں پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ لیکن پریم لال نے کلدیپ کی بے چین روح کا ذکر چیمز کر کے واپسی کے سفر پر آمادہ کر دیا۔ اب قسمت مجھے دوبارہ رکن الدین کی حویلی لے آئی تھی۔

انکارانی نے ایک لمبی جست بھری تھی، ہر دروازے سے گھبرکہ..... دہلی لے جاتی تو میں ایک بار پھر خواجگان کی چوکت پر پیشانی پر رگڑ رگڑ کر اپنے ماضی کے گناہوں سے توبہ کر لیتا۔ اگر لے جاتی تو تاج محل کا نظارہ ہی کر لیتا، یہ بھی محسوس کرنے کی کوشش کرتا کہ ایک شہنشاہی دولت کا سہارا لے کر کس کس انداز و زاویوں سے غریبوں کی محبت کا مذاق اڑانے کی کوشش کی ہے۔ اجیر میں کچھ دنوں قیام ممکن ہوتا تو وہاں بھی زیارتوں سے مستفید ہو لیتا، بڑا

کہا۔ ”کیا آپ کی طبیعت ہل جائے گی۔“

”شاید..... میں نے مختصر کہا۔“

”اب آگئے ہیں تو وہاں میں جلدی نہ کیجئے گا۔“

”ایک ضروری کام بات نہ کیا ہے۔“ میں نے چندرا کے بارے میں سوچتے ہوئے

سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”اُسے منہ میں تو پھر کہیں تک کر بیٹھے پر غور کروں گا۔“

”ہمیں چار روز سے آپ کی آمد کا انتظار تھا.....“ رکن الدین معنی خیز انداز میں

سکرائے لگا۔

”کیا مطلب.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”چار روز پیشتر سید آیا تھا، اُس نے کہا آپ آنے والے ہیں۔“

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سید مجذوب کا ذکر سن کر گویا میرے ناتواں جسم میں خوشی کی لہر دوڑ

گئی۔ وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ خدا کا برگزیدہ بندہ تھا، خدا کے عشق میں ڈوب گیا تھا،

جذب ہو کر مجذوب بن گیا تھا۔ وہ بہت سارے بھیدوں سے واقف تھا، اُس کی نظر ہر بات پر

دیکھ لیا ہوگا کہ میرے اوپر کیا گزرنے والی ہے۔ اُسے حالات کی پیشگی اطلاع ہوئی۔ اُنکو

نے پڈت نول کشور کو مندر سے باہر لگانے کا طریقہ بتایا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا، اُلجھتا رہا۔ اُنکا

رانی بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ پھر نول کشور کا قصہ پاک ہو گیا۔

”کیا سوچنے لگے.....؟“ رکن الدین نے مجھے خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر پوچھا۔

”سید آتا رہتا ہے.....؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ہاں۔ وہ خواجہ کی چوٹ کا دیوانہ ہے، اُسی کے آس پاس بھٹکتا رہتا ہے۔ مجھ پر بھی

اُس کی نظر عنایت ہے، آتا رہتا ہے۔“

”بھابھی صاحبہ کیسی ہیں.....؟“ میں نے بیگم رکن الدین کی خیریت دریافت کی۔

”وہ آج کل ناہید کے پاس گئی ہوئی ہیں۔“

”یہ غلط بات ہے ابا حضور.....“ طلعت نے اچانک سامنے آ کر شکوہ کیا۔ ”آپ نے کہ

تھا کہ ہمیں فوری خبر کریں گے۔ مگر آپ تو بات کرنے بیٹھ گئے۔“

اُس کے لہجے میں شوخی تھی۔ اتنے دے قدموں کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ مجھے ہنک

بھی نہ ملی۔ میں نے اُسے پیار سے دیکھا تو دوڑ کر اُس نے اپنا سر میرے کاندھوں پر رکھا

وا۔ میں شفقت سے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اچانک میری نظروں میں دو

چہنے پہچانے چہرے اور آگئے۔ وہ دونوں بھی رکن الدین کے عقب سے آہستہ آہستہ نمودار

ہوئی تھیں۔ شاید طلعت کے ساتھ وہ بھی چھپی بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔ اُن کو دیکھ کر

ماہی کی اور بہت ساری تلخ و شیریں یادیں ذہن کے پردوں پر ابھرنے لگیں۔

وہ زرافشاں اور درخشاں تھیں جنہیں میں پیار سے زری اور رخی کہا کرتا تھا۔ میں نے

اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا لیا، وہ شرماتی لجاتی قریب آ گئیں۔ طلعت علیحدہ

ہوئی تو وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئیں۔

”کیسی ہو زری.....؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کی دُعا سے خیریت سے ہوں.....“ اُس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”جھوٹ.....“ طلعت شوخی سے بولی۔ ”اب تو اس کی خیریت ہم سب کو خدا سے نیک

مطلب ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے رکن الدین کی سمت دیکھا۔ طلعت کی بات کا مطلب میرے

ذہن میں کچھ کچھ آ رہا تھا۔

”میں نے زرافشاں کی بات ایک نہایت مناسب رشتہ دیکھ کر پکی کر دی ہے۔“ رکن

الدین نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”آپ آگئے ہیں تو اب دو ایک روز میں تاریخ بھی پکی کر دوں

گا۔“

میں نے زرافشاں کی طرف دیکھا، وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں کے

مگداز پر بڑی شرمیلی مسکراہٹ چھل رہی تھی۔ وہ ہنکلیوں سے طلعت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شاید یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ ”بکرے کی ماں بھی کب تک خیر منائے گی۔ کسی نہ کسی گھر میں

تمہارے لئے بھی چھری پر دھار رکھی جا رہی ہوگی۔“ میں نے دو، میں نے گن گن کر بدلہ

نہ لیا، نام بدل دینا.....“

”میرے انتظار میں وقت ضائع نہ کریں۔“ میں نے کہا۔ ”جو کام جتنی جلدی ہو جائے

انتظار اچھا ہے۔“

”نیک کام میں ویسے بھی دیر نہیں کرنی چاہئے..... کیوں چھوٹے ابا.....“ طلعت نے

میری طرف دیکھ کر پہلی بار چھوٹے ابا کے خطاب سے نوازا تو میرے دل کی پامال حسرتوں

میں اہل آئے لگا۔ میں نے بڑی مشکوں سے پکوں کی اوٹ تک آجانے والے آنسوؤں کو روکا، اُس کا چہرہ ابا گھنا مجھے اچھا لگا۔ تزئین مجھے بابا کہا کرتی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اگر کوئی ایک بار ہی دل کھول کر دھوم دھام کر لی جائے تو زیادہ مناسب رہے گا۔“ میں نے رکن الدین کی جانب دیکھ کر دبی زبان میں کہا، وہ میری بات کا مفہوم سمجھ گیا۔ طلعت مجھے خونخوار پس منظر دکھانے لگی۔

”ابھی میں نے آپ کو کتنے پیار سے چھوئے لیا کہا تھا اور آپ نے جھڑے کی بات شروع کر دی۔“ اُس کی چٹکی میں بھی محبت اور اپنائیت تھی۔ جھلک رہے تھے۔

”میں آپ کے مشورے سے متفق ہوں۔“ رکن الدین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ایک دوڑ کے ہیں میری نظر میں۔ میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ ہمیں بچوں کے ہاتھ ایک ساتھ پیلے کر دوں۔“

”ایک نہ شد۔۔۔۔۔۔ دو شد۔“ طلعت نے کڑوا سا منہ بنا کر جواب دیا، پھر نیکو لڑکیاں

ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر زنان خانے کی طرف چلی گئیں۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جس

ایک بار پہلے بھی رکن الدین کی حویلی میں کئی لڑکیوں نے دھنوں کے زرق برق لباس پہنے

تھے، اُن کے دلہاؤں کے سر پر سرے کی بہار منڈلائی تھی، پھر سب بکھر گئے۔ تزئین کو سید

غوث کے عقد میں دیا گیا، سہراب اور پریم ہاتھ تھام کر زندگی کے ہم سفر بن گئے، آند لال

اور مالا کی شادی بھی اُن کے رسم و رواج کے مطابق حویلی میں ہی انجام پائی۔ باقاعدہ لگن

منڈپ سجایا گیا، دونوں نے دامن باندھ کر اگنی کے گرد سات پھیرے پورے کئے۔ پنڈت

نے آکر ساری رسمیں پوری کرائی تھیں، چچا جان نے جیلہ کو اپنی بہو بنالیا۔ شادیوں کے

سارے اخراجات رکن الدین نے برداشت کئے۔ وہ بڑا انسان ہونے کے ساتھ ساتھ

کشاہد دل بھی تھا۔ میں نے اُس کا ہاتھ بٹانا چاہا، انکا کی موجودگی میں دولت کی ریل چل

بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن رکن الدین نے مجھے منع کر دیا۔

مجھے شبنم خان اور شادرا کی یاد بھی آئی۔ شبنم خان کا نام میں نے شبر خان رکھ دیا تھا۔

شادرا اپنی خوشی سے حلقہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ اُس کا نام یاسمین رکھا گیا۔ اُن کی شادی

کے موقع پر بھی رکن الدین نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت پیش کیا تھا۔

گلبرگ آکر میری طبیعت بہل گئی۔ تزئین اور سید غوث بھی موجود ہوتے تو رونق دو بالا ہو

جانی۔ طلعت ہر وقت چپکٹی پھرتی تھی۔ زرافشاں اور درخشاں بھی میرے آجانے سے بے حد فتن تھیں۔ ہر وقت میری آؤ بھگت ہوتی رہتی، زندگی کے ان ہنگاموں میں مجھے کل دیپ کی یاد آتی تو دل مسوس کر رہ جاتا۔ کبھی نرس ہنسی مسکراتی سامنے آکھڑی ہوتی، کبھی پریم لال دلی مالا رانی کی سرکشی میرے کانوں میں ابھرتی۔۔۔۔۔

”پران ناتھ، مجھے شہا کر دینا۔ نصیب نے مجھے اتنا سے نہیں دیا کہ میں تن من دھن سے تمہاری سیوا کر سکتی۔ دوسرا جہنم ملا تو سارے قرض چکا دوں گی۔“

میں ماضی اور حال کے ایسے سنگم پر کھڑا تھا جہاں کبھی سائے مجھے ٹھنڈک پہناتے تو میرا

دل باغ باغ ہو جاتا، کبھی دھوپ کی تمازت میرے وجود کو جھلسانے لگتی۔ مستقبل کے بارے

میں کئی علم نہیں تھا۔ شاید انکارانی واقف ہو۔ سید مجذوب جانتا ہو۔

رکن الدین کی حویلی میں تین دن گزر گئے۔ انکا انی ابھی تک واپس نہیں لوٹی تھی، مجھے

اُس کی فکر لاحق تھی۔ وہ ہر دوار میں بری طرح اُلجھ گئی ہوگی۔ پنڈت نول کشور اور دو تین

پنڈت پجاریوں کی لاشیں دیکھ کر ہریانہ اور کرنال کے علاوہ امر دہا اور دہلی تک پولیس کے

ٹیمپے جوکس ہو گئے ہوں گے۔ ہر دوار کے سارے پولیس اسٹیشن بل گئے ہوں گے، بڑے

لوگوں پر چھان بین شروع ہو چکی ہوگی۔ شہبے کی بنیاد پر کئی مسلمانوں کو بے قصور اُن کے

گھر والے لے لیا گیا ہوگا، اُن پر تشدد کر کے بال کی کھال نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہوگی۔

ہو سکتا ہے کہ آئندہ بھون کے میٹیر جھنڈاری کو بھی دھریا گیا ہو۔ اُس کا قصور اتنا تھا کہ میں نے

اُس کے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ پنڈت شیوا کو بھی نہیں بخشا گیا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کی

زبان پر میرا نام نہیں آیا ہوگا۔ اُس سے میری بربادی منظور ہوتی تو میری بندشوں کو کاٹنے کی

فکری بھی نہ کرتا۔ اُس کا ہاتھ بہکا نہیں تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر مجھے نول کشور کے

خطرناک سحر کی سلاخوں سے باہر نکالا تھا۔ میں نے اُس کی جان بخشی تھی، وہ حساب برابر

کر نے کی ٹھانے بیٹھا تھا۔

رکھا جائے تو پنڈت نول کشور خود اپنے اعتماد کا شکار ہو گیا تھا۔ اُس نے گلے سے جینو اتار

کر جہنم تر پڑھ کر میری طرف پھینکا تھا۔ اُسے اپنے مقصد میں مایوسی نہیں ہوئی۔ جینو کی

دور نے مجھے رشی بن کر جکڑ دیا تھا۔ جنگ اور جدل کے میدان میں زندگی اور موت گے

فیصلے یک جھپکتے میں ہو جاتے ہیں۔ اگر نول کشور کے برابر کھڑے ہوئے پنڈت نے اس

نازک مرحلے پر شیوا کا امتحان لینے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا، دھوتی میں چھپے شکاری چاقو کو شیوا کی طرف نہ اٹھاتا۔ وہ تو کہانی یقیناً مختلف ہوتی۔ نول کشور مجھے سنبھلنے کا موقع دینے کی حماقت کبھی نہ کرتا۔ اُس کے اگلے منتر منتر کے پیر میری کتاب زندگی کے گرد سیاہ لکیروں کا مونا حاشیہ کھینچ کر نیچے جلی حروف میں "ساہت" یا "ختم شد" لکھ کر چھٹی کر دیتے۔ لیکن شیوا کے درمیان میں آجانے سے وہ جھجکا ہوگا۔ شیوا نے میری بندشیں کاٹ دیں۔ میں نے نول کشور کی شہرہ رگ کاٹ کر اس کی زندگی ختم کر دی!!

پولیس کے حلقوں میں بے چینی پھیلی ہوگی۔ شیوا نے زبان بند رکھنے کی قسم کھالی ہوگی۔ کالی کے مندر کے سینکڑوں پجاری، ہزاروں نگاہیں گواہ تھیں کہ قاتل میں تھا۔ انکارانی ایک وقت میں کسی ایک ہی سر پر جاسکتی تھی، وہ دن رات ایک سر سے دوسرے سر پر بھدکتی پھر رہی ہوگی، گواہوں کو منحرف کر رہی ہوگی، پولیس افسروں کے ذہنوں کو مغلط کرنے میں مصروف ہوگی۔ اُس نے سپ کے دماغ میں ایک ہی سوال اُبھارا ہوگا۔

"اگر قاتل جمیل احمد خاں تھا تو کہاں چھو منتر ہو گیا؟ زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا؟" میں نے خود اپنے کانوں سے پولیس کی سائرن کاروں کی آوازیں سنی تھیں۔ پنڈے نول کشور کی لاش دیکھ کر اُن کی پتلونیں ضرور ڈھیلی ہو گئی ہوں گی۔ اُن کے لاسکی نظام نے حرکت میں آنے میں دیر نہیں کی ہوگی۔ ہوائی اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر پولیس کے پہرے بٹھائے گئے ہوں گے، دوسرے راستوں کی ناکہ بندی میں بھی غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا ہوگا۔ مسلمانوں کے علاوہ کچھ ایسے ہندوؤں کے گھروں کو بھی کھنگالا گیا ہوگا جن پر "مسلم دوستی" کی چھاپ لگی ہوگی۔ وہ چاروں طرف تیزی سے پھیل گئے ہوں گے، قریبی شہروں کی پولیس کو بھی آگاہ کیا ہوگا، ہر طرف افراتفری کا سماں ہوگا۔ سب بغلیں جھانکتے پھر رہے تھے۔ میں گہر گہ میں بیٹھا طلعت، زرافشاں اور درخشاں کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا۔ ایک طرف صف ماتم بچھی تھی، دوسری جانب میں سب کی شادی کی باتیں کر رہا تھا۔

تین روز آرام سے گزار گئے۔ چوتھے روز میں سوکر اٹھا تو میری نظر سید جہدوب پر پڑی۔ وہ ایک طرف ٹانگیں سکڑے ہاتھوں کے نیچے پر سر رکھے لیٹا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔

"مرغ بانگ دے چکا..... تو ابھی تک انا غنیل ہے..... کن میلے....."

"ہر دوار میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اُس کی بات ٹال کر پوچھا۔
"خاک اڑ رہی ہے....." سید نے دیدے نچاتے ہوئے جواب دیا۔ "تو نو دو گیا رہو گیا..... وہ بھدکتی پھر رہی ہے..... شیطان کی خالہ۔"

"وہ میرا چچا نہیں چھوڑیں گے۔" میں نے کہا۔ "تم کوئی راستہ دکھا دو۔"
"ٹیلے پر چڑھ جا..... رسیاں تڑا کر بھاگ لے۔"

"تم نے پھر مجھے الجھانا شروع کر دیا۔" میں نے شکوہ کیا۔ "مجھے انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لے لو..... تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔"

"ہوڑے..... بزرگوں کے ساتھ بھی کنکوا لڑانے کی سوچ رہا ہے؟" سید کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

"تم میری بات نہیں سنو گے.....؟"

"کیا سنائے گا..... ٹھمری یا دادرا.....؟"

"میں خود کشی کر لوں گا....." میں نے احتجاج کیا۔

"زراکت جان بیوہ ہو جائے گی۔" سید معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "ابھی دھاڑیں مارتا رہا..... پھاڑ کر رنگا ہو جا، پھر پتھر اٹھا کر سر پھوڑ لے..... سارا خون بہا دے، قوالی میں جا رہا چنا شروع کر دے۔"

"ہی سب کچھ میرے ارادے سے آئے تھے.....؟" میں نے اُسے گھورا۔ وہ سہم کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کن کہنے....." اُس نے پھر دیکھے گھمانے شروع کر دیے۔ "جال ڈالنے کی ہانک رہا ہے..... گرو گھنٹال..... اُنکو کی ذم فانی....."

"کہو اور نہیں کر سکتے تو چندرا کا پتہ ہی چلو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "ایک وہی بات رہ گیا ہے..... اُسے بھی ٹھکانے لگاؤں تو چھٹی ہو جائے گی۔"

"بارش ہوگی تو اور پودے نکل آئیں گے..... چٹانوں میں چوڑے چھپا لے..... رینگنا شروع کر دے۔"

"نہرو مرشد، ایک بات کان کھول کر سن لو....." میں دوبارہ سنجیدہ ہو گیا۔ "میں راستہ بولک گیا تو ذمہ داری تمہاری بھی ہوگی۔"

”پھر صحنے لگا..... شروع کر دی نوٹکی.....“

”میں آخری دم تک تمہارا چچا نہیں چھوڑوں گا سید.....“ میں نے ٹھک کر کہا۔ ”میرے نامہ اعمال میں تمہارا نام بھی ضرور درج ہوگا۔ تم کب تک پہلو تہی کرو گے.....؟“

”قلعی کھل گئی..... ہو گیا لگا..... آستین کے سانپ..... وہ روٹھ گئی..... اوپر چلی گئی تو کلیں کر رہا ہے۔“

”کون چلی گئی.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”تمہیں خدا کا واسطہ، کھل کر سب کچھ کہہ ڈالو۔“

جواب میں سید نے ایک طویل انگڑائی کی، منہ سے جی رال کو آستین سے پونچھ کر بولا۔

”گھڑی کی آواز پر کان لگا دے..... ایک ٹانگ پر کھڑا ہوا..... بارہ بج جائیں تو دریا میں چھلانگ لگا دینا..... اُس پار نکل جانا۔“

”تم ٹانے کی باتیں کر رہے ہو..... میں حشر میں دامن گیر ہو جاؤں گا۔“ سید نے کھڑے کھڑے قلابازی

کھائی، پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سید میرے ساتھ ”چھین چھپائی“ کا کھیل، کھیل رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے، اُسے کل کر بتانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مجبور تھا، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں چندرا کو ختم کر دیتا تو آخری حسرت بھی پوری ہو جاتی۔

پنڈت نول کشور کا انجام دیکھ کر باقی پنڈت پجاریوں کے حوصلے پست ہو گئے ہوں گے۔ پناہ گا ہوں میں دیکے بیٹھے ہوں گے۔ اُن کا کمپنی کمانڈر مارا گیا تھا، وہ فوری طور پر منتظم نہیں ہو سکتے تھے۔ صرف نفری کام نہیں آتی، کوئی قائدانہ صلاحیت رکھنے والا رہبر ہو، تب بات بنتی ہے۔ کچھ بڑے پنڈت ممکن ہے کہ پنڈت نول کشور کی گدی سنبھالنے کی تاک میں ہوں۔ کالی کے مندر کا بڑا پردہت ہونا بڑی فتنہ کش آسامی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس منہ

تک پہنچنے کی خاطر بھی کچھ وقت لگتا ہے۔ میں انہیں مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔

عین ممکن تھا کہ چندرا کو بھی بروقت نول کشور کی موت کی اطلاع مل گئی ہو..... اُس دایاں باز دکت چکا تھا، وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا ہوگا۔ میں اچانک اُس کے سر پر ہاتھ

کہ اُس کی دور بین نظریں چندرا کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہیں۔ میں نے سید سے دریافت کیا، وہ بھی نال گیا۔

ہندوستان کی پولیس پوری طرح فعال ہوگی، میری تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا ہوگا، دوسرے صوبوں میں بھی جگہ جگہ جال ڈالے جا رہے ہوں گے۔ وہ میرے پتے ٹھکانوں

سے واقف تھے۔ اگر کوئی بھولا بھونکا پولیس آفیسر رکن الدین کی حویلی تک پہنچ جاتا تو میں گرفتار ہو جاتا۔ رکن الدین کی عزت دو کوڑی کی بھی نہ رہ جاتی۔ مجھے پھر داؤ پیچ لڑانے

پڑتے، وقت ضائع ہوتا رہتا۔ چندرا کو بھی قدم جمانے کا موقع مل جاتا۔

ناشتے کی میز پر میرا ذہن چندرا میں الجھا رہا۔ انکارانی کی طویل غیر حاضری میری الجھنوں میں اضافہ کر رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ آج دشمنوں کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔“ رکن الدین عمر رسیدہ تھا، اُس نے میرے چہرے کے تاثرات کو پڑھ لیا۔

”میں جانے کی سوچ رہا ہوں۔“ میں روانی میں کہہ گیا۔

”کہاں.....؟“ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ طلعت، زرافشاں اور درخشاں سب

میری نظریں میری جانب اٹھ گئیں۔

”کیا جلدی ہے بڑے ابا؟“ طلعت نے پہل کی۔ ”ابھی تو آپ آئے ہیں۔“

”تم ازم طلعت کی بات طے ہو جانے تک تو انتظار کر لیتے۔“ زرافشاں نے طلعت کو

چبھڑنے کی خاطر دلی زبان میں کہا۔

”میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔“ درخشاں سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ”کچھ ہمارا بھی حق ہے آپ کے اوپر۔“

”میں آپ کے معاملات میں دخل اندازی مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن میری بھی یہی گزارش ہے کہ بچیوں کی خوشی پوری ہونے تک ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔“ رکن الدین نے بڑی

کرنفسی سے کام لیا۔

”ایک ضروری کام درپیش ہے۔“ میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ”جلدی واپس

لوٹ آؤں گا۔“

”آپ کی شکل میں اگر پھر وہ آ گیا تو.....؟“ درخشاں کا اشارہ رقیق (جن) کی طرف

تھا۔ میں نے کہا۔

”خدا خدائے کونے اُسے۔“ زرافشاں بولی۔ ”بڑا تنگ کیا تھا اُس نے۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب؟“ کیا اُسے جانے کے بعد بھی؟“ میں نے درخشاں کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔“ رکن الدین نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”آپ کے جانے کے بعد بھی وہ بد بخت دونوں بچیوں کے پیچھے لگا رہا ایک بار میری شکل میں حویلی تک آ گیا۔ درخشاں اور زرافشاں اُس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ خدا بھلا کرے سید کا کہ وہ عین وقت پر آ گیا۔ اُس روز سید نے اُس سے اپنی زبان میں کچھ گستاخیاں بات کی تھی۔ پھر وہ دوبارہ حویلی کے قریب نہیں پہنکا۔“

ہمارے درمیان رنج کی بات ہو رہی تھی جب مجھے اپنے سر پر انکارانی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے عالم تصور میں دیکھا، وہ بے حد تھکی تھکی اور بڑھاپا نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں سے نیند کا خمار جھانک رہا تھا۔ میں جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہو کر کھانے کا کانا کر کے حویلی سے باہر چلا گیا۔ انکا بھی موقع کی منتظر تھی۔ میں حویلی سے باہر نکلا تو اُس نے کہنا شروع کیا۔

”جمیل، حالات نے بڑی مخدوش صورت اختیار کر لی ہے۔ کالی کے مندر میں صف ماتم چمکی ہوئی ہے۔ پنڈت، پجاری، پجاری اور دیو داسیاں سب ہی ایک زبان ہو کر نول کشور کے قاتل کی گرفتاری کا ہڈ زور مطالبہ کر رہے ہیں۔ کچھ پنڈت اور پجاریوں نے ہر دوار کے بڑے پولیس اسٹیشن کے سامنے دھرنا دے رکھا ہے، سب کی زبان پر بار بار تمہارا نام آ رہا ہے، بڑے پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئی ہیں۔ شیوا اور جھنڈاری بھی گرفتار کر لئے گئے۔ میں پل پل سروں پر پھدکتی پھر رہی تھی، جھنڈاری نے میرے اشارے پر اس بات کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ جیل احمد خاں نام کا کوئی مسافر کبھی آئندہ بھون میں ٹھہرا تھا۔ اُس کے رجسٹروں میں تمہارے نام کا اندراج بھی نہیں تھا۔ پولیس کے اہل دماغ بھی چکرا رہے ہیں، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ جو پنڈت تمہارے بارے میں بڑے یقین سے قاتل ہونے کی بات کرتا ہے، وہی بعد میں مقدس گیتا ہاتھ میں لے کر کہتا ہے کہ اُس نے سرے سے نول کشور کو قتل ہوتے دیکھا ہی نہیں۔ پولیس کے انتشار پر اس کا

جواب ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی زبانی سنی باتوں کو دہرا رہا ہے۔ صرف ایک شخص ہے مجھے جس کے سر پر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ بار بار سینہ تان کر اقرار کر رہا ہے کہ اسی نے پنڈت نول کشور کو ذاتی نوعیت کی دشمنی کی بنا پر قتل کیا ہے۔ تشدد کے باوجود اُس کا بیان بار بار یہی ہوتا ہے، قتل اُسی نے کیا ہے، کسی اور نے نہیں۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ میرے ذہن میں شیوا کا نام ابھرا۔ وہی ایک جیلا مرد تھا جو اس قسم کی بات کر سکتا تھا۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ انکارانی نے میرے شبے کی تائید کی تو میں شپٹانے لگا۔

”گویا بات وقتی طور پر ٹل گئی ہے۔۔۔۔۔“

”شیوا کو اقبال جرم کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اُس پر فرد جرم بھی عائد کی جا چکی ہے۔ پولیس کا حکمہ اور عدالتی مشینری تعصب کی آگ بھڑک اٹھنے کے خیال سے بڑی تیزی سے معاملہ نمٹانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن وہ اندر ہی اندر تمہارے خلاف مواد بھی جمع کر رہے ہیں۔ پنڈت پجاریوں کے متضاد بیانات نے سب کو الجھا دیا ہے۔“

”شیوا کا کیا بنے گا۔۔۔۔۔؟“ میں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”پنڈت نول کشور کے علاوہ تین اور لاشیں بھی موقع واردات سے ملی ہیں۔“ انکارانی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”پھانسی کا پھندا کسی نہ کسی کے گلے میں تو ضرور ڈالا جائے گا۔“

”میں حالات کی نوعیت کو سمجھ رہا ہوں۔ لیکن شیوا کو پھانسی نہیں ہونی چاہئے۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”سن رہی ہوں تم، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”تم فکر مت کرو جمیل۔۔۔۔۔ اُس کے مجھے یقین دلایا۔“ شیوا ہمارا محسن بھی ہے اور بے گناہ بھی۔۔۔۔۔ اُسے پھانسی کی سزا نہیں ہوگی۔ لیکن فی الحال جو کچھ ہو رہا ہے، اسے ہونے دو۔ بات ذرا دب جائے، دلوں کی آگ کچھ سرد پڑ جائے تو شیوا بھی دودھ کی کمی کی طرح باہر آ جائے گا۔“

”کیسے۔۔۔۔۔؟“ میں جلدی میں سوال کر بیٹھا۔

”بالکل اسی طرح جس طرح تم اب تک بچتے رہے ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”پریشان مت ہو۔ میں جب چاہوں گی بساط پلٹ دوں گی۔ شیوا کی گردن کی پھانسی کی مٹی جلدی کوئی اور گردن بھی بڑی آسانی سے مل جائے گی۔ تمہارے دشمنوں میں سے ایک نفرتی اور کم ہو

مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ منڈل کھینچ کر اس کے اندر بندہ جائیں تو اور بات ہے۔ انہیں کسی معاملے میں دیوی کی حمایت حاصل ہو جائے تو بھی میں مجبور ہو جاتی ہوں..... اور میری شہتی کون چھین سکتا ہے؟“

”تم نے کسی پنڈت یا پجاری کا ذکر کیا تھا جو تمہیں قابو کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔“ میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔ ”اُس کا جاپ پورا ہونے میں کتنا وقت باقی رہ گیا ہے؟“ ”اُس کی فکر مت کرو۔ ابھی خاصا وقت باقی ہے۔ میں اُسے آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔“ انکارانی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”پر تم لال مہاراج نے جہاں مجھے دوسری شکستیاں دان کی تھیں، وہاں ایک شہتی ایسی بھی دی ہے جو منڈل کے اندر بیٹھے ہوئے پجاری کی عقل بھی خطا کر سکتی ہے۔ ایک منٹ کے لئے وہ منڈل سے نکلا تو اُسے دوبارہ اندر جانے کا موقع نہیں دوں گی۔“

”تم..... تم مجھے بہلانے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہو.....؟“

”ان باتوں میں سے مت برباد کرو جیل، میری مانو تو اسی وقت بزرگ کے مزار پر حاضری دے لو۔ ہو سکتا ہے جو میں نے سوچا ہو، وہی سچ ہو۔“

”تم نے کیا سوچا ہے.....؟“

”میں نہیں..... پہلے تم حاضری دے لو، پھر بتاؤں گی۔“

میں نے انکارانی کی بات مان لی۔ وہ نہ کہتی تو بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ میں گہرے تک آتا اور حضرت گیسو دروازے کے مزار پر حاضری نہ دیتا۔ میں نے اسی وقت جا کر مزار پر حاضری دی، بڑی دیر تک رونا دھانا کیا، میں پر خدا سے معافی مانگتا رہا۔ میں نے براہ راست خواجہ سے کچھ نہیں مانگا۔ فاتحہ پڑھا کر خدا کے آگے ہاتھ پھیلا کر یہی دُعا کرتا رہا کہ وہ میری مشکلات آسان کر دے، میری مرادیں پوری ہوں اور میرا قدم صحیح منزل تک پہنچے کا راستہ تلاش کر لے۔ میں فاتحہ پڑھ کر مزار سے باہر آیا تو شاہ ایک گولہ کے درخت سے ٹپک لگائے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ دلائل نکال کر بولا۔

”بھک مٹگے..... جب کہیں اور سایہ نہیں ملتا تو دوڑا دوڑا کر یہاں چلا آتا ہے..... بھری جھولی؟ پھر گرد جھاڑ کر جانے کی حماقت کر بیٹھا.....؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، حسرت بھری نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ انکارانی اس

میں پنڈت نول کشور سے متعلق ایک ایک بات بڑی تفصیل سے معلوم کرتا رہا۔ انکارانی نے جو حالات بیان کیے ان کی پراسرار قوتوں نے حالات کو جو رنگ دیا تھا اس سے میری پوزیشن بڑی حد تک صاف ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے، کسی اور معاملے میں الجھا کر دل کی طرح لٹکانے کی کوشش ضرور کریں گے.....!

”ایک بات پوچھوں انکارانی..... میں نے نول کشور کا موضوع ختم کر کے سوال کیا۔“ ”تم مجھے ہر دوار سے گہرے کیوں لے آئیں؟ تم یہاں بھی جا سکتے تھے، بمبئی میں مر لی اور سروجنی کا اپارٹمنٹ بھی میرے لئے نہایت محفوظ پناہ گاہ ہے۔ ہو سکتی تھی۔“ ”تم کیا نتیجہ اخذ کر رہے ہو.....؟“ اُس نے مجھے متعلقہ طلب نظروں سے دیکھا۔

میرا سوال سن کر وہ ہٹانے لگی تھی۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے..... میں نے انکارانی کے چہرے کے تاثرات کو بغور گھورتے ہوئے سپاٹ لے لیا۔“

”گہرے تمہارے لئے دو اعتبار سے زیادہ مناسب جگہ ہے۔“ وہ سنبھل کر بولی۔

وہ مرد قنڈر بھی ہے جس نے تمہاری پشت تمام رکھی ہے، یہاں حضرت خواجہ گیسو دروازے کے مزار بھی ہے جہاں تمہاری حاضری.....“

”میں سمجھا نہیں.....؟“ میں نے حضرت گیسو دروازے کے حوالے پر چونک کر پوچھا۔

”تم چندرا کو کیوں بھول رہے ہو.....؟“ اُس نے میری دھکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم بزرگ کی درگاہ پر حاضری دے سچے دل سے دُعا مانگو تو وہ پردے میری نگاہوں کے سامنے سے ضرور سرک جائیں گے جنہوں نے چندرا اور میرے سچے ایک عارضی دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔“

”آخر وہ کون سی قوت ہے جو تمہارے آڑے آ رہی ہے.....؟“ میں نے ہونٹ کاٹے ہوئے پوچھا۔

”وہ کوئی غیر معمولی طاقت ہی ہو سکتی ہے جسے دُرگہ اور کالی کی حمایت حاصل ہوگی اُس نے خلاء میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔“ میں نے اُس پراسرار قوت کے بارے میں جاننے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ یہ سارے پنڈت پجاری اور سادھو،

سے نکلے وقت بھی واپسی کا یقین رکھتا ہے، راستے میں کوئی سانحہ، کوئی حادثہ پیش آجائے تو زندگی کا ڈراپ سکین ہو جاتا ہے، کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ میری زندگی کا تو ہر لمحہ غیر یقینی تھا۔ کبھی کبھی انسان کو مصیبتیں رونق دیتی ہیں۔ میں جھوٹ نہ بولتا تو رکن الدین کے علاوہ زہرا فاشاں، درخشاں اور طلعت بھی مجھے جانے کی اجازت نہ دیتیں۔ پاؤں کی بیڑیاں بن جاتیں.....!

اُسی روز میں رات کے کھانے کے بعد بنگلور کے لئے روانہ ہو گیا.....!!



KHAN BOOKS

STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 5556532
PROP: ALI KHAN

KHAN BOOKS

STATIONARY AND LIBRARY
F/890/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH: 5556532
PROP: ALI KHAN

گاڑی بنگلور کی سمت بھاگ رہی تھی۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں میرے علاوہ ایک انگریز بھی سفر کر رہا تھا۔ انکارانی اپنی نیند پوری کرنے کی خاطر میرے بالوں کے پیچ آڑی زچھی بکھری پڑی تھی۔ اُس کے خراٹے بتا رہے تھے کہ وہ گھوڑے پیچ کر سو رہی ہے۔ میرا ذہن گاڑی کی رفتار سے کہیں زیادہ برق رفتاری سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ انکارانے کہا تھا کہ چندرا، بنگلور کے ایک نواحی علاقے میں کسی غیر آباد مندر میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ یہاں میرے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔

نول کشور نے چندرا کو ساتھ ملایا تھا تو اس میں کوئی صحت بھی ضرور ہوگی۔ وہ امرالال کو لے کر گیا تھا۔ امرالال کو کالی کی خوشنودی حاصل تھی، اُس کے سیوکوں کی تعداد لاکھوں میں تھی تو حجازیوں میں ضرور رہی ہوگی۔ امرالال کے مرنے کے بعد اُس کے سیوکوں نے اپنا رخ چندرا کی طرف موڑ دیا ہوگا۔ کالی کی شبھ کا منائیں بھی چندرا کو حاصل ہوں گی۔ چندرا، نول کشور کے لئے یقیناً بڑی اہمیت کا حامل ہوگا، اسی لئے میرے ہر دو اور پیچھے سے پہلے نول کشور نے اُس کو بنگلور بھیج دیا۔ مگر وہ میرے لئے دو محاذ کھولنے کی حسرت لئے دنیا سے رخصت ہو گیا اور اب بقول انکارانی کے چندرا نے پھر کوئی جاپ شروع کر دیا تھا۔ وہ مندر میں ضرور تنہا ہوگا۔ منزل میں ایک وقت میں صرف ایک پنڈت یا پجاری اپنے ارادوں کی تکمیل کی مدت پوری کرتا ہے۔ ممکن ہے وہ بھی جاپی پہاڑیوں میں اُس کا جاپ ادا کر رہا ہو؟ وہ اُسی کی تکمیل کر رہا ہو؟ میرے خلاف قوتیں کھڑی ہو کر سامنے آنے سے پیشتر کوئی قوتوں کا حصول اُس نے ضروری سمجھا ہو؟ اور بھی کچھ ممکن ہیں اُس کے پیش نظر رہی ہوں گی۔ لیکن وہ تنہا ہوگا؟ میرا ذہن اس بات کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ذہن پر زیادہ زور نہیں دیا۔ میرا مقصد صرف چندرا کو ٹھکانے لگانا تھا، اُسے باور کرانا تھا کہ اُس نے تکمیل ارادوں کے مقابلے میں آکر دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا۔ چندرا کی موت کے بعد پنڈت

پجاریوں کا دروٹ جاتا، پنڈت نول کشور کے بعد چندرا کی موت کی خبر اُن کے لئے نیک شگون نہیں ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ میرا خیال اپنے ذہنوں سے جھٹک دیتے؟ اس راستے سے کترا کر گزرنے کے بجائے جہاں میرے قدموں کے نشان موجود ہوتے، ان کو ماضی کے واقعات کا بھی تھوڑا بہت علم ضرور ہوگا۔ کیسے کیسے جفاوری پنڈت اور پجاری مجھے ہنس ہنس کرنے کی خواہش لے کر میدان میں کودے تھے، اُن کا انجام کیا ہوا؟ پولیس نے متعدد بار مجھے گھیرنے کی کوشش کی، عدالتوں نے اپنا قیمتی وقت برباد کیا، نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ دھاک کے تین پات!

کئی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ پھر انت پور کے اسٹیشن سے دو آدمی اور ڈبے میں سوار ہو گئے۔ اُن کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ ممکن ہے ایک دو اسٹیشن ڈوب جانا رہا ہو۔ شکل و صورت سے وہ اچھے کردار کے مالک نظر نہیں آرہے تھے۔ مجھے اُن کے ساتھ کوئی رشتہ بھی نہیں قائم کرنا تھا۔ میں نے اُن کی طرف پشت کر لی۔ پھر چندرا کے بارے میں غور کرنے لگا۔ انکارانی نے کسمسا شروع کیا۔ دو چار طویل انگڑائیاں لینے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم بھی کچھ دیر کرسی دی کر لو، بیٹھے بیٹھے تھک جاؤ گے۔“

”اب ایک ہی بار سکون سے آرام کروں گا۔“ میرے لہجے میں الجھن شامل تھی۔

”تم کیا سوچ رہے ہو.....؟“ اُس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”چندرا کے بارے میں زیادہ پریشان مت ہو۔ جب بڑے بڑے قد آور بت ڈھے گئے تو چندرا کس کھیت کی مولا ہے؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔“

”بات صرف چندرا کی نہیں ہے۔“ میں پہلو بدل کر بولا۔ ”میں اس روز روز کی افراط سے تھک آ گیا ہوں۔ تم روزِ اوّل سے میرے ساتھ ہو، میری زندگی کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو۔ بات پنڈت تربنی سے شروع ہوئی تھی، وہ تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش میں مصروف تھا، میں تمہارے کہنے پر بھگوان پرشاد سے ملا۔ کیا کیا جتن کئے لیکن وہ کامیاب ہو گیا۔ تم میرا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ پھر تم نے.....“

”ان باتوں کو بھول جاؤ جمیل۔“ وہ کسمسا نے لگی۔ ”میں تم سے کئی بار ندامت کا اظہار کر چکی ہوں۔“

”میں ندامت کی نہیں، طاقت کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تربنی کے بعد بھی تمہارے آنے جانے کا سلسلہ لگا رہا۔ شیو چرن ماسٹے آ گیا۔ بھر میرے سب سے بڑے دشمن ہدئی زائن نے درمیان میں آ کر میرے اور ہندوستان کے پنڈت پجاریوں کے درمیان فساد کا جوچ بویا اس کی فضا میں آج تک کا شام چلا آ رہا ہوں۔ چندرا کے بعد کوئی نیا حرا مزادہ اٹھ کھڑا ہوگا..... جو پنڈت تمہارے لئے جاپ کر رہا ہے، وہ کامیاب ہو گیا تو میرے دشمنوں کی صف میں تم بھی شامل ہو جاؤ گی۔ کہانی میں جوڑ لگتے چلے جائیں گے، میں کب تک مقابلہ کرتا رہوں گا.....؟“

”اتنی مایوسی کی باتیں مت کر جمیل.....“ اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ اب تمہاری قوت بھی مجھ سے کم نہیں ہے۔ کل کیا ہونے والا ہے؟ میں جانتی ہوں۔ مجبوریاں لاحق نہ ہوں تو تمہیں سب کچھ بتا دیتی۔ صرف اتنا جان لو کہ تمہاری منزل قریب آ رہی ہے۔ تمہیں ایک ٹھکانا مل جائے گا۔ ہو سکتا ہے تم مجھ سے مل کر رہیں پھر لو.....“

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“ میں بے چین ہو گیا۔ ”مجھے بتاؤ انکارانی کہ تمہاری بات کا مقصد کیا ہے؟ بات اب میرے اور تمہارے درمیان طاقت کے توازن کی نہیں رہی۔ ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ میں تم سے نظریں پھراؤں..... یہ کیسے ممکن ہے؟“

”جمیل..... وہ آبدیدہ ہو گئی۔ ”میں بھی تم سے دُور نہیں رہ سکتی۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی، تم بدل جاؤ، لگا رہیں پھر لو تب بھی میں تم سے جدائی کا تصور نہیں کر سکوں گی۔“

”اور وہ..... جو منڈل میں بیٹھا تھا مجھ سے ٹھن لینے کے سنے دیکھ رہا ہے.....“

”وہ کامیاب نہیں ہوگا..... میرا بھائی کا اعتماد کرو۔ اب کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا۔“ اُس کے لہجے میں یقین تھا۔

”تم..... تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ کوئی کامیاب نہیں ہوگا؟ کیا وہ تمہارا خیال دل سے نکال دیں گے.....؟“

”وقت کا انتظار کرو، سب کچھ جان جاؤ گے.....“

انکارانی کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ سکیں۔ چند روز بعد شہرہ ڈھلے میں آج اس کے لب و لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔ میں اُسے کریدنا چاہتا تھا جب وہ اچانک اٹھ کر

کھڑی ہوئی۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں میری نظریں بھی اُن دو مسافروں کی جانب اُٹھ گئیں جو سفید فام غیر ملکی کولوٹے میں مصروف تھے۔ ایک نے پستول تان رکھا تھا، دوسرا شخص غیر ملکی کی جیبیں صاف کرنے کے بعد اُس کے سامان کی تلاشی لینے میں مصروف تھا۔ سفید فام غیر ملکی کا چہرہ ہلکی سی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اُس کی کبھی نگاہیں بار بار میری جانب اُٹھ رہی تھیں۔

”دیکھ رہے ہو جیل.....“ انکارانی نے دہم خند سے کہا۔ ”ہندوستان میں اب وہ بھی محفوظ نہیں رہے جو کبھی حکومت کر چکے ہیں۔ اسی بھلائی کے بڑے بڑے سورما، راجہ مہاراجہ اور نوابین اپنے انگریز آقاؤں کی پیشانی کے بل بوتے پر زبان کھولنے کی جسارت نہیں کرتے تھے۔ اب اٹھائی گھرے اور چور اچکے بھی ان کی جیبیں ٹٹولنے لگے ہیں۔ وقت اور حالات بڑے ظالم ہوتے ہیں، کسی ایک کے اختیار میں نہیں رہتے۔ مسافروں کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی روشنی اندھیرے کو نگل جاتی ہے، اب اندھیرے روشنی پر کند پھینکنے لگے ہیں.....“

انکا بڑے فلسفیانہ انداز میں بدلتے حالات کا تجزیہ پیش کر رہی تھی۔ میں جواب میں کچھ کہنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ پستول والا جواں مرد مجھ پر غرا نے لگا۔

”تمہاری نظر اب ادھر اُٹھ ہی گئی ہے تو خاموشی سے بیٹھے تماشا دیکھتے رہنا۔ ہم بلاوجہ کسی کے خون سے ہاتھ سرخ نہیں کرتے۔ بہتر ہوگا کہ پھر اپنا رخ تبدیل کر کے انجان بن جاؤ۔ ہم اس سفید مرنے کو کھنگال کر اگلے اسٹیشن پر اتر جائیں گے۔“

”تم اپنی جیبیں بھر لو گے لیکن تمہاری ان حرکتوں سے تمہارے دلس کی شہرت کو بڑا شدید دھچکا پہنچے گا۔“ میں نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”انگریز کی سیاست کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا، وہ اپنے تدبیر اور شہنشاہی پالیسی کی آڑ لے کر اپنا کام کر گزرتے ہیں۔ تمہارا بھارت بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاست نہیں سمجھ سکا تھا، اُس وقت آنکھیں کھلیں جب پانی سر سے اُونچا ہو گیا.....“

”ہمیں تاریخ اور جغرافیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ اُس کے تیور خطرناک ہو گئے۔

”اپنی چونچ بند رکھو، اسی میں تمہاری مکتی ہے۔“

”بڑی حیرت کی بات ہے.....؟“ مجھے ہنسی آ گئی۔ ”تم کام چوروں والا کر رہے ہو۔“

زبان پنڈت پجاریوں کی استعمال کرتے ہوئے.....“ اُس نے بڑی سفاکی سے پوچھا۔

”زندگی کی خیر مناد مہاشے.....“ اُس کے دوسرے ساتھی نے دھمکی دی۔ ”زیادہ ہیرو بننے کی کوشش کی تو مار کر چلاتی گاڑی سے باہر پھینک دیں گے۔ کچھ رہے ہو ہماری آسان بھاشا یا تم سے بارود کی زبان میں بات کریں؟“

”پلیز ہیپ می (PLEASE HELP ME)“ سفید فام غیر ملکی نے پہلی بار مردہ آواز میں بولنے کی جسارت کی۔

”ڈونٹ وری (DON'T WORRY)“ میں نے سنجیدگی سے اُسے دلا سہ دیا۔

”گٹ پٹ کرنے سے باز نہیں آؤ گے؟“ دوسرے شخص نے بھی پستول نکال لیا۔ انکا رانی بڑی تیزی سے میرے سر سے ریگ گئی۔

”ایک شرط ہوگی۔“ میں نے تھوڑے توقف سے ان دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم جس کولوٹ رہے ہو اس پر میری نظر پہلے سے تھی۔ سودا فنی فنی میں طے ہو سکتا ہے۔ کیا خیال ہے.....؟“

”اپنی کھال میں رہنے کی کوشش کرو۔“ پہلا ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔ ”ڈاکوؤں کے ڈیروں میں قتل لگا۔ نہ کی بات۔ وہی کرتے ہیں، زندگی سے جن کا دل بھر چکا ہوتا ہے.....“

”یہ اٹھی.....؟“ میں نے سید کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تھری ناٹ تھری سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس سے نشانہ لینے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ وقت پڑنے پر یہ ہلٹ، پروف کا کام بھی انجام دیتی ہے۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو باری باری دو چار فائر کر کے بھی اپنا اطمینان کر لو۔ مگر اس صورت میں میرا حصہ پچاس سے بڑھ کر پچھتر فیصد ہو جائے گا۔“

میں نے انکارانی کے سر سے اترتے ہی حصار باندھ دیا تھا۔ وہ ایک وقت میں دونوں کو کنٹرول نہیں کر سکتی تھی۔ انگریز مسافر کی وحشت دیدنی تھی۔ اُسے مال کی نہیں جان کی فکر زیادہ تھی۔

”میں تمہاری بکواس پر قہقہہ لگاؤں یا تمہاری لاش پر بیٹھ کر آنسو بہانے کی تیاری کروں۔“ پہلے نے اپنا جملہ مکمل کر کے جست لگائی۔ اُچھل کر میرے قریب آ گیا۔ میں

نے بیٹھے ہی تھے سر سے لاشی سرکا دی۔ وہ جوتوں سمیت میری آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا، لاشی کی طرف سے بے خبر تھا۔ لاشی اس کے جسم سے مس ہوئی تو یوں لگا جیسے اس کے جسم میں آگھسنا پورا کرنا نہ ہو۔ وہ فٹ بال کی طرح اچھل کر دوڑ جا گرا۔ اس کا جسم جل کر کوئلہ ہو گیا۔ سفید فام غیر ملکی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مرنے والے کا دوسرا ساتھی بھی حیرت سے چلکشی چمکانے لگا۔ اس کے پستول کا رخ میری ہی طرف تھا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پکڑا رہے تھے۔ لیلیٰ دہانے کے ارادے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ساتھی کے ناقابل یقین انعام بھی غور کر رہا تھا۔ میں نے اسے گھور کر کہا۔

”اب بھی بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟“ میرا لہجہ تھکسا۔ ”پستول جیب میں رکھ لے، جو مر گیا اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے۔ اپنی جیبیں تھلا کر خود بھی میری نظروں سے دور ہو جا۔ سن رہا ہے میری بات.....؟“

سفید فام غیر ملکی کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا کبھی خوبصورت بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ دوسرے شخص نے میرے حکم کی تعمیل میں سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے مردہ ساتھی کی اکڑی ہوئی سر اور سیاہ لاش کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔ اپنی جیبیں تھلا کر غیر ملکی کے قدموں میں سارا مال ڈال دیا پھر..... خود بھی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ سفید فام غیر ملکی کچھ دیر سکتے کی کیفیت سے دو چار رہا، پھر تحسین آمیز لہجے میں بولا۔

”یو آر گریت..... گریت میجیشن (MAGICIAN) بہت بڑا جاؤ گڑ معلوم ہونا۔ ہم پہلا کبھی نائی دیکھا..... گریت..... گریت..... (HORRIBLE)“

”چپ ہو جا سفید بندر.....“ میں نے ناخوشگوار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”میرا راستہ کھنات مت کر، جو کچھ دیکھا اسے اپنی کھوپڑی سے نکال دے۔ اگلے انیشن پر تو بھی دفاعان ہو جا..... کوئی دوسری گاڑی پکڑ لینا۔“

میں جانتا تھا کہ انکارانی اب اسی کے سر پر براہمان ہوگی۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی کی رفتار مدہم ہونی شروع ہوئی۔ وہ جلدی جلدی اپنا بکھرا ہوا سامان سینٹھنے لگا۔ گاڑی پلیٹ فام پر کی تو خاموشی سے دروازہ کھول کر اتر گیا۔ انکا پھر میرے سر پر آگئی، مسکرا کر بولی۔

”جانتے ہو جیمیل، وہ انگریز کیا سوچ رہا تھا؟ وہ تمہاری تصویریں کھینچنے کا خواہشمند تھا۔ تمہاری حیرت انگیز ماورائی قوتوں کے بارے میں لمبی چوڑی کہانی بنا کر بیرونی اخبارات میں شائع کرانے پر غور کر رہا تھا۔ تم نہ کہتے تب بھی اتر جاتا۔ وہ مرنے والے کی کوئلہ بنی لاش کی تصویر بھی حاصل کرنا چاہتا تھا، تمہاری کہانی تصویروں کے ساتھ چھپتی تو تمہلکے بچ جاتا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کے ذہن سے سارے واقعات کھرچ کر نکال دیے ہیں۔“

میں نے موضوع بدل کر پھر چندرا کی بات شروع کر دی۔

”ایک بار پھر اس کے آس پاس منڈلا کر دیکھو..... وہ تنہا ہوگا، میرا دل اس بات کو قبول نہیں کر رہا.....“

”جلدی کیا ہے.....؟“ اس نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ ”پنڈت نول کشور کے ساتھ تنگ پنڈت پجاریوں کی پوری فوج تھی۔ بارود کا بڑا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اس نے۔ نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ سارا ذخوم دھڑکا، شخص ہو کر رہ گیا۔ کالی کی صورت بھی دیکھتی رہ گئی۔“

”بنگور آنے میں اور کتنی دیر باقی ہے.....؟“ میں نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”خود کو ٹھنڈا رکھو..... جذبات میں کام بگڑ جاتے ہیں۔ بنگور زیادہ دور نہیں رہ گیا۔“ اس نے مجھے بھانے کی کوشش کی۔ ”ہم ٹرین سے اتر کر کسی عالیشان ہوٹل کا رخ کریں گے۔ تم نہادھو کر تازہ دم ہو لینا، کچھ دیر آرام کر لینا پھر سواری پکڑ کر ہم اس ہستی کی طرف چل پڑیں گے جہاں چندرا دیر اور اجازت مندر میں بیٹھا کسی دیوی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے جاپ میں مگن ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے اظہار میں ہوتا تو اڑ کر چندرا کے سر پر پہنچ جاتا، اسے منڈل سے باہر نکال کر ایسی عبرت ناک موت دیتا کہ امر لال کی آتما بھی ہلہلا اٹھتی۔ اس کی موت کی خبر ہر دار بھی ضرور پہنچتی۔ نول کشور کی بڑائی کی دھوتیاں ڈھیلی پڑ جاتیں۔ تلے اوپر ہونے والے دو جھگڑے ان سبزی خوروں کو ہلاک کر رکھ دیتے۔ وہ جلدی سر اٹھانے کی ہمت کبھی نہ کرتے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران اور حکومت کے سربراہوں کو لوگ بھی چکرا جاتے۔ ممکن تھا وہ میرے بارے میں ساری فائلیں بند کر کے ہمیشہ کے لئے خاموشی اختیار کر لیتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ”دیکھتے ہی گولی مار دو“ کا نادر شاہی حکم جاری کر دیتے، انہیں

ٹیکسی نواحی آبادی کی ایک نیم پختہ روڈ پر پہنچ کر رُکی۔ میں نیچے اُترا۔ مجھے یقین تھا کہ انکارانی کی موجودگی میں کسی غلطی کا امکان نہیں تھا۔ کہیں آس پاس وہ مندر بھی موجود ہوگا جہاں چندرا خود کو بڑا محفوظ سمجھ رہا ہوگا۔ اس بات سے بے خبر ہوگا کہ موت دے قدموں اس کے قریب پہنچنے والی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور خاموشی سے گاڑی واپس موڑ کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد انکارانی میرے سر پر آگئی۔ اُس نے مجھے بائیں جانب کچے میدانی علاقے کی طرف چلنے کو کہا۔ داہنے ہاتھ پر چھدرے چھدرے مکانات نظر آرہے تھے۔ وہاں غریب طبقہ آباد تھا جو محنت مزدوری کر کے روزی کماتا تھا۔

میدانی علاقے کو عبور کرنے کے بعد میں اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں میرا دشمن دیوی کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر جاپ میں گمن تھا۔ سوگڑ کے فاصلے پر وہ مندر بھی نظر آرہا تھا جو انکارانی کے بیان کے عین مطابق دُور ہی سے ویران اور اُجڑا اُجڑا نظر آ رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ پر ایک باغ تھا جہاں گھنے پھل دار درخت قطار اندر قطار دُور تک پھیلے نظر آ رہے تھے۔ دائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا تالاب تھا جہاں کچھ جانور اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ ”جیل.....“ انکارانی نے مندر کی سمت اشارہ کیا۔ ”چندرا اسی مندر میں بیٹھا جاپ کر رہا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں نے چاروں طرف نظر دوڑالی ہے، آس پاس کوئی پنڈت پجاری موجود نہیں ہے۔“

”گویا چندرا کی موت بڑی کسمپرسی کے عالم میں ہوگی۔ اُس کی لاش کو مرگھٹ تک پہنچانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔“ میں نے حقارت سے کہا۔ ”اچھا ہے۔ کسی جنگلی جانور کا بھلا ہو جائے گا۔ صرف ہڈیوں کا خچر باقی رہ جائے گا، اُسے بھی کتے گھسیٹ لے جائیں گے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“

میں نے مندر کی جانب قدم اٹھانے شروع کر دیے۔ جوں جوں فاصلہ گھٹتا گیا، میرے اندر طوفان کی شدت زور پکڑتی رہی۔ مجھے حیرت تھی۔ انمول کشور نے چندرا کو تنہا رہنے کی اجازت کس طرح دے دی؟ اُسے میری وجہ سے پہاڑیوں سے نیچے آنے کی دعوت دی گئی تھی، پھر ہر دوار سے کیوں بھیج دیا گیا؟ کیا مصلحت تھی؟ کیا راز تھا؟ کیا انمول کشور کو دیوی نے یہ نقش بتایا تھا کہ اُس کی موت سر پر کھیل رہی ہے؟ وہ اپنے اعتماد کا شکار ہو کر بے بسی کی موت مرنے والا ہے؟ وہ کالی کے مندر کا بڑا پروہت تھا۔ کالی اور اُس کے درمیان اتنے راز

بھی بار بار سخت اٹھانی پڑی۔ مجھے کسی پوچھنے والی چیز سے چھکارا مل جاتا، طویل عدالتی چکروں سے نجات مل جاتی.....!

”بنگور میں تمہارا بچہ کھینے کی اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں۔“ انکارانی اپنی سناتی رہی۔ ”ٹیپو سلطان کے محل کے کھنڈرات دیکھنے کے لئے غیر ملکی سیاح دُور دُور سے آتے ہیں۔ میسور اور جنوبی ہند کا تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں خاصی گہما گہمی رہتی ہے۔ یہاں بھی دنیا کے تمام خطوں کی طرح انسانی حسوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ مدد راسی لڑکیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ان کے گٹھے ہوئے جسم اور چلنے پھرنے کا انداز منفرد ہوتا ہے۔ دُور سے پہچانی جاتی ہیں.....“

”تمہیں اس وقت ٹیپو سلطان کیسے یاد آگیا.....؟“ میں نے پوچھ لیا۔

”اُس پر بھی ٹیپو مستان شاہ نامی ایک فقیر مہربان ہو گیا تھا، اُن کی نسبت سے وہ ٹیپو سلطان بن گیا۔ پہلے صرف فتح علی کے نام سے جانا جاتا تھا۔“ اُس نے وضاحت کی۔ ”تم بھی خوش نصیب ہو جو سید ہندوب جیسا قلندر تم پر مہربان ہو گیا..... وہ بڑی ہمدردی سے تمہارے مالک ہے۔ میں بھی اُس کی گہرائیوں کو نہیں پاسکتی۔ اُس کا دامن تھامے رہنا، چھوڑ دینا۔ اُس کی نظر چٹانوں کو بھی سہارا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ وہ جن بلند یوں پر پرواز کرتا ہے وہاں پرندوں کے پر بھی جل جاتے ہیں۔“

انکارانی مجھ سے باتیں کرتی رہی، وقت بڑی آسانی سے گزر گیا۔

بنگور کے اسٹیشن پر میں گاڑی سے باہر آیا تو میری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ انکارانی مجھے شاندار ہوش میں لے جانے پر بضد تھی۔ میں نے انکارا کر دیا۔ اُسے میری ضد کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ پلیٹ فارم سے باہر آ کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ انکارانی، ڈرائیور کے سر پر چلی گئی۔

شہر سے نواحی بستی کا سفر تھا کہ دینے والا تھا۔ دو گھنٹے بیت گئے، میں بار بار پہلو بدلتا رہا۔ چندرا میرے ذہن میں کسی کچھوے کی طرح کلبلارہا تھا۔ وہ میری کلدیپ کے قاتل کا اکھوتا بیٹھا تھا۔ سب کہتے تھے کہ امرالال کی طرح اُسے بھی کالی کا آشیر واد حاصل ہے۔ کالی نے امرالال کے مقابلے میں کلدیپ کی جھینٹ قبول کر لی۔ امرالال کتے کی موت مارا گیا۔ اور اب اسی کتے کے پلے کی باری تھی۔ میں تمام راستے اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔

بھی نہیں ہوئی نہ نظریں ٹکرائیں۔ وہ تھالی کو دیوی کا پرشاؤ سمجھ کر چٹ کر جاتا ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ چندرا نے اسے سو بیکار کر لیا۔ بڑی نادان ہے۔ اپنی زندگی کو بلاوجہ روگ لگا بیٹھی....“ میں انکارانی کی باتیں سنتا رہا۔ اُس نے چندرا کی بھرپور جوانی کی جو تعریفیں کی تھیں غلط نہیں ہوں گی۔ اُس کا بیان غلط ہوتا تو روپ کرن جیسی الہز جوانی اُس کے عشق میں دیوانی نہ ہوتی۔ وہ قریب آ رہی تھی۔ میری نظریں اُس کے خشب و فراز کے حسن کو داد تحسین دینے میں مصروف تھیں۔ وہ میرے قریب آ کر ایک لمحے کو رُکی، کسی خیال سے اُس نے پلٹ کر اُڑے مندر کی طرف نظر ڈالی جہاں اُس کا پریم بیٹھا رام رام چپ رہا تھا۔ پھر کتڑا کر جانے لگی تو میں نے لپک کر اُس کی کلائی تھام لی۔ وہ ساری جان سے لرز اُٹھی۔ پیتل کی تھالی اور چھوٹے چھوٹے برتن اُس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اُس کی بادامی آنکھیں سہم کر اور دل رہا ہو گئیں۔

”کیا کرتے ہو.....؟“ اُس نے گھبرائے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔ میں اُس کے دل کی دھڑکنوں میں ڈوبنے لگا۔ ”میرا ہاتھ چھوڑ دو، تمہاری بڑی کرپا ہوگی.....“ وہ مجسم التجا بن گئی۔ میں اور دیوانہ ہو گیا۔

”مندر میں تیرا کون بیٹھا ہے.....؟“ میں نے تیز آواز میں سوال کیا۔

”مہم..... میں نہیں جانتی.....“ اُس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

”نہیں جانتی تو وہاں روز روز کیا کرنے جاتی ہے.....؟“ میرے اندر رقابت کا جذبہ کنڈلی مارنے لگا۔

”وہ..... وہ دیوی کے کارن دی جا رہی ہے۔ میں اُسے بھوجن کھلا کر واپس آ جاتی ہوں۔“ وہ معصومیت سے بولی۔ ”مجھے جانے دو.....“

”تو اُسے نہیں جانتی۔ لیکن من مندر میں چھاپا اُن کی پوجا کر رہی ہے۔“

”ہاں..... وہ مجھے اچھا لگتا ہے.....“ وہ روائی میں مختصر بیان کر گئی۔ میرے اندر کی آگ اور بھڑک اُٹھی۔

”بعد میں اُس نے تیرا ہاتھ تھامنے سے انکار کر دیا تو.....؟“ میں نے تھلا کر پوچھا۔

”بھگاہیہ کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟“ وہ اُداس ہو گئی۔ اُس کا حسن کو دیکھ کر قیامت تھا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ”ہمارا خنوج نہ ہوا تب بھی وہ میرے دل میں دھڑکتا رہے گا۔ وہ

وینا تو ہونے چاہئے تھے کہ وہ اُسے موت کی خبر کر دیتی۔ شاید اُس کی زندگی کے گئے پنے لحوں میں دیکھیں منٹ کا اور اضافہ ہو جاتا۔ وہ اپنی ہی موت سے بے خبر تھا تو چندرا کو اُس کے انجام کی خبر کیسے دے سکتا تھا؟ پتھر سے سر پھوڑنے کا انجام موت کے دروازے پر پہنچنے کے بعد ہی نظر آتا ہے۔ وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ چندرا بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو گا، اُسے اُمید نہیں رہی ہوگی کہ کوئی کشور اور اُس کے سینکڑوں پنڈت پجاری ایک تنہا میری ذات کے آگے اتنی جلدی بے بس ہو جائیں گے۔ خود نول کشور کو بھی توقع نہیں ہوگی۔ اُس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، دُور اندیشی سے کام لیتا رہا تھا۔ دیکھ درمیان میں نہ آ جاتا تو وہ منڈل سے باہر آنے میں جلدی نہ کرتا۔ باہر آنے کے بعد بھی اُس نے مردانگی سے مقابلہ کیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی جو شیوا درمیان میں آ گیا تھا، نول کشور جو کے میں مارا گیا۔ اب چندرا کی باری تھی۔

میں مندر سے دس گز دُور ہی تھا جب میرے قدم رُک گئے۔ میری نظریں اُس پجاریان کے سراپا پر منڈل لگنے لگیں جو مندر سے باہر نکلی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں چھوٹی سی چٹائی تھی جس میں ایک دو برتن اور بھی تھے۔ وہ کسی جنگی ہرنی کی طرح خوش نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کیروے رنگ میں اُس کا خوبصورت وجود اور چمک اٹھا تھا۔ وہ حسین تھی، جاذب نظر تھی، اُس کے چلنے کا انداز بھی ہر نیوں جیسا تھا، خراماں خراماں کسی ہوا کے معطر جھونکے کی طرح، اُس کا ایک ایک انداز زندگی کی سرستیوں سے معمور تھا، گھنیریں زلفیں دونوں شانوں پر ناگوں کی طرح تل کھادی تھیں۔ وہ خود بھی کسی ناگن سے کم نہیں تھی، کوڑیالی، لہر لہرا کر اور بل کھا کر چلنے والی۔ اُس کے سراپا میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ میرا ذہن چندرا کے خیال سے کھینچ کر اُس کے پیکر کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔

”اس کا نام بھی اسی کی طرح بڑا سندھ ہے..... روپ کرن۔“ انکارانی مجھے جنگی ہرنی کے بارے میں بتانے لگی۔ ”یہ نادان چندرا کو سن میں بسا کر اُس کی دیوانی ہو گئی ہے۔ روز اُس کے لئے تھالی میں پھل، دودھ اور میوے پروں کر لاتی ہے۔ تھالی منڈل کے قریب رکھ کر خود دُور بیٹھی نگاہوں نگاہوں میں چندرا کو پوجتی ہے۔ پھر خالی تھالی اٹھا کر واپس آ جاتی ہے۔ بہت دنوں سے اس کا یہی معمول ہے۔ ابھی تک چندرا سے اس کی ایک بات

نہ مانے، میں نے اُس کے ساتھ بندھن باندھ لیا ہے۔“

”میں اس بندھن کو توڑ دوں گا۔ اُسے بھی نشٹ کر دوں گا تو جس کے سپنے دیکھ رہی ہے۔“ میں اپنے جنون کا بوندہ پاسکا۔ میں نے اُس کی کلائی پر گرفت مضبوط کر کے جھکا دیا، وہ سنبھل نہ سکی، چلا کر میری بانہوں کے چال میں پھنس گئی۔ اُس کا قرب بڑا ایجان انگیز تھا۔ میرے جسم سے سرخ خون نکلا لپٹ گئیں۔ میرا مقصد اس مورتی کو اپنے شبستان گناہ میں لا کر اُس کی دوشیزگی پامال کرنا نہیں تھا۔ لیکن وہ جو ویرانے کی حورتھی، جس کی جوانی کھٹل کھٹل مٹھا کوئی تھی، جس کی مست نگاہوں میں انگور کی شراب جھلک رہی تھی وہ میرے دشمن کی بانہوں میں کبھی سمٹ کر اٹھیں گی۔ مجھے یہ بھی منظور نہیں تھا۔ میں نے روپ کرن کو تھپتھپ کر ایک طرف سے لے جانے کی کوشش کی تو انکارانی نے کہا۔

”اب ایسا مت کرنا جمیل..... اس ہرنی کو آزاد کر دو۔ تم نہیں جانتے، میری بات کا یقین کر لو، اگر تم نے اسے روند ڈالا تو بڑے خسارے میں رہو گے۔ شاید چندرا بھی کہتا ہے ہاتھ سے نکل جائے۔“

”یہ..... تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”میں تم سے غلط نہیں کہہ رہی ہوں..... روپ کرن کو چھوڑ دو، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

چندرا کا نام آیا تو میں نے روپ کرن کو وحشت بھری نظروں سے دیکھا، مجھے چندرا اور روپ کرن میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ انکارانی کی منطق میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اُس نے جو کچھ کہا تھا کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہا ہو گا۔ میں نے نفرت سے روپ کرن کو دھکا مار کر ایک سمت کیا۔ میری نگاہیں پھر مندر پر جم گئیں۔

”تم جلد بازی سے کام نہ لینا۔ میں لڑکی کے ذہن سے تمہارا خیال نکال کر واپس آتی ہوں۔“ انکارانی میرے سر سے اتر گئی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا مندر کے دروازے پر پہنچ گیا۔

سید کی لاشی میرے سیدھے ہاتھ میں تھی۔ میرے اندر آتش فشاں سر اُبھار رہا تھا۔ میں نے چندرا کو گھور کر دیکھا، وہ آنکھیں بند کئے کالی کی چاپلوسی میں گمن تھا۔ زمین پر منڈل کا

نشان واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ انکا نے چندرا کے حسن کی تعریف میں بغل سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ اس تعریف سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا، بڑا اکبر، جوان تھا۔ اُس کی میس بھی پوری طرح ہمجنی شروع نہیں ہوئی تھیں، ابھی اُس کے کھیلنے کوئے کے دن تھے۔ مجھے اُس کی جوانی پر ترس آنے لگا۔ وہ میرے دشمنوں کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ اُس کے چہرے کے خدوخال امر لال سے ملتے جلتے تھے۔ مجھے چندرا کو دیکھنے کے بعد روپ کرن جیسی حسینہ کی یکطرفہ محبت پر تعجب نہیں ہوا۔ وہ یقیناً چاہے جانے کے قابل تھا۔ جس مندر میں چلا جاتا دیو داسیاں اُس کے قرب کے جنون میں سر پھوڑنے کی مد سے بھی گزر جاتیں۔ پچا رنیں اُس کے قدموں میں تڑپ تڑپ کر جان دینے کو کسی اعزاز سے کم نہ سمجھتیں۔ ایک اتار سو پیار والی مثال صادق آ جاتی اور.....

”سنبھلو جمیل احمد خاں.....“ میرے دل نے میری سوچ کو سرزنش کی۔ ”تم جس کے سامنے کھڑے ہو وہ تمہاری کلدیپ کے قاتل کا بیٹا ہے۔ رہا پ کا بچہ سنبھلا ہی کہلاتا ہے۔ تم اسے دودھ پلانے کی سوچ رہے ہو؟ لیکر کے درخت سے آم کی فصل کی توقع کرنا پاگل پن ہے۔ تم اسے دس بار معاف کرو گے، یہ سو بار تمہیں پلٹ کر ڈسنے کی کوشش کرے گا۔ سید کی لاشی تمہارے پاس ہے، اسے اٹھاؤ، ایک ہی وار میں اس کا سر پھل دو۔ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا، دوبارہ تمہارے ہاتھ میں نہیں آئے گا۔“

میں سنبھل گیا۔ میرے اندر پھر آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ میں نے نفرت بھری نظروں سے چندرا کو دیکھا۔ موت اُس کے سر پر کھڑی تھی لہن دو بے خبری کے عالم سے دوچار تھا۔ اُس نے جو منڈل چھوڑا تھا اس کی میری نظروں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ میں امر لال کی موجودگی میں سید کی اسی لاشی سے میری نراں کا صدار بھی توڑ چکا تھا۔ میں لاشی گھماتا، منڈل کی ساری ہڈیاں ڈم دبا کر بھاگ جاتا تھا۔ دروازہ چندرا کے حسن کی تمام رعنائیاں ختم کر دیتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ صدمہ اُس بونے کے باوجود کم عقل تھا، وہاں تھا، بچہ تھا، طفل مکتب تھا۔ میں تجربے کا تھا، ہندوستان کے سب سے بڑے بڑت پجاری میری وحشتوں کا شکار ہو کر پرلوک سدھار چکے تھے۔ جن کے جنون کے آگے اُن کے قدم زیادہ دیر نہیں نک سکے۔ جمیل احمد خاں کے نام سے سب واقف تھے۔ چندرا کو بھی جہنم نصیب نول کشور نے بڑی تفصیل سے ایک ایک کہانی سنائی ہو گی، محاط رہنے کا

کھل گئیں۔ اُس نے بڑے سکون سے پلٹ کر مجھے دیکھا، اُس کے گداز ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ آنکھیں یوں چمکنے لگیں جیسے اُس کی دلی مراد پوری ہو گئی ہو۔ اُس کے ہونٹوں کی جنبش اور تیز ہو گئی۔ میں نے اُس کے تاثرات بھانپ کر سرد آواز میں کہا۔

”کھلی آنکھوں سے دن کے اُجالے میں سنے دیکھ رہا ہے؟..... مورکھ، دماغ میں جو خناس بھرا ہے اسے نکال دے۔ مجھے تیرے جنتر منتز کے بیر گھیر کر نہیں لائے ہیں۔ میں خود چل کر آیا ہوں۔ اب تو میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔ سن رہا ہے میری بات.....؟“

”مجھے پورا دانشا تھا کہ تو اوش آئے گا۔“ اُس نے بدستور فاتحانہ انداز میں کہا۔ ”دیوی نے جو کہا تھا، وہی ہوا۔ میری بیٹھک بیکار نہیں ہوئی۔ اب میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا۔ بہت اُوپر اُوپر اُڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب پھنس گیا میرے جال میں تو اس کا سوا د بھی تجھے چکھنا ہوگا۔“

میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ انکارانی میرے سر پر واپس آگئی۔ ”تم دیر کیوں کر رہے ہو.....؟“ اُس نے پوچھا۔ ”یہ اس قدر بے خوف کیوں نظر آ رہا ہے.....؟“

”اب چپ کیوں ہو گیا پاپی.....“ چندرا نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر بکواس شروع کر دی۔ ”میں سمجھ رہا ہوں کہ تیرے من میں کیا وچاڑ ڈول رہے ہیں، یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ تیرے من میں ابھی نہیں نکلے۔ میں چاہوں تو مٹی کی ایک چٹکی اٹھا کر تیری طرف پھینکوں، تو مل کر بھسم ہو جائے گا۔ بھری سو گند پوری ہو جائے گی۔ پرنتو میں ایسا نہیں کروں گا۔“ اُس کے تیز و خطرناک ہونے لگے۔ ”تو مجھے بالک سمجھ رہا ہے؟ تجھے ابھی میری شکستوں کا اندازہ نہیں ہے۔“

”یہ کیا بکواس کر رہا ہے جیل؟“ انکارانی نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بڑے کھیل تماشے دکھا چکا، بڑی اُچھل کود کر رہی، بہت ٹانگ کر چکا۔ اب تیری ایک بھی نہیں چلے گی۔“ اُس نے میرا مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔ ”تیرے بھاگیہ کا سورج ڈوب گیا۔ تیری سہانیا کرنے والے اب اس دھرتی پر نہیں رہے، سب کا کاش پر بلا لیا گیا۔ اب تو بھی یہاں رہ کر کیا کرے گا؟ تو بھی پچھڑے ہوؤں کے پاس چلا جا۔“ وہاں تجھے وہ انداز بھی مل جائے گی جو تیری بڑی سہانیا کیا کرتی تھی..... میں تیری نگاہیں انکارانی کی بات کر رہا ہوں۔ دیوی نے اُس کے ہاتھ بھی باندھ دیئے.....“

مشورہ دیا ہوگا۔ احوال کے ہیمانک اور عبرت انگیز انجام سے بھی ضرور باخبر کیا ہوگا۔ میں اُسے پشت سے مار کر کے ختم کر دیتا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ جنگ و جدل کے میدان میں حریف موقع کی تلاش میں جتے ہیں، وہاں اپنی بہادری کا سکھ جمانے کی خاطر خندقوں سے اُچھل کر باہر آنے کا استحکام بڑا جھانگ ہوتا ہے۔ دشمن چھپ کر ایک برسٹ مارتا ہے، جو بھی لپیٹ میں آجائے اُس کی زندگی کا بچ بچ گل ہو جاتا ہے۔ اوپر سے ایک بم پکا یا جاتا ہے، ان گنت افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ ہتھیاروں کا مکان ہمارا ہو جاتا ہے، سینٹ، بجری اور گارے قصور وار نہیں ہوتے۔ گروہ بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ مسجد، مندر، چرچ اور گرو دواروں کی ساری تمیز مٹ جاتی ہے۔ جس کا داؤ کھل جائے وہ اپنا کام کر گزرنے سے نہیں چوکتا۔ میں بھی چندرا کو اس طرح پشت سے وار کر کے منوں کے اندر ہی ڈھیر کر سکتا تھا کہ اُس غریب کو میری مثل دیکھنے کی مہلت بھی نہ ملتی، سیدھا دیوی کے چپٹوں میں ڈنڈوت کرتا ہوا دنیا سے کوچ کر جاتا۔ میں اُسے مار کر نکل جاتا، اُس کی لاش سے مشیت الارض ہزاروں کی تعداد میں لپیٹ جاتے۔ روپ کرن دوبارہ تھالی میں بھوجن پر اُتر کر چمکتی منکشی آتی تو تھالی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، اپنے پر تيم کا انجام دیکھ کر وہ لاش اُٹھتی، چکرا کر اُس کی لاش پر اوندھے منہ گرتی، پنڈت پجاریوں کو خبر ملتی تو وہ بھی ”رام رام ستیہ ہے“ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کر یا کرم کے لئے اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے۔ کسی کو کان کا خبر نہ ہوتی کہ قاتل کون ہے؟ میرے بارے میں قیاس آرائیاں پھر بھی ہوتی ہیں۔ میرے لئے چندرا سب سے آسان شکار ہو سکتا تھا، لیکن میں نے اُسے لٹکانے کی ٹھان لی۔ ”بس کر بالک..... بس کر..... بس کر دے حرام کے ختم۔“ میں نے کرخت لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ ”جاپ چھوڑ کر اپنے آپ کو بچانے کی چٹا کر۔ آنکھ کھول کر دیکھ، تیرے باپ کا باپ تیرے سر پر موت بن کر کھڑا ہے۔“

چندرا کی محویت میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ جاپ میں گمن تھا۔ میں نے اُسے دوبارہ آواز دی۔

”دیوی کو پٹانے کا پھر چھوڑ دے مورکھ..... میری لالچی گھوم گئی تو سارے جنتر دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔“

اس بار وہ کسمسمانے لگا۔ میری بلند آواز اُس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں

میں چندرا کی زبان سے اپنی کلدھپ کا نام سن کر پاگل ہو گیا۔ میرے صبر کا پتہ نہ لبریز ہو چکا تھا۔ میں نے مذکی لالھی منزل کی سمت پھینکی، کرناک چیخوں کی آوازیں ابھر کر، روشنی کے تیز جھماکے ہوئے۔ چندرا جس منزل کو اپنے لئے ناقابل تسخیر سمجھ رہا تھا، وہ ٹوٹ گیا۔۔۔۔۔

چندرا کی آنکھیں پٹ پٹانے لگیں۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

”اب بول مورکھ۔۔۔۔۔ ملچے۔۔۔۔۔ پانی۔۔۔۔۔ تو مجھے کیا بھاشن دے رہا تھا؟ بڑے دیدے نکال کر باتیں کر رہا تھا۔ راگ راگنیوں میں الپ پڑا تھا۔ اب سٹی غم ہو گئی۔ مجھے اوپر جانے کی صلاح دے رہا تھا، اب بول، میں تیرے ساتھ کیا رہوں؟“

”تم نے چندرا کو چیخڑ کرا چھوڑا نہیں کیا۔ تمہیں چھتانا پڑے گا۔“ وہ خود کو بچال کر بولا۔

”دیوی میری رکھشا کرے گی۔ میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔“

”پھر بڑھنے لگا اوقات سے، پھر شروع کر دیں دیوی اور دیوتاؤں کی باتیں؟“

زہر خند سے جواب دیا۔ ”کچی گولیاں کھیلی ہوئیں مورکھ تو جمیل احمد خاں کے مقابلے پر اپنے کی بھول بھی نہ کرتا۔ کیا تیرے پرکھوں نے تجھے تیرے اصلی پتا کا نام نہیں بتایا تھا؟ نول کشور کے بل پر اکڑ رہا تھا، خبر ہے اُس کا کیا ہوا؟ میں اُس کی گردن تاپ کر آ رہا ہوں۔ اُس کے سیوک اب اُس کی چتا کی راکھ بھی سمیٹ چکے ہوں گے۔ اور تو یہاں بیٹھا دیوی کے ساتھ آنکھ مٹکا کر رہا ہے؟“

”تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جمیل احمد خاں۔“ وہ سینہ تان کر بولا۔ ”میں تمہاری پوری کہانی سن چکا ہوں۔ وہ سندھ ناردرمیان میں نہ آ جاتی تو۔۔۔۔۔“

”چپ ہو جا نطقہ نا تحقیق، اپنی گندی زبان بند کر لے۔۔۔۔۔“ میں چیخ اٹھا۔ ”تجھے بھگوت کر پلایا گیا ہے اس میں زہر کی آمیزش بھی ہے۔ کلدھپ درمیان میں کبھی نہ آئی تیرا باپ بدری نرائن کو تھیلی لگانے کی خاطر درمیان میں نہ آ گیا ہوتا۔ اُس غریب نے تیرے جنم نصیب باپ سے کہا بھی تھا کہ وہ دونوں درمیان سے ہٹ جائیں، کوئی کسی کی مدد نہ کرے۔ مجھے اور بدری نرائن کو مردوں کی طرح میدان میں چھوڑ دیا جائے، پھر جو جیت جائے۔ لیکن تیرے باپ نے یہ بات نہیں مانی۔ وہ کالی کے بل بوتے پر اکٹھے زنجین کا غروا

کر سامنے آ گیا۔ پہل بھی اُسی نے کی۔ میری کلدھپ خاموش کھڑی رہی، بار بار امر لال کو سمجھاتی رہی۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ بڑا ناتھا اُسے کالی کی شتی پر۔ لیکن انجام کیا ہوا؟ کلدھپ نے انگلیوں سے اشارہ کیا، اُس کے شریر کے کھڑے کھڑے ہو گئے۔ میں نے بدری نرائن کو خارش زدہ کتوں کی طرح لٹھا لٹھا ڈر مارا۔ سن رہا ہے میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”جمیل۔۔۔۔۔“ انکارانی تمللا کر بولی۔ ”تم اس سپنوں کو کیا سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو؟ تمہاری کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ جلدی کرو۔ پہلی فرصت میں اسے ٹھکانے لگا دو۔۔۔۔۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو جمیل احمد خاں۔“ چندرا نے نفرت کا اظہار کیا۔ وہ مجھ سے خائف نظر نہیں آ رہا تھا۔ ”تم مہا بھارت کی جو رام کہانی سن رہے ہو وہ تمہاری من گھڑت ہے۔ سچ کیا ہے، میں جانتا ہوں۔“

”ایک بات اور جان لے مورکھ۔۔۔۔۔“ میں ہونٹ چبا کر بولا۔ ”تو نے جو سو گند کھائی ہے وہ کبھی پوری نہیں ہوگی۔ نہ تو دھرتی کی کسی پجاری کو ہاتھ لگا سکے گا نہ آکاش پر اندر کے کھڑے کی کوئی زنتی تیرے شریر کو چھوٹا پسند کرے گی۔ ہمیشہ لٹوڑا رہے گا۔ ابھی سے کچھ گردن نیچی کر لے، میرے چروں پر سر رکھ کر دیا کی بھیک مانگ، میں وچن نہیں دیتا کہ تجھے شاکر دلوں کا ہو سکتا ہے مجھے تیری جوانی پر رحم آ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے کھڑے کھڑے کر کے نول کے آگے ڈال دوں۔۔۔۔۔“

”جمیل۔۔۔۔۔“ انکارانی کے گلے۔ ”جلدی کرو، اسے موقع نہ دو۔ مار ڈالو۔۔۔۔۔ مار ڈالو۔۔۔۔۔ سر پھل دو اس کا۔“

چندرا میری بات سن کر آگے بڑھا۔ شاید میری بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ میرے قدموں میں جھکنے کو آمادہ ہو گیا تھا۔ میں خوشی میں ہنسا ہوا ہوں، وہ سور کا بچہ اپنی چال چل گیا۔ میرے قریب پہنچ کر اُس نے جسمانی قوت کا مظاہرہ کیا۔ وہ بلاشبہ مجھ سے کہیں زیادہ توند تھا۔ اُس نے میری ناگنیں پکڑ کر ہوا میں اچھال دیں۔ میں نے فوری طور پر عمل استعمال نہ کی ہوتی تو پتھر ملی زمین سے ٹکرا کر میرا سر ضرور پاش پاش ہو جاتا۔ انکارانی اچھل کر ایک طرف چلی گئی۔ میں نے اُٹھنے میں سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ چندرا کے ہونٹ لڑ رہے تھے۔ وہ کسی خطرناک جنتر کا ورد کر رہا تھا کہ میری تھیلی اٹھ گئی۔ میں نے ایک

آزمودہ منتظر تھی کہ ہتھیلی کو اس کی طرف جھٹکا۔ چندرا اڑتا ہوا مندر کی دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ زمین پر گرتے ہی اس نے اپنے سینے کا ایک بال توڑ کر کالی کی مورنی کی طرف پھینکا۔ مجھے خود کو سہانا مشکل ہو گیا۔ ہوا کا ایک گرم جھونکا مجھے دھکیلتا ہوا مندر سے باہر لے گیا۔

”جیل.....“ انکارانی نے میرے سر پر آکر بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اجازت دو، میں چٹکی بجاتے میں کھیل ختم کرنا چاہوں گی۔ بات بڑھ گئی تو چندرا اس سے تمہارے ہاتھ میں نہیں آئے گا۔“

مجھے انکارانی کی بات اچھی نہیں لگی۔ شاید وہ چندرا کے تھکے ہوئے لہجے میں مجھے کمزور سمجھ رہی تھی۔ وہ میرے لمحے لمحے سے واقف تھی، پھر اس نے ایک غلط بات کیوں کی؟ میں اُسے گھورتا ہوا تیزی سے اٹھا۔

”تم اس وقت میرے سر سے اتر جاؤ انکارانی، میرے اور چندرا کے مطابق میں ناگ پھنسانے کی غلطی بھی مت کرنا.....“

میرا الجھ کرخت تھا، انکا تمللا کر اتر گئی۔ میرے ذہن میں آمدھیاں چل رہی تھیں۔ چندرا نے ارٹھکا ز اور مراقبہ کا عمل کیا، سید کی لاشی میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ چندرا نے سامنے آ کر دوسرا وار کیا۔ میں نے اُسے تیز نظروں سے گھورا، وہ دُور جا پڑا، مایا بے آب کی طرح تڑپنے لگا..... میں نے اُسے ختم کر دینے کی خاطر اُس کی طرف زور سے پھونکا لیکن وہ برقی رفتار سے قلابازی کھاتا ہوا میری زد سے دُور نکل گیا۔ میں لاشی اٹھانے کی خاطر پکا، چندرا نے وار کر دیا۔ اُس کے جنتر منتر کے بیروں نے مجھے زمین سے بلند کر کے زور سے پٹا۔ میں نے سر پر دونوں ہاتھ جمائے۔ میری کھوپڑی پاش پاش ہونے سے بچ گئی۔ میں نے سید کی لاشی کو وقتی طور پر نظر انداز کر دیا، اُلٹا ہاتھ بلند کر کے اُنکھیاں لہرانے لگا۔ اُن کے شعلے بھڑکتے ہوئے لپکے لیکن چندرا کے قریب جا کر سر دپڑنے لگے۔ شاید اُس نے موقع ملتے ہی دوسرا منڈل کھینچ لیا تھا۔

”جیل احمد خاں..... اب تم میرا بال بھی میڑھا نہیں کر سکو گے۔“ اُس نے گرج کر کہا۔ ”میں نے اب جو منڈل باندھا ہے اس پر تمہارا کوئی جادو اثر نہیں کرے گا۔“

میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا انجام دیکھ چکا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے خود کو زینما

گرا کر لوٹ لگائی، سید کی لاشی تک پہنچ گیا۔ چندرا قہقہہ لگا کر بولا۔

”اس لٹھ میں کیا بات ہے مہاراج جو تم بار بار اس کی طرف لپکتے ہو.....؟“ اُس نے میرا منہ اڑانے کی کوشش کی۔ ”تم لکڑے لکھوے تو نہیں ہو جو لکڑی سوگھا کر بچوں کو اغواء کرنے کا کام کرتے ہیں.....؟“

”دیر مت کرو جیل.....“ انکارانی پھر میرے سر پر آ گئی۔ ”تم نہیں سمجھ رہے، چندرا جان بوجھ کر تمہیں باتوں میں الجھا رہا ہے۔ اُسے کسی کا انتظار ہے۔“

”کس کا انتظار ہے؟“ میں نے حیرت سے وضاحت چاہی۔ ”وہ کون مائی کالا ل ہے جسے اپنی زندگی پیاری نہیں؟ کس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا؟ کون جان بوجھ کر موت کے درمیں پھلانگ لگانے کا خواہشمند ہے؟ اگر کوئی ہے تو اُسے بھی آئیے دو۔ میں چندرا کے ساتھ اُسے بھی نرک میں جھونک دوں گا۔ ایک ساتھی ہوگا تو چندرا کا دل بھی بہلتا رہے گا۔“

”میں مجبور ہوں..... میں تمہیں اُس کا نام نہیں بتا سکتی۔ لیکن اگر وہ سامنے آ گیا تو کھیل فربہ ہو جائے گا۔ پھر..... پھر شاید تم چندرا کو آسانی سے نہ مار سکو گے۔“ انکارانی پھر ضد کرنے لگی۔ ”میرا کہا مان لو..... سید کی لاشی اس کی طرف اُچھال دو۔ اس نے جو منڈل باندھا ہے، وہ ٹوٹ جائے گا۔ اس کے بعد تم باتوں میں وقت برباد نہ کرنا۔ میں غلط نہیں کہہ رہی۔ تم اسے دُور کر دی تو بازی طول پکڑ لے گی۔ یہ سنہری موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”انکارانی..... میں نے اُس کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔“ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اب کچھ باتیں مجھ سے چھپانے لگی ہو۔ پراسرار باتیں کرنا آ گیا ہے تمہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا.....؟“

”ایسا نہیں ہے.....“ وہ تمللانے لگی۔ ”مجھے غلط مت سمجھو۔ کچھ مجبوریاں ہیں جو میں اُنہیں نہیں کھول سکتی۔ لیکن میری نظریں آسمان پر غور کرنا، خدائی بیولوں کو آپس میں گڈنڈ کرنا دیکھ رہی ہیں۔ وہ نیچے اتر رہے ہیں..... جو کچھ کرنا ہے جلدی کر گزرو..... تمہارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“

”کس دُچار میں کھو گئے خاں صاحب؟“ چندرا نے الفاظ چبائے ہوئے کہا۔ ”کیا اُس لالہ باشتی سے کوئی مشورہ کر رہے ہو جو تمہارے سر پر رہتی ہے؟ سنا ہے بڑی کٹھن،

”آگے کچھ نہ کہنا جمیل.....“ میری باتوں نے انکارانی کو موم کر دیا۔ اُس کے چہرے سے تناؤ کی کیفیت چمکے گی۔ وہ کچھ دیر تک خلاء میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”تمہیں ایک دن کے لئے بنگلور میں قیام کرنا ہوگا۔ پریشان مت ہو، میں چندرا کو تلاش کر لوں گی۔ وہ میری نظروں سے زیادہ دیر اوچھل نہیں رہ سکتا۔“

میں بے نیل و مرام بنگلور آ گیا۔ انکارانی کی موجودگی میں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے میرے قیام کا بندوبست ایک ٹھکانہ ہوٹل میں کر دیا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر غسل کیا تو ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ لیکن چندرا کا خیال میرے ذہن کو کچھ کے لگا رہا۔ وہ میرا آخری شکار تھا، میں اُسے چھپکیاں دے دے کر اسے جہنم رسید کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی نا دیدہ قوت درمیان میں آ گئی۔ چندرا رنج کر نکل گیا۔

وہ کس کی قوت تھی جس نے میرے اور چندرا کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کی تھی.....؟

میرے ذہن میں کالی اور دُرگا کا خیال ابھرا۔ پنڈت اوم پرکاش کی موت کے وقت دُرگانے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ اُس نے مجھے کمزور کرنے کی خاطر کالی کا روپ دھار لیا، کلدیپ کی آتما پر پابندی لگ گئی، پہرے بٹھا دیے گئے۔ پریتم لال کو آسمانوں پر طلب کر لیا گیا، گرد و پتہ کو بھی میری مدد کرنے کے جرم میں کالی کے چرنوں میں بھیٹ چڑھا دیا گیا۔ مرتے مرتے بھی وہ پریتم لال سے اپنی دوستی کا حق ادا کر گیا۔

کالی اور دُرگا ایک ہی چہرے کے دو روپ ہیں۔ جن قارئین کو ہندی دیو مالا پڑھنے کا موقع نہیں ملا وہ اُردو کی انسائیکلو پیڈیا اٹھا کر دیکھ لیں۔ جس میں بات پارتی دیوی سے شروع ہوتی ہے جو اپنے پتی دیو شیو کے ساتھ ہمالیہ کی بلند چوٹی کیلاش پر رہتی ہے۔ پارتی کا نام بھی پہاڑ (پر بت) کی سکونت کے باعث ہی پڑا۔ پارتی کی شکل میں بھی اُس کے دو روپ ہیں، ایک میں وہ بڑی رحم دل، حسین اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس روپ میں اسے ”اوما“، ”گوری“ اور ”بھوانی“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے..... دوسرے روپ میں وہ انتہائی بھیا تک، خوفناک، سیاہ فام، قاتل عورت بن جاتی ہے۔ اس روپ میں وہ ”دُرگا“ اور ”کالی مائی“ کہلاتی ہے۔ پارتی کے کچھ اور نام ”بھیروی“، ”بھگونی“، ”ایٹھوری“

”گر جا“، ”رجیا“ اور سستی بھی ہیں۔ ہندو اس کی پوجا ”دُرگا“ کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ ”دُرگا پوجا“ کا تہوار بڑے دھوم دھڑکے سے مناتے ہیں۔

مجھے دُرگا یا کالی کے اوصاف یا ان کی گوری کالی صورتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے پڑھنے والے گواہ ہیں کہ میں کئی بار کالی کے مندر میں گھس چکا ہوں، جو پنڈت پجاری، سادھو اور گیانی دھیانی میرے جنون کا شکار ہوئے وہ بھی منڈل میں دھونی مارا کر انہی دیوی دیوتاؤں سے شغلی حاصل کرنے کی خاطر جاپ کرتے رہے تھے۔ لیکن انجام کیا ہوا؟ ایک ایک کر کے سب میری وحشتوں کی بھیجٹ چڑھ گئے۔ اب صرف چندرا رہ گیا تھا جو میرے ہاتھ آ کر نکل گیا تھا۔ انکارانی جانتی تھی کہ کون میرے شکار کو میرے عتاب، میرے غضب کا نشانہ بننے سے بچالے گیا۔ اُس نے مجھے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا، کچھ مجبور یوں کے سبب وہ مجھے اس کا نام بتانے سے قاصر ہے۔ اُس نے آسمان پر خوفناک انسانی ہیولوں کو آپس میں گڈمڈ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اُس کی وضاحت کرنے سے بھی قاصر تھی۔ میں جوش میں تھا اس لئے اُس کی باتوں کو غلط رنگ دے بیٹھا۔ مگر ہوا وہی جو اُس نے کہا تھا۔ سیاہ ذرات کا خوفناک گولوا طوفانی رفتار سے گردش کرتا ہوا نیچے آیا، میری آنکھیں جلنے لگیں۔ چندرا غائب ہو گیا..... اور اب میں بنگلور میں ایک ہوٹل کے آرام دہ بستر پر لیٹا چمت لوٹھو رہا تھا، ذہنی جمناسٹک کر رہا تھا، خیالی گھوڑے دوڑا رہا تھا..... ان خیالوں کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ راست آئی، گزر گئی۔ میں سوائے اس کے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا کہ دُرگا نے ایک بار پھر میرے راتے میں حائل ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ اُسی نے ہمالیہ پر بت سے اپنے کسی سیوک کو سیاہ ذرات کے گولے کے روپ میں بھیجا ہوگا جو میری پینائی متاثر کر کے چندرا کو بچالے گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میری وحشتیں پھر جنون کی سرحدوں کو چھو رہی تھیں جب میرے سر پر ہلکا سا دھماکہ ہوا۔ یہ انکارانی کی آمد کی نشانی تھی۔ میں اُسے عالم تصور میں دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس بات کی غماز میں تھی کہ وہ خالی ہاتھ واپس نہیں آئی۔

”کیا ہوا جان جمیل.....؟“ میں نے وحشتوں کو جھٹک کر بڑے پیار سے اسے مخاطب کیا۔ ”تمہاری آنکھوں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ

تم نے میرے دشمن کو لایا ہے۔“

”تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔“ وہ بخیدگی سے بولی۔ ”میرے اختیار میں ہوتا تو میں اُسے لا کر تمہارے قدموں میں ڈال دیتی، لیکن وہ پھر منڈل کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے کافی مانی کے نام پر ایک خطرناک جال پر گھروسہ کر لیا ہے۔“

”وہ ہے کہاں.....؟“ میں نے بہت جلدی سے دریافت کیا۔

”میسور کی پہاڑی پر.....“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”مجھ میں ایک اور بات سن کر بھی تعجب ہوگا۔“

”وہ کیا.....؟“ میرا اضطراب بڑھنے لگا۔

”اُس کا جو ہاتھ جل کر بھسم ہو گیا تھا، دوبارہ اپنی اصل حالت میں واپس آ گیا۔“

”اور کوئی خاص بات.....؟“

”ہاں.....“ انکارانی نے عجیب انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”اب جب تمہارا اور چندرا کا آمناسا منہ ہوگا تو میں تمہیں کسی بات کے لئے مجبور نہیں کروں گی۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں چونکا۔

”تم اُسے مارنے کے لئے دل کی جتنی چاہے بڑا اس نکال لیتا۔“

”میں کیا سمجھوں؟“ میں نے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کہا۔ ”کیا تم مجھ سے

خفا ہو.....؟“

”یہ بات نہیں ہے.....“ اُس نے جلدی سے جواب دیا۔ ”تم سے خفا ہو کر کہاں جاؤں

گی..... اب ہمارا ساتھ کبھی ختم نہ ہوگا۔“

”تم نے پھر مجھے میں گفتگو شروع کر دی؟“

”تھوڑا سا انتظار اور کرو جیل، ہر بات تمہیں معلوم ہو جائے گی۔“ اُس نے بخیدگی

سے کہا، پھر موضوع بدل کر بولی۔ ”جیل۔ تم نے جھڑنا کے سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا وہ یاد

ہے نا.....؟“ اُس کی آواز بھرانے لگی۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم میرے لئے کوئی دوسری جھڑنا

دو گے..... اس سے بھی بہتر۔“

”ہاں.....“ میں نے شپٹا کر اُس کا دل رکھنے کو کہا۔ ”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔“

”کیا ایک انسان کسی دوسرے کا ہم البدل بھی ہو سکتا ہے.....؟“ انکارانی کی

خوبصورت آنکھوں سے نپ مپ آنسو گرنے لگے۔

”ہاں.....“ میں نے اُسے دلاسا دینے کی خاطر کہا۔ ”اگر خاصیتیں ملتی جلتی ہوں، جذبول میں صداقت ہو، انسان آپس میں بچے دل سے سمجھوتہ کر لے، افہام و تفہیم سے کام لیا جائے، دلوں میں گنجائش پیدا کر لی جائے تو ہر بات ممکن ہے.....“ میں نے اپنا جملہ مکمل کر کے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ ”ہم میسور کب چلیں گے.....؟“

”جب تم حکم دو.....“ وہ آنکھوں کے راستے میرے دل میں اترنے لگی۔

اور میں اُسی وقت اُنھ کھڑا ہوا.....!!



KHAN BOOKS
& LIBRARY
S-527, BHABRA BAZAR, RAWALPINDI.
Cell: 0345-5048634 - 0345-5048559
Prop: Ali Khan

<http://urdu-novelist.blogspot.com>

”میری پیاس اب چندرا کے خون سے ہی بجھے گی۔“

”وہ جہاں بیٹھا جا پ کر رہا ہے وہ جگہ یہاں سے دور نہیں ہے۔“

”مجھے وہاں لے چلو۔“ میں نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

انکارانی میری رہنمائی کرنے لگی۔ مجھے پُر پیچ اور مسطح چٹانوں پر قدم جما کر چلنا پڑا۔ ایک ذرا سی غفلت مجھے میلوں نیچے کسی کھڈ میں گرا سکتی تھی۔ تین چار گھنٹے متواتر چلنے کے بعد مجھے چٹان کے اوپر ایک اور چٹان آسمان کی طرح جھکی ہوئی نظر آئی۔ دونوں کے درمیان اونچائی اتنی نہیں تھی کہ میں کھڑے کھڑے آرام سے چل سکتا۔ مجھے مزید احتیاط برتنی پڑی۔ سر جھکا کر چلنا پڑا۔ رفتار میں کمی آگئی۔ لیکن میں بالآخر اس غارتگ پہنچ گیا جہاں سورج کی روشنی بھی موجود تھی۔ شاید غار کے عقبی دہانے پر کوئی جگہ ایسی خالی تھی جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ غار خاصا کشادہ تھا۔ اوپری چٹان بھی بلندی پر تھی۔

میں نے چندرا کو دیکھا جو کمر اکڑائے تنا بیٹھا دم آواز میں کسی منتر کا جا پ کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ میرے قدموں کی آہٹ پر نہیں چونکا۔ کالی کے جا پ میں بہت زیادہ منہمک معلوم ہوتا تھا۔

”جہیل.....“ انکارانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، آج میں تمہارے اور چندرا کے بیچ کوئی خل نہیں دوں گی۔ تم اپنے دل کی تمام حسرتیں پوری کر لینا۔“ میں نے فوسے غور سے دیکھا، وہ ناراض نہیں تھی۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر چندرا کو لٹکا دیا۔

”بہت گڑبڑ اچکا پانی، اب کالی کو چھوڑ دے۔ آج اس کی شکتی تیرے کسی کام نہیں آئے گی۔ پتھر کی مورتی میں جان ہوتی تو پتھر کی بیماری اس کے چروں میں تھاں سجا سکا کر کبھی نہ پیش کرتے۔ یہ سارے چڑھاوے تمہارے پردہ ہوتوں، پنڈتوں اور پجاریوں کا پیٹ بھرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ تمہارے گیانی دھیانی پنڈتوں نے اچھا ڈھونگ رچایا ہے۔ ادھر کوئی دھری عقیدت سے تھاں اور ہار پھول رکھ کر ہٹا، ادھر تمہاری بیماری اس کو چٹ کر جاتے ہیں۔ ہار پھول دیو داسیوں کے گلے میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ ان کے بدن اور منہمک اٹھتے ہیں.....“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“ یہ باتیں تجھے تیرے پنڈت اور پجاری کبھی نہ بتائیں گے۔ تو جان کر کرے گا بھی کیا، تیرا سے آ

میں نے میسور کی پہاڑیوں پر قدم رکھا تو کلدیپ کی یاد نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا۔ مجھے ماضی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ زخم پر جی کھر کھر جانے لگے۔ میں نے طے کر لیا کہ چندرا کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد میں پریتم لال کی اس کنیا پر بھی ضرور جاؤں گا جہاں کلدیپ نے میری خاطر پوری جوانی بچا دی تھی۔ میرے لئے اس سے زیادہ پرسکون جگہ، راحت بخش ٹھکانا اور کون سا ہو سکتا تھا.....؟

میسور کی پہاڑیوں کے راستے میری آنکھوں میں بے تھے، ایک ایک جگہ نڈی میری دیکھی بھالی تھی۔ میرا ماضی میرے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا۔ انکارانی بھی اس نظر رہی تھی۔ چار روز کی جھکن آمیز مسافت طے کرنے کے بعد میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں میری اور مالا رانی کی ملاقات ہوئی تھی۔ میں درختوں سے گزر کر اسی جھرنے کے قریب پہنچ گیا جہاں پہلی بار میں نے مالا رانی کو سورتا پائیا تھا۔ وہ اس علاقے میں پریتم لال کے ساتھ برسوں سے رہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہاں دور دور تک کوئی دوسرا آدم زاد نہیں ہوگا۔ لیکن میری گناہ گار نظروں کو اس ہوشربا منظر کو دیکھنے کا اتفاق ہو گیا۔ آپ واقف ہیں، یہی اتفاق میری اور پریتم لال کی ملاقات کا سبب بنا تھا۔ اسی اتفاق نے میری کلدیپ کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ اُس نے میری خاطر پریتم لال کی کنیا میں آسن جما لیا۔ جب تک زندہ رہی، میری خاطر دیوی دیوتاؤں کا جا پ کرتی رہی۔ پھر امر لال کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد خود بھی امر ہو گئی۔

میں تا دیر اس جھرنے کے کنارے کھڑا اپنے ماضی میں گم رہا۔ بڑی دیر گزر جانے کے بعد انکارانی نے مجھے مخاطب کیا۔

”تم یہاں رک کیوں گئے جہیل.....؟ رُکے ہو تو اپنی پیاس بھی بجھا لو۔ اتنا بیٹھا اور غنڈا پانی تمہیں پورے میسور میں کہیں اور نصیب نہیں ہوگا۔“

”ابھی تو نادان ہے بالک اتنی جلدی بھول گیا کہ تو نے بھی منزل کھینچ رکھا ہے۔“ میں نے زہر خند سے پوچھا۔ ”بدھی سے کام لینا کب سیکھے گا.....؟“

وہ ایک لمحے کو خفیف ہوا، پھر اُس نے دونوں ہاتھ بلند کئے تو بادلوں کی چنگھاڑ شروع ہو گئی۔ میری نگاہوں کے سامنے چٹان کا ایک حصہ شق ہوا، اُس میں سے بھاپ کے ساتھ کھولتا ہوا پانی اتنی تیزی سے اُبل کر میری طرف آیا کہ میں بھی گھبرا گیا۔ انکا رانی نے ہر وقت یاد نہ دلایا ہوتا تو شاید میں بوکھلا کر حصار سے باہر نکل گیا ہوتا۔ چندرا کی آواز جٹانوں میں گونجی۔

”تو بھی ڈر گیا نا..... بڑا مرد بن رہا تھا۔“

”ہاں یا لک..... میں انکار نہیں کروں گا۔“ میں نے مردانگی سے اُس کی بات قبول کر لی۔ میں بھول گیا تھا کہ تو کس حرامزادے کی اولاد ہے۔ کالی مائی کے علاوہ اُس نے بھی مجھے بہت کچھ دان کیا ہوگا..... اب ایسا نہیں ہوگا۔ تیری جھولی میں جتنی آتش بازی، جتنے پائے اور میں انہیں ابھی پھوڑ ڈال۔ تو تھک جائے گا تو میں تجھے لاشی کا کمال دکھاؤں گا..... رُک میں جا کر اپنے ہاتھ کو بھی بتا دینا کہ تو نے کیسے کیسے اچھے دیکھے ہیں۔“

میں نے لاشی کو ذرا سا گھمایا تو چندرا کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ اُس نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا، پھر اس نے ایک ایک کر کے اپنے ترش کے سارے تیر آزما لئے۔ کبھی خوفناک درندے زمین سے ابل ابل کر میری طرف چھلانگیں مارتے، کبھی کڈیلے سانپوں کی فصل اُگ آتی، کبھی گاڑھ کاڑھے غوی کی بارش ہونے لگتی، حشرات الارض بلبلا تے ہوئے میری جانب لپکتے، کبھی گھپ اندھیرا طاری ہو جاتا، بجلیاں زور زور سے کڑکنے لگتیں۔ میں سب کچھ دیکھتا رہا۔ میں حصار کے اندر کھولے کھانے میں بھل سے کام نہیں لوں گا، میں تسلیم کروں گا کہ چندرا نے دندھیا چل کی برفانی چھانوں میں بیٹھ کر اپنا وقت نہیں ضائع کیا تھا۔ اُس نے بدری نرائن سے زیادہ ہلکتیاں حاصل کی تھیں۔ جگہ کیلاندہ ہوا تو وہ بھی چندرا کو گھلے لگا کر تھپکیاں دیتا، گرد و پتہ پ بھی سشدر رہ جاتا، نول شور کو خبر

چند رائے آنکھیں کھول دیں، سرخ سرخ نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی جلدی دوبارہ موت بن کر اس کے سر پر سوار ہو جاؤں گا۔ اس کی آنکھیں سیدھی اٹھی پر بار بار کھٹکھٹ رہی تھیں جس نے دوبار اس کے منڈل کو توڑ دیا تھا۔

”کیا دیکھ رہا ہے بالک، میں وہی ہوں جسے تو جمل دے کر بھاگ نکلا تھا۔ سیاہ ذرات کے گبولے نے تیری جان پچالی تھی، تجھے پار پیونج روز سانس لینے کا موقع اور مل گیا..... آج ایسا نہیں ہوگا۔ سن رہا ہے مٹھرا کے بیڑے کے گرد کے لڑکے؟“

”تو دیوانہ ہو گیا ہے، گھمنڈی بن گیا ہے۔“ چند روز کے بڑے سکون سے جواب دیا۔

”بڑی دُور سے چل کر آیا ہے، جا..... جا کر اِشان کر لے، کہو کہ پالا۔ تیرے چہرے پر جو گرد اور گند جی ہے اسے دُور کر لے، پھر آ جانا..... آج میں تجھے ایسا پُراہنہ پہناؤں گا جسے تیری آتما بھی کبھی نہیں بھولے گی۔“

”ایک اجازت اور دے دے بالک.....“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”بول.....“ وہ میرا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی۔

”تو کہے تو پھول چن لوں.....؟“

”کہاں ہیں پھول.....؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”تیرے منہ سے جھڑپ ہے ہیں.....“ میں نے مسکرا کر کہا تو وہ تمللانے لگا۔

”پھر اونچا اڑنے لگا.....؟“ اُس نے خود کو سنبھال کر جواب دیا۔ میں نے سید کی آنکھوں کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔

”چندرا..... میں تجھے ایک موقع دے رہا ہوں، کوئی آخری خواہش ہو تو بتا دے۔ میں نے انہی گھمادی تو پھر تجھے موقع نہیں ملے گا۔“

چندرا نے منڈل کے اندر بیٹھے بیٹھے پھونک ماری۔ تیز دھار برچھیاں ہوا میں لہرائی ہوئی میری سمت لپکیں..... کوئی اور ہوتا تو اُبلتی ہوئی شکر قندی کی طرح ایک ہی پہلے میں کی ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتا۔ میں اس قسم کے ہزاروں کھیل تماشے دیکھ چکا تھا۔ میں نے ہندوؤں کی لاشیں سامنے کر لی۔ برچھیوں کی شکل میں نمودار ہونے والے بیر بھی ایک چیخ مار کر غائب ہو گئے۔ میں نے چندرا کو لٹکا کرنے سے پیشتر ارتکاز اور مراقبہ کے عمل کے علاوہ حصار دہائی

ہوتی تو وہ اسے ساتھ ہی رکھتا، خود سے ملحدہ نہ کرتا۔

بہر حال میری جگہ کوئی اور کھڑا ہوا تو اُس کے قدم نہ جانے کب کے اپنی جگہ سے اکھڑ چکے ہوتے۔ لیکن وہ میری نسبت میں گزاری ہوئی زندگی سے ناواقف تھا۔ اُسے کپالا اور مندا کی پراسرار قوتوں کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں تھا۔ اُس نے میرا حصار توڑنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ میں انکار نہیں کروں گا کہ مجھے بھی دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔ سید کی تبرک لالچی نہ ہوتی، انکارانی بار بار مجھے ہتھکارتی تو گھبرا کر حصار سے باہر آ جاتا۔ بدری نرائن سے آخری معرکہ سر کرتے وقت چندر کے باپ امر لال نے ایک بار مجھے دھوکہ دے کر حصار سے باہر کھینچ لیا تھا۔ اُس وقت کلدے میرے برابر نہ کھڑی ہوتی تو شاید بازی اُسی روز پلٹ جاتی۔

چندرا تھک ہار کر ہانپنے لگا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ پھر بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا رہا تھا۔

”انکارانی.....“ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”یہ بار بار اوپر کیا دیکھنے لگتا ہے؟“

”نہیں..... آج ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن.....“ انکا کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”تم چیپ کیوں ہو گئیں.....؟“ میں نے وضاحت چاہی۔ ”کیا بات ہے.....؟“

”چندرا کسی کی مدد کا انتظار کر رہا ہے۔“

”کون آئے گا اس کی مدد کرنے.....؟“ میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”کون باقی

رہ گیا ہے جسے جمیل احمد خاں کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے؟ کس کو اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟

”تم..... تم کہیں دیوی دیوتاؤں کی نایدہ ہتھکڑیوں کی بات تو نہیں کر رہیں.....؟“

”نہیں.....“ وہ کسمسا کر بولی۔ ”چندرا اس وقت اپنے باپ کو یاد کر رہا ہے۔“

”اوہ..... امر لال.....“ میرے اندر جنون سر مارنے لگا۔ ”وہ امر لال جسے میری

کلدے پ نے نکلے نکلے کڑے کر دیا تھا.....؟ غور سے دیکھو انکارانی، وہ امر لال نہیں، اُس کی

بے چین روح ہوگی جو چندرا کو میرے سامنے دیکھ کر بلبلارہی ہوگی..... اچھا ہے، آنے

اُسے۔ میں آج اُس کی آتما کو بھی شانت کر دوں گا۔ دھرتی سے اس کے سببہ توڑ دوں

گا..... خاک میں ملا دوں گا۔“

پھر میں نے چندرا کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اپنے جہنم نصیب باپ کی آتما کا انتظار کر رہا ہے.....؟ تیرے پلے میں کچھ نہیں رہ گیا.....؟“

”جمیل احمد خاں.....“ چندرا نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ”میرے پتا کی شان میں کوئی غلط شبہ زبان سے نہ نکالنا۔ وہ مہمان تھا، دھرتی پر اُس کے مقابلے کا کوئی دوسرا پینڈت نہیں گزرا۔ کالی اُسے پسند کرتی تھی۔ تیری سندری نے اپنا جیون داؤ پر نہ لگا دیا ہوتا تو دیوی اس کی سہانا کبھی نہ کرتی۔ اب بات کچھ اور ہے۔ تیری سندری کے ہاتھ پیر جکڑ دیئے گئے ہیں، اس کی آتما کو قید کر دیا گیا ہے۔ میرے پتا کو آج بھی دیویوں کا آئینہ واد حاصل ہے۔ اس کی آتما آگئی تو تیری بولتی بھی بند ہو جائے گی۔“

”پھر سننے دیکھنے لگا؟“ میں نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔

انکارانی خاموش بیٹھی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے مجھے بازی جلدی منانے کی بات

نہیں کی۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ چندرا کو جکڑ دوں، ایک ہی وقت میں چندرا اور امر لال کی

آتما کا مقابلہ مہنگا پڑ سکتا تھا۔ وہ کسی روپ میں آتا تو اور بات تھی۔ میں نے اپنے ارادے

کالی نے میں دیر نہیں کی۔ سید کی لالچی گھما کر منزل کی طرف اچھال دی۔ کالی کے نام پر

چندرا حصار بھی ٹوٹ گیا۔ چندرا بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں پھر آسمان کی جانب

نہیں۔ میں نے حمایت کی انگلی اٹھا کر دائرے کی شکل میں گھمانی شروع کی۔ چندرا

اویں اور سیوں میں جکڑ گیا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلانے سے قاصر تھا۔ اُس کی نگاہوں سے

ایسا اُبلنے لگیں..... میں نے سید کی لالچی اٹھالی۔ چندرا کو گھور کر حقارت سے کہا۔

”جنتا مت کرو ولد الحرام، میں اتنی جلدی تجھے اوپر نہیں بھیجوں گا۔ امر لال کی آتما کو بھی

پئے لینے دے، آج فیصلہ ہو جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ میں روز روز کی بک بک

لک جھک سے تنگ آ گیا ہوں.....“

میرا جملہ مکمل ہوا تو چٹانیں اس طرح لرزنے لگیں جیسے زلزلہ مچ گیا ہو..... میں گھبرا گیا۔

”حصار سے باہر قدم نہ نکالنا جمیل۔“ انکارانی نے تیزی سے کہا۔ ”امر لال کی آتما نیچے

گئی ہے۔ تم جسے زلزلہ سمجھ رہے ہو وہ اُسی کے جنتر منتر کا چسکار ہے۔“

”امر لال.....“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”اپنی آتما کو کوئی روپ دے کر مچے آ جا۔

بھول کی طرح چھپ کر وار کرنا تجھے شہا نہیں دیتا۔ کالی اور دُرگا کے نام کو بنا لگ جائے

نفرت کے بیچ بھی اُسی نے بوئے تھے، چندرا بھی اُس کے بہکاوے میں آگیا اور تم..... تم نے بھی اُسے مجھانے کی کوشش نہیں کی۔ کیا تمہیں میری شہتی اور حالات کا علم نہیں تھا.....؟“

”شہتی کی بات سن کر مانی.....“ وہ بل کھانے لگا۔ ”جب میں نے تیری سندری پر وار کیا تھا اُس سے تو بھی وہاں موجود تھا۔ یاد ہے تجھے، اُس کے جسم میں کتنی سونیاں چھب گئی تھیں، میں نے تیرے سامنے سے ہٹ کر دیا تھا۔ اُس کے اُبلے شریر کو سیاہ کر دیا، اُس کے پورے بدن پر آبلے ابھر آئے تھے، اُس کا چہرہ بھانک کر دیا تھا، وہ کشت کی حالت سے دوچار تھی، مجھے بعد میں خبر ملی کہ وہ دیوی کو اپنی ہتھکڑی کا وچن دے چکی ہے۔ میں مندر کی اور اسی کارن دور تھا کہ وہ دیوی کو راضی کر لوں، مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں اپنی بھینٹ پیش کر دیتا، تیری سندری کی ایک نہ چلتی۔ میں اُس کے ساتھ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ بدی نرائن بھی نہ مرنے، چندرا کو تیرے منہ لگنے کی ضرورت بھی نہ پیش آتی۔“

”تو بکواس کر رہا ہے.....“ میں نے غضب ناک لہجے میں جواب دیا۔ ”میری کھال نے تجھے درمیان سے ہٹ جانے کو کہا تھا، تو نے اُس کی بات نہیں مانی، تجھے شہتی آواز کی دعوت بھی اُسی نے دی تھی۔ وہ پہل کر دیتی تو تجھے چسکا رکھانے کا موقع کبھی نہ ملتا۔ تو نے جو کچھ کیا، مجھے یاد ہے..... تجھے بھی یاد ہو گا کہ اُس نے تجھے کئی موقع دیئے تھے، جوابی حملہ کرنے سے پہلے بھی اُس نے تجھ سے اجازت لی تھی، پھر ایک بل میں وہ اپنی اصلی حالت میں آگئی۔ اُس نے صرف اپنا لرزتا ہاتھ اٹھایا تھا، تو بلبل اٹھا، تیرے شریر سے خون اُبلنے لگا، جان بچانے کی خاطر تو مندر کی طرف بھاگا تھا۔ اُس نے انگلی گھمادی، تیرے شریر کے گلے ہو گئے۔ اب وہ نہیں رہی تو شہتی بگھار کر مہمان بننے کی کوشش کر رہا ہے۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ میں غصے سے لرز رہا تھا۔ ”یاد ہے تجھے کینے؟ میں اُس وقت بھی تجھ سے بھڑ گیا تھا۔ میں نے تیری ہڈیاں چھا ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کلدھپ کو ڈعا دے بڑبولے، اُسی نے مجھے راستے سے ہٹنے کو کہا تھا، ورنہ میں بدی نرائن کی طرح تجھے بھی لٹاڑ لیتا۔“

امر لال، چندرا کے رُوپ میں سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی دہکتی ہوئی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میں نے سید کی لالچی پر اپنی گرفت مضبوط کی لیکن مجھے حملہ کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ امر لال اُچھل کر دوڑ چلا گیا۔ اُس کی نظریں اب لالچی کو گھور رہی تھیں۔ پریم لال کی

طرح وہ بھی اُس کی کرامتوں کا راز جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے چلیوں کو جنبش دی، امر لال چکرا کر زمین پر گرا۔ اُس نے اٹھنے کی بجائے جوابی حملہ کیا، میرا حصار ٹوٹ گیا۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آخری معرکے کے وقت بھی اُس نے میرے حصار کو توڑنے کی خاطر اپنے سارے جنر منتر آزمائے تھے، اُسے کامیابی نہیں ہوئی تھی..... پھر، وہ آج کس طرح کامیاب ہو گیا تھا؟ مجھے سکتے کی کیفیت سے دوچار دیکھ کر وہ بھی حیرت سے ہلکیں جھپکا تا ہوا تیزی سے اٹھا، اُس نے اپنے سر کو تیزی سے جھٹکا، میں فلا بازیاں کھانے لگا۔ موت کا تصور میری پلکوں تلے گھوم گیا جب یکلفت کسی نادیدہ قوت نے مجھے چٹان سے ٹکرانے سے بچالیا..... میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ امر لال نے ہاتھ فضا میں بلند کئے، لیکن ہاتھ کے ساتھ وہ خود بھی اوپر اٹھتا چلا گیا۔ دونوں چٹانوں کے بیچ فضا میں معلق ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اُٹلا پاؤں زمین پر مارا، آگ کے شعلے بلند ہو کر امر لال کی طرف لپکے، وہ ہوا میں پتنگ کی طرح تیرتا ہوا ایک طرف ہو گیا۔ میں نے دوسرا وار کیا، وہ لہرا کر دوسری طرف نکل گیا۔ میں نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ وہ پتنگ کی طرح فضا میں اڑتا رہتا رہا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ امر لال کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ مجھے تعجب تھا کہ اُس نے پلٹ کر ایک بار بھی میرے حملے کا جواب نہیں دیا۔ انکارانی میرے سر پر کسی بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

”یہ..... کیا ہو رہا ہے.....؟“ میں نے انکارانی سے دریافت کیا۔

”ذور تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔“ اُس نے بڑی مدغم آواز میں سرگوشی کی۔ ”جس کے ہاتھ میں ہے، وہی پیچ لڑا رہا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”اُس کی بات کر رہی ہو.....؟“

انکا کوئی جواب نہ دے سکی، امر لال فضا میں بلند ہوا۔ چٹان سے ٹکرایا۔ اُس کا سر پھٹ گیا۔ اُس کا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوئی، سر جھکے کے بعد وہ پہلے لہراتا ہوا دائیں جانب کی چٹان سے ٹکرایا، اُس کے اعضاء ٹوٹ ٹوٹ کر الگ ہو رہے تھے۔ اچانک وہ اوپر کی جانب بلند ہوا، فلا بازی کھا کر پلٹا، پھر بڑی تیزی سے سر کے بل کے نیچے آ کر فرش سے ٹکرایا۔ اُس کے جسم کو آگ لگ گئی۔ وہ جل بھن کر راکھ ہو گیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا

آیا، اُس کی دکان کو اُڑا لے گیا۔ میں نے انکارانی پر نظر ڈالی، وہ بری طرح سہمی ہوئی تھی، جیسے سانپ سوچ رہا ہو۔ میں نے اُسے اتنا خوفزدہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”جہمیں کیا ہو گیا.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”سچ ختم ہو گیا..... کنکوا (چنگ) کٹ گیا.....“ وہ سید جھدوب کی آواز تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ ایک طرف چٹان کے لگا ہوا اس طرح دونوں ہاتھ چلا رہا تھا جیسے چرخی پر ڈور لپیٹ رہا ہو..... بات میری سمجھ میں آگئی، اسرار ال کی آتما کالی طاقتوں کے ساتھ مجھے گھیرنے آئی تو وہ میرے بچاؤ کو آگیا..... وہی سچ ختم ہونے کے بعد ڈور لپیٹ رہا تھا۔ انکارانی کا اشارہ اُسی کی طرف تھا، اُسی کی وجہ سے وہ اُن کی نظر آ رہی تھی۔ سید نے کھیل ختم کرنے کی ٹھان لی ہوگی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ درمیان میں کبھی نہ آتا۔ یہ اول بچ آیا۔

”اب تو میری اُنکلی پکڑ لو سید.....“ میں نے التجا کی۔ ”مجھے کوئی ٹھکانا تو دو جہاں میں سکون سے بیٹھ سکوں۔“

”جا کر نہالے..... گند صاف ہو جائے تو اوپر کی طرف دوڑ لگا دینا.....“ سید نے سر

کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ ”پودنی کے کہنے پر ٹھیکے مت لگانا..... داماد مست قلندر کیا کر۔“

میں اُس کی طرف لپکا، وہ پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انکارانی کی سانس بحال ہو گئی۔ اُس نے سکون کا سانس لیا۔ میں بڑی دیر تک اسی جگہ کھڑا حالات پر غور کرتا رہا۔ انکارانی پھیل کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر اب بھی گم صم نظر آ رہی تھی۔ سید کے آخری جملے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ میں تھکے تھکے انداز میں قدم اٹھاتا غار سے باہر آ گیا۔ میری رفتار سست تھی، ذہن میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں، ہنگامے ختم ہو جائیں تو اسی قسم کی صدا میں تعاقب شروع کر دیتی ہیں۔ میں مضحل انداز میں اپنی تھکی ماندی زندگی کو قدموں پر گھسیتا پھر اُسی جھرنے پر پہنچ گیا۔ انکارانی میرے سر سے اُتر گئی۔ وہ میرا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ میں نے ایک کنج میں جا کر لباس اتارا، اوپر سے گرتے جھرنے کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈا پانی جسم پر پڑا تو ذہن پر طاری کسلندی دور ہونے لگی۔ میں نے رگڑ رگڑ کے جسم سے سارا میل دُور کیا۔ کسی جھرنے کے پانی سے نہانے کا پہلا اتفاق تھا۔ میں دیر تک غسل کرتا رہا۔ پھر میں نے خود کو ایک پتھر سے نکا دیا۔ پہاڑوں پر جھرنے سے نہانے والے تو یہ نہیں استعمال کرتے، دُھوپ کی خوشگوار گرمی اور ہوا کے مست جھونکوں سے جسم

خٹک کرتے ہیں۔ کچھ دیر بعد میں تازہ دم ہو گیا۔ میں لباس زیب تن کر کے کنج سے باہر آیا تو انکارانی دوبارہ سر پر آ گئی۔ اُس کے گلابی ہونٹوں پر زندگی کے اثرات واپس آ رہے تھے۔ میں نے اُسے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

”تم لباس اتارتے وقت میرے سر سے اُتر کیوں گئی تھیں؟ پہلے تو تم بڑی ڈھیٹ ہوا کرتی تھیں۔“

”وقت کے ساتھ ساتھ انسان کو بدلتے رہنا چاہئے.....“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”اب کیا ارادے ہیں.....؟“

”یہاں تک آیا ہوں تو ایک نظر کلدیپ کی کنیا پر بھی ڈالتا چلوں۔“ کلدیپ کی یاد آئی تو میں پھر اُداس ہو گیا۔

”کیا سوچنے لگے.....؟“

”اب تھک گیا ہوں۔ کہیں آرام سے بیٹھنا چاہتا ہوں۔“

”کلدیپ اور پرتم لال کے استھان سے زیادہ اور کون سی پُرسکون جگہ ہوگی؟“

”کبھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ”میرے دشمن مجھے کبھی کون سے ٹھکانے بیٹھنے دیں گے۔ بار بار ٹانگ پکڑ کر گھسیٹے رہیں گے۔“

میں انکارانی سے باتیں کرتا اُس مقام تک پہنچ گیا جہاں کلدیپ رہا کرتی تھی۔ میرا دل تھا کہ وہ جگہ اب بھی اُن کا رہنا ہوگی۔ اُجاڑا اجاڑ محسوس ہوگی۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ علاقہ اب بھی اُن کا رہنا تھا جیسا پرتم لال کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ کنیا بھی اصلی حالت میں تھی جس میں میں نے اُسے آخری بار دیکھا تھا۔ لیکن اب کچھ فرق ہو گیا تھا۔ اس کے سامنے ہزرے پر دونوں اطراف پھول دار درخت بڑے سلیقے سے لگائے نظر آ رہے تھے۔ میں قدم قدم اٹھاتا آگے بڑھتا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں کچھ تھی، بیتے دنوں کی یاد مجھے تڑپا رہی تھی جب میں کلدیپ کو دیکھا۔ وہ اچانک حسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے آ گئی تھی۔ میرے دل کے آئینے میں بھرا آگئی ہو۔ انکارانی میرے سر سے نہیں اُتری۔

”کلدیپ..... تم.....؟“ میں نے اُسے ڈرتے ڈرتے مخاطب کیا۔

”ہاں جمیل..... تم برسوں بعد آئے ہو، میں تمہارے قدموں کی آہٹ سن کر کنیا سے

”جیل.....“ انکا نے دبی زبان میں کہا۔ ”آگے بڑھ کر ایک نظر کنیا کے اندر بھی جانک لو۔ وہاں بھی کوئی تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہے۔“

”کون..... کون ہو سکتا ہے؟ کلدیپ کے بعد اور کون باقی رہ گیا.....؟“ مجھ پر دیوانگی اری ہونے لگی۔

”تم تزئین کو کیوں بھول رہے ہو.....؟“

”ہاں.....“ میرے اندر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لندن سے واپسی کے بعد میں کمین سے نہیں مل سکا تھا۔ وقت اور حالات نے اتنی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ انکارانی نے کمین کا نام لیا تو میرے دل میں اُس کی محبت جوش مارنے لگی۔ میں کنیا کی طرف بڑھتے ہتے رک گیا۔

”تم رک کیوں گئے؟“ انکارانی نے تعجب سے پوچھا۔

”مجھے اچانک ایک خیال آ گیا.....“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارا مقروض ہوں، سید کے آ نے سے تمہاری دعوت کا اہتمام نہ کر سکا۔“

”میں سمجھی نہیں.....؟“

”میں چندرا کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے تم نے کہا تھا کہ اس کے خون میں تاڑی سیاہی ہوگی۔“

”تم اپنا وعدہ پورا کرتے تو بھی میں انکار کر دیتی.....“ انکا آسمان کی بلندیوں میں گم دے لگی۔

”میں سمجھا نہیں.....؟“

”غلط مت سمجھنا.....“ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ”تمہیں دے نا کہ ایک پنڈت مجھے حاصل کرنے کے لیے باپ سے شروع کر چکا تھا۔ وہ کامیاب ہو سکتا تھا، لیکن تمہارے مرد قلندر کے ایک اشارے نے اُس کی لٹیا بھی ڈوبی۔ اُس نے کہا غاکہ اب دنیا کی کوئی قوت مجھے تسخیر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی گی۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔ آج تمہیں ایک راز کی بات اور بھی بتا دوں۔“

میں نے جواب نہیں دیا، خاموشی سے اُس کی بات سنتا رہا۔

”تم جب حویلی میں ایک بزرگ کے مزار پر گئے تھے مجھے اُسی وقت پنڈت شیوا کے

باہر آ گئی۔ تمہارا سواگت کرنا تو میرا حرم ہے.....“ اُس کے لہجے میں محبت کی چاشنی گھل گئی۔ اب تم نہیں رہنے کی ٹھان لو واپس پلٹ کر مت دیکھنا۔ بلند یوں پر رہنے کی عادت پڑ جائے گی تو تم خود ہی نیچے کی طرف رخ نہیں کرو گے.....“

”اور اگر تم نے پھر ساتھ چھوڑ دیا.....؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

”میں تم سے دُور کب ہونے لگی.....؟“ اُس کا انداز دلربا نہ تھا۔ ”اپنے دل کو نٹول کر دیکھو، میں اب بھی تمہارے دل کی ایک دھڑکن میں موجود ہوں، ہمیشہ رہوں گی۔ وہی میری اصلی جگہ ہے۔ جہاں میرے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔“

”تمہاری باتیں آج بھی تمہاری ہی طرح خوبصورت اور حسین ہیں۔“ میں شوخ ہونے لگا۔ ”دل کو گرمانے والی..... لیکن.....“ میں یکھت خاموش ہو گیا۔

”لیکن کیا جیل؟ تم چپ کیوں ہو گئے.....؟“ اُس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

اُس کی نیل کنول جیسی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

”ختم..... تم تو مر گئی تھیں؟“ میری آواز بھرا گئی۔ ”کیا تم نے دوسرا جنم لیا ہے.....؟“

”نہیں.....“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”دوسرے جنم کی باتیں جھوٹی ہیں، من کا پہلا واپس انسان جنم لیتا ہے تو اسے موت بھی ضرور آتی ہے۔ لیکن سچا پریم امر ہوتا ہے، کبھی نہیں مرتا۔ شریر کے سمبندھ تو بڑے عارضی ہوتے ہیں، کالج کے گلاسوں کی طرح، ذرا ٹھیس لگے تو ٹوٹ جاتے ہیں۔“

”مم..... میں تمہیں کیا سمجھوں.....؟“

”اپنا سچا پیار، اپنی سچی محبت، اپنی کلدیپ۔“ وہ شرما کر بولی۔ ”کلدیپ جو تمہارے من میں ہمیشہ خوشبو کی طرح رچی بسی رہے گی۔“

میں نے دوڑ کر اُس کو ہاتھوں کے حصار میں لینا چاہا، وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شاید وہ میرا تصور تھی، میرے پیار کی شدتوں نے ایک خیالی رُپ میرے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ میرے دل کی دھڑکنوں میں میرے ساتھ ساتھ رہے گی۔ اُس نے غلط نہیں کہا تھا، وہ میرا پیارا تھی، اُس نے میری زندگی کی خاطر اپنی جوانی برباد کر دی۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی تھی۔ وہ میرے دل میں، میرے خیالوں میں، میری سانسوں میں شریک تھی، اُس کی جگہ چین بھی نہیں لے سکی.....

رانی کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا، اُس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے، کسمسا کر بولی۔

”تم اتنی جلدی بھول گئے جمیل.....؟ مجھے تمہارا کہا ہوا ایک ایک لفظ حرف بحرف یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ اگر خالصتیں ملتی جلتی ہوں، جذبول میں صداقت ہو، انسان سچے دل سے آپس میں سمجھوتہ کر لے..... انہام و تقسیم سے کام لیا جائے، دلوں میں گنجائش پیدا کر لی جائے تو ہر بات ممکن ہے..... یاد ہے تمہیں.....؟“

”تو کیا تر تین.....؟“ میری آواز حلق میں گھٹ گئی۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں جوار بوائے کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔

”ہاں..... تر تین اب اس دنیا میں نہیں رہی۔“ انکا کی آنکھیں برسنے لگیں۔ ”ہر دور میں جب تم پنڈت نول کشور کی قید سے نکل آئے تھے تو وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اُس نے تمہیں کزور کرنے کی خاطر ہماری تر تین کو درمیان سے ہٹا دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ تمہیں تر تین کے بارے میں علم ہوا تو تم واپس ہمیں چلے جاؤ گے، اُسے سنبھلنے کا موقع مل جائے گا۔ میں نے اُس پر پتھر رکھ کر تر تین کی موت کی خبر تم سے پوشیدہ رکھی۔ وہ وقت کا تقاضہ تھا جمیل، میں نے جھوٹا کی موت کی آڑ لے کر اپنی تر تین کے لئے آنسو بہائے۔ وہ مجھے بہت زیادہ عزیز تھی۔ سر قلمدار کا اشارہ بھی یہی تھا کہ میں زبان کھولنے سے گریز کروں۔ رکن الدین کی حویلی میں بھی سب کو بتا کر دی گئی تھی کہ کوئی تر تین کے سلسلے میں زبان نہ کھولے۔“

اُس نے بات جاری رکھی۔ ”اُس سر قلمدار کو بھی احساس تھا کہ تر تین کی موت تمہیں اور تنہا کر دے گی۔ اُس نے جھوٹا کی زندگی میں انہماک برپا کر دیا، اُس کی کاپیٹ دی۔ کل تک یہ کلمے سر پنڈت پجاریوں کے سامنے چھری مکر رہے تھے اچھلتی پھرتی تھی، اب یہ انہماک کے وقت اپنے مالک کے سامنے سجدہ کرتی ہے۔ اُس کی زبان پڑھ رہی ہے۔ سب اُسی انداز کی نگاہ عنایت کا نتیجہ ہے۔ اُسی نے اس کا نام بھی تر تین ہی سے رکھا ہے.....“

میرے دل پر نشتر چل رہے تھے۔ میں کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ میری زندگی کی آخری لڑائی تر تین کی شکل میں میرے دشمنوں نے لوٹ لی تھی۔ انکارانی اپنے جھگڑے آنسو بہا رہی تھی، اب میں خون کے آنسو رو رہا تھا، مایہ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا جب وہ محسوس کرنے لگی کہ چھوٹے قدم اٹھاتی میرے قریب آ گئی۔ سید نے اُسے عقل و شعور کی بے پناہ

بارے میں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ناکنگ کی حویلی میں تمہاری موجودگی کی بھنگ پا کر نکل بھاگنے کی ہوس کر رہے۔ میں اُسے روکنے کے لئے روانہ ہوئی تھی۔ لیکن کسی نے میرا راستہ روک لیا۔ جاتے جاتے اُس شخصیت نے مجھ سے کیا کہا تھا.....؟“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اُس نے کہا تھا کہ اُس کی کھال میں رہا کر..... زیادہ پھدکنے کی کوشش کی تو پر قبض کر دوں گا..... کلدیپ اور پریم داس کی آتماؤں کو بھی اسی نے تمہارے معاملات میں مداخلت سے روک دیا تھا، اس میں دُرگیا کالی کا ہاتھ نہیں تھا۔ نارنگ کی حویلی میں کلدیپ نے امریتا کے رُوپ میں تم سے اپنی مجبوری کا جوڑ کر کیا تھا اس میں بھی دُرگیا کالی کی ہتھکنوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔“

”پھر..... پھر وہ کون تھا.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”سب کچھ اُسی مرد قلمدار کے اشارے پر ہو رہا تھا۔“ انکارانی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”کبھی وہ سامنے آئے تو میری سفارش بھی کر دیتا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے بھی اُسے اپنا بڑا مان لیا ہے، وہ مہمان ہتھکنوں کا مالک ہے۔ ہم اور تم تو اُس کے قتل کی کوششوں کی دُحوں بھی نہیں۔“

میرے ذہن میں پھر ماضی کے کچھ مناظر گھومنے لگے۔ میں نے کئی موقعوں پر انکارانی کی سرزنش کی تھی، اُسے جھڑک دیا تھا، سر سے اُتر جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ تلخ باتوں کو برداشت کرتی رہی، اُس نے بھی شکوہ نہیں کیا۔ سب سید مجذوب کی مہربانی تھی جو میری پشت پناہی کر رہا تھا۔ مجھے اس کی بھنگ بھی نہ ملی، انکارانی کو بھی اس کا راز افشا کرنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔

میں اپنے خیالات میں مستغرق تھا، مجھے سید کی مہربانیاں یاد آ رہی تھیں۔ میں تادیر اپنی خیالوں میں غرق رہا، پھر مجھے اپنی تر تین یاد آ گئی۔ انکارانی نے کہا تھا کہ وہ کشیا میں ہیری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا آگے بڑھا لیکن کئی کے دروازے پر پہنچ کر ایک جھٹکے سے ڈک گیا۔ میری آنکھیں پت پٹ پٹ پٹ لگیں۔ میرے سامنے تر تین نہیں، جھڑنا کھڑی تھی۔ وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ دوپٹے کا پلو اُس کے سر پر پڑا تھا۔ بڑی محسوس، بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ لیکن..... وہ تر تین نہیں تھی۔ میں نے اندر کے ساز و سامان پر نظر ڈالی، مجھے وہاں جامناز اور اپنی مقدس کتاب رطل پر رکھی نظر آئی۔ مجھے تعجب ہوا۔ میں نے پلٹ کر اُکا

دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ وہ میرے دل کا درد سمجھ گئی تھی۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں
ڈرتے ڈرتے کہا۔
”بابا..... میں تمہاری خدمت کروں گی۔ میرا اس دنیا میں اب تمہارے سوا اور کون سا
گھر ہے؟ تم مجھے اپنی تزئین نہیں قبول کرتے، نہ کرو۔ میں نوکرانی بن کر بھی تمہاری سیوا
کروں گی۔ ہاں..... تم جس نام سے بھی پکارو گے میں دوڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں گی۔“
اُن کی باتوں میں جذبات کی صداقت تھی۔ میرا دل بھر آیا، میں نے اُسے بے تحاشہ
ہاتھ بڑھا کر سمجھ لیا۔ اپنے سینے کی گہرائیوں میں چھپا لیا۔ اُس کی پلکوں سے بھی سادگی
جھری لگتی تھی۔ باہر سورج غروب ہو رہا تھا جب کسی کے بڑے خوش الحان انداز میں اذان
دینے کی آواز سنائی دی۔ میں حیرت سے پلٹ کر سبزے کی طرف آیا جہاں ایک خوش پوش
شخص سر پر عمامہ پہنے ہوئے، قبلہ رخ کھڑا اذان دینے میں مصروف تھا۔ میرا دل نامعلوم
جذبات سے سرشار ہونے لگا۔ میں دُور کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اذان دینے کے بعد غار
ہوا تو میں لپکتا ہوا اُس کے قریب چلا گیا۔ اُس کے چہرے کے خدو خال نظر آئے تو میری
حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، وہ ایک عجب و ب کے سوا اور کوئی نہیں تھا..... میں تیزی سے اُس کی
طرف لپکا۔ اُس روز وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوا..... نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے
بھی اُس کی امامت میں پیچھے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ لئے۔ میرے دل کا سارا غبار چلنے
لگا.....!!

(تمت باختم)
KHAN BOOKS
STATIONARY AND LIBRARY
F/390/4 NISHTAR ROAD BHABRA BAZAR
RAWALPINDI PH-3338332
PROP. ALI KHAN

اِنَّ اللہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ
بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے